زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

چہار سو

جلد ۱۸ شمارہ ۵ مئی جون ۲۰۰۹ء

مجلسِ مشاورت

قارئینِ چہار سو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ مشتاقانہ

دعائے انتساب

مرے خدا

مری زمیں

مرے وطن

مرے خوابوں کے چمن

مرے خیالوں کی جائے پناہ

تجھ سے

فقط، تجھ سے

روشنی کی

طلب گار ہے!!!

بانی مدیرِ اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل

گلزار جاوید

مدیرِ معاون

بینا جاوید

رابطہ: 537 'ویسٹریج-III' راولپنڈی۔ فون: 92-51-5462495 فیکس: 5490181 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہار سو

☆

قرطاسِ اعزاز
ڈاکٹر سید تقی عابدی
کے نام

بابِ قبولیت

شبینۂ دوستاں

سید ضمیر جعفری (•)

(نامور محقق، نقاد، ادیب، شاعر، دانشور، یاروں کے یار اور اردو ادب کے دلدادہ ڈاکٹر سید تقی عابدی و خانم گیتی عابدی کے گھر "شبینۂ دوستاں" کی تقریب کا جو بیہ ـــــ ض۔ ج)

سالِ نو کی روشنی ہے عابدی گیتی کے گھر
زندگی ہی زندگی ہے عابدی گیتی کے گھر

کیا حسیں محفل سجی ہے عابدی گیتی کے گھر
حسن کی بارہ دری ہے عابدی گیتی کے گھر

جس قدر شیریں ہوئے کام و دہن خوراک سے
اتنی میٹھی فارسی ہے عابدی گیتی کے گھر

مرغ میکسیکو سے آیا ہو تو آیا ہو مگر
ماہی آیا وان کی ہے عابدی گیتی کے گھر

نان کتنا روغنی ہے عابدی گیتی کے گھر
جانے کس گائے کا گھی ہے عابدی گیتی کے گھر

جمع جیسی "جنتری" ہے عابدی گیتی کے گھر
"سالِ نو" کی جنتری ہے عابدی گیتی کے گھر

اک ہجوم رنگ و رامش، ایک سیلِ سرخوشی
شاعری نغمہ گراں ہے عابدی گیتی کے گھر

دور ہند و پاک سے اس اجنبی نیویارک میں
ایک جشنِ دوستی ہے عابدی گیتی کے گھر

گنگناتے حافظؔ و خیامؔ کے اشعار کی
شامِ اصفہان کی ہے عابدی گیتی کے گھر

حیدرآباد دکن کے سانولے موسم کے بیچ
نغمہ گر عابد علی[1] ہے عابدی گیتی کے گھر

دلکشا ان ناچوں۔ دانش ورانِ دَور ہیں
شب ستاروں سے بھری ہے، عابدی گیتی کے گھر

غالبؔ و اقبالؔ و رومیؔ، عرفیؔ و سعدیؔ کے ساتھ
میرؔ، مومنؔ، مصحفیؔ ہے عابدی گیتی کے گھر

ایشیا اے ایشیا اے ایشیا اے ایشیا!
تیری ساری روشنی ہے عابدی گیتی کے گھر

گومتی کے گھاٹ سے لے کر کنارِ سندھ تک
ہم ولی۔ ہم مجلسی ہے عابدی گیتی کے گھر

دوستو بابِ قبولیت کھلا ہے اس گھڑی
گرچہ امریکن گھڑی ہے عابدی گیتی کے گھر

یاالٰہی سب کو ارزاں کر یہ لطفِ دائمی
یہ جو دل آسودگی ہے عابدی گیتی کے گھر

شرقی نیویارک کی ہے، عابدی گیتی کے گھر
ہڈسن و گوداوری ہے، عابدی گیتی کے گھر

یہ تلاوت سے دلوں میں بارشِ نور و سرور
اک سحر بیداری ہے عابدی گیتی کے گھر

شام اپنی روز سے کل ان جیسے جواں روزوں کے ساتھ
ہے ضمیر جعفری بھی عابدی گیتی کے گھر

---

1 حیدرآباد دکن کے مشہور موسیقار و گلوکار

''عاشقی کی انتہا''

پروفیسر عبدالمنان طرزی (دربھنگہ، بہار)

ہے متاعِ آگہی سید تقی عابدی
معتبر دانشوری سید تقی عابدی

علم وفن کی خسروی سید تقی عابدی
ایک مردِ آہنی سید تقی عابدی

چارہ سازِ علم جو سید تقی عابدی
خادمِ فن باوضو سید تقی عابدی

نیک دل اور نیک خو سید تقی عابدی
نغمہ ہائے آبجو سید تقی عابدی

خاکِ پائے عارفاں سید تقی عابدی
نازِ فرقِ کاملاں سید تقی عابدی

میر و مرزا کا بیاں سید تقی عابدی
مرثیے کی ہے زباں سید تقی عابدی

محشرِ جذبات ہے سید تقی عابدی
قاطعِ بدعات ہے سید تقی عابدی

زینتِ صفحات ہے سید تقی عابدی
علم کی سوغات ہے سید تقی عابدی

اہلِ دل، اہلِ نظر سید تقی عابدی
مثلِ انوارِ سحر سید تقی عابدی

دردِ دل دردِ جگر سید تقی عابدی
قطرہ ہائے چشمِ تر سید تقی عابدی

جانبِ منزل قدم سید تقی عابدی
داستاں خوں رقم سید تقی عابدی

صاحبِ کیفِ قلم سید تقی عابدی
جیسے کوئی جامِ جم سید تقی عابدی

حاصلِ دردِ نہاں سید تقی عابدی
کامیاب و کامراں سید تقی عابدی

دشتِ وحشت کی اماں سید تقی عابدی
التہابِ وافراں سید تقی عابدی

قامتِ جانانِ جاں سید تقی عابدی
بے یقیں بے گماں سید تقی عابدی

گرچہ ہیں لاکھوں یہاں سید تقی عابدی
پر کوئی تجھ سا کہاں سید تقی عابدی

نقدِ فن کا سلسلہ سید تقی عابدی
ربِ تعالیٰ کی عطا سید تقی عابدی

آگہی کا در کھلا سید تقی عابدی
ایک دردِ لادوا سید تقی عابدی

علم کا اعلیٰ صلہ سید تقی عابدی
تو نے بیشک پا لیا سید تقی عابدی

عاشقی کی انتہا سید تقی عابدی
واقعاتِ کربلا سید تقی عابدی

نقص، طرزِ نقد کا سید تقی عابدی
دور تو نے کر دیا سید تقی عابدی

اتنا ثابت ہو گیا سید تقی عابدی
فن کار ہے تو اک بڑا سید تقی عابدی

مستند دیدہ وری سید تقی عابدی
شعری نثری آزری سید تقی عابدی

لاریب ایسا خواب بھی سید تقی عابدی
تعبیر جس کی قیمتی سید تقی عابدی

اب آبرو تحقیق کی سید تقی عابدی
تجھ سے ہوئی محفوظ بھی سید تقی عابدی

○

''بلندیوں کی نوید''

باقرؔ زیدی (یو ایس اے)

مرحبا تجزیہ نگار انیس
اے تقی اے نگاہ دار انیس

جمع ہیں واقف وقار انیس
مونس گلشن بہار انیس

امتیاز قلم ہے کار انیس
فخر اردو ہے شاہکار انیس

صاحب تجزیہ جزاک اللہ
محو گفتار رہگزار انیس

کھل گیا ادراک و دانش
بڑھ گیا اور اعتبار انیس

حشر تک ہے جو وہ صدائے سخن
حشر تک بندھ گیا حصار انیس

ہے سخن پروہ افتخار اس کا
اہل اردو ہیں زیر بار انیس

ایک اک لفظ مستند مرغوب
ایک اک بیت افتخار انیس

جان جاں اسلئے ہے باغ سخن
لہلہاتا ہے لالہ زار انیس

ہے جنہیں کچھ پرکھ وہ جانتے ہیں
ہے سخن کی بہار عیار انیس

ہر زمین سخن قلمرو میں
کوئی دیکھے تو انداز انیس

لکھنؤ کا مزہ ہو جنت میں
ملے قسمت سے گر جوار انیس

پھول احساس کے چڑھاتے ہیں
اہلِ انصاف برمزار انیس

وجہ آب حیات ذوق کا ذکر
کم نہیں میں گناہگار انیس

ایک شبلی ہی کا موازنہ ہے
جو ہوا وجہ اعتبار انیس

کیسی خاموشی گزری پچھلی صدی
اور کیا ہو سکا ہے کار انیس

ساعتیں آئیں گی سپاس گزار
ابھی دنیا ہے قرضدار انیس

حق یہ حقدار کے جو وائی ہیں
ان کو ہونا ہے پاسدار انیس

اس کی قسمت بلندیوں کی نوید
جس نے اپنالیا شعار انیس

نکلے چکبست و حالی و اقبال
خوب پھلے ہیں برگ و بار انیس

مرثیے نے دیا خراج اسے
مرثیہ گو ہیں ورثہ دار انیس

اب بھی اس کا وظیفہ جاری ہے
ہم بھی ہیں اک وظیفہ خوار انیس

تجزیہ مرثیہ کا ہے باقرؔ
زیب ناموس رہگزار انیس

مرحبا تجزیہ نگار انیس
اے تقی اے نگاہ دار انیس

"نیّرِ تاباں"

شکیل آزاد (واشنگٹن)

اس انجمن میں آج جو مہماں ہیں عابدی
ارضِ ادب میں وسعتِ امکاں ہیں عابدی

ناقد بھی ہیں ادیب بھی ہیں مکتہ رس بھی ہیں
روشن چراغِ طاقِ دبستاں ہیں عابدی

جاری ہے ان کا فیضِ ادب زور شور سے
اہلِ سخن میں نیّرِ تاباں ہیں عابدی

جو کہہ دیا زباں سے وہ کر کے دکھا دیا
کس کوہسارِ عزم کے انساں ہیں عابدی

کیا کام کر دیا ہے انیس و دبیر پر
تحقیق کے قلم کے رگِ جاں ہیں عابدی

علم و ادب کے کتنے خزانے بچائے ہیں
اہلِ ادب کے درد کا درماں ہیں عابدی

وقت ان کا، مال ان کا، کتابیں ہماری ہیں
ہر زاویے سے رحمتِ باراں ہیں عابدی

اک بے بہا خزانہ کتابوں کا گھر میں ہے
کہتا ہے کون؟ بے سروساماں ہیں عابدی

یہ کائنات نجم! انھیں کا کمال ہے
منزل بدوش جو ہوئے پریشاں ہیں عابدی

ہر کام میں خلوص بھی ہے رکھ رکھاؤ بھی
کہہ دو شکیل! جانِ دل و جاں ہیں عابدی

"زورِ شباب" نسیم فروغ (یو ایس اے)

کیونکر جواب ہو گا کسی لاجواب کا
فکرِ تقی میں جوش ہے زورِ شباب کا
ایسی لکھی کتاب مچی دھوم چار سو
چاروں طرف ہے ذکر انہی کی کتاب کا

انیس پر جو کوئی خاص کام کرتے ہیں
وہی تو فیضِ سخن اسکا عام کرتے ہیں
یہ دیکھ کر کہ ادب کو دیا ہے اس نے وقار
جو اہلِ فن و ادب ہیں سلام کرتے ہیں

"شاہِ سخن" عبدالرحمٰن صدیقی (امریکہ)

اے تقی! اے اختر ارضِ دکن
تو نے زندہ رکھا صدیوں کا چلن
کر دکھایا تو نے تنہا وہ کمال
چاہیے جس کیلئے اک انجمن
تو نے روشن کر دیا اس نام کو
جس نے بخشی نظم اردو کو پھبن
یعنی وہ سرمایہ اردو زباں
وہ انیس محترم شاہِ سخن

"پورا چاند" مونا شہاب (واشنگٹن)

بزم میں روشن ہوئی ہے شمع بن کر دیکھئے
اس کے صفحاتِ درخشاں کو الٹ کر دیکھئے
چند لفظوں میں ہے مخفی ایک دنیائے سخن
بند کوزے میں حقائق کا سمندر دیکھئے
کیوں کریں نہ تعریف و توصیف احبابِ ادب
آج پورا چاند ہے بامِ ادب پر دیکھئے
لو تقی نے دے دیا اپنی عقیدت کا ثبوت
کہہ رہے ہیں آج یہ سارے سخنور دیکھئے

متاعِ آگاہی

بیگم گیتی عابدی (کناڈا)

نام: سید تقی عابدی
ادبی نام: تقی عابدی
تخلص: تقی
دادا: شبیر علی عابدی (مرحوم)
والد: سید سبطِ نبی مصحف (مرحوم)
والدہ: سعیدہ بیگم (مرحومہ)
بھائی بہن: کُل آٹھ بھائی، بہن کوئی نہیں (ڈاکٹر صاحب کا نمبر تیسرا)
پیدائش: یکم مارچ 1952 دہلی (بھارت)
تعلیم: میٹرک (دارالشفاء ہائی سکول حیدرآباد دکن)
ایف ایس سی (سیف آباد کالج حیدرآباد دکن)
ایم بی بی ایس (حیدرآباد انڈیا) ۱۹۷۵ء
ایم ایس سی (پیتھالوجی) گلاسکو یونیورسٹی برطانیہ
ایف سی اے پی (ڈپلومیٹ آف امریکن بورڈ آف پیتھالوجی)
ایف آر سی پی (فیلو آف رائل کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز) کینیڈا
پیشہ: طبابت
ذوق: شاعری، ادبی تحقیق اور تنقید
شوق: مطالعہ اور تصنیف
قیام: ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک اور کینیڈا
شادی: 1976 ایران
شریکِ حیات: گیتی عابدی
اولاد: دو بیٹیاں (معصومہ اور رعنا) دو بیٹے (رضا اور مرتضیٰ)

مطبوعات:

۱۔	گلشنِ رعنا	کراچی پاکستان
۲۔	جوشِ مودت	حیدرآباد انڈیا
۳۔	شہید	کوئٹہ پاکستان
۴۔	تجزیہ یادگارِ انیس	دہلی انڈیا
۵۔	رموزِ شاعری	لاہور پاکستان
۶۔	اظہارِ حق	ٹورنٹو کینیڈا
۷۔	انشاء اللہ خاں انشا	لاہور پاکستان
۸۔	عروضِ سخن	لاہور پاکستان
۹۔	اقبال کے عرفانی زاویے	لاہور پاکستان
۱۰۔	مجتہدِ نظم مرزا دبیر	لاہور پاکستان
۱۱۔	مثنویاتِ دبیر	دہلی انڈیا
۱۲۔	ابواب المصائب	دہلی انڈیا
۱۳۔	سلکِ سلامِ دبیر	لاہور پاکستان
۱۴۔	مصحفِ فارسی	دہلی انڈیا
۱۵۔	طالعِ مہر	لاہور پاکستان
۱۶۔	کائناتِ نجم (دو جلد)	دہلی انڈیا
۱۷۔	روپ کنور کماری	ملتان پاکستان
۱۸۔	ادبی معجزہ	ملتان پاکستان
۱۹۔	سید سخن	دہلی انڈیا
۲۰۔	غالب۔ دیوانِ نعت و منقبت	دہلی انڈیا
۲۱۔	مصحفِ تغزل	لاہور پاکستان
۲۲۔	تاثیرِ ماتم	ملتان پاکستان
۲۳۔	فکرِ مطہر	ملتان پاکستان
۲۴۔	دربارِ رسالت	لاہور پاکستان
۲۵۔	نجمی بلا	ملتان پاکستان
۲۶۔	ذرِ دریائے نجف	ملتان پاکستان
۲۷۔	ذکرِ دُرباراں	لاہور پاکستان
۲۸۔	حولِ نجم	ملتان پاکستان
۲۹۔	خوشِ نجم	ملتان پاکستان
۳۰۔	روشِ انقلاب	ملتان پاکستان
۳۱۔	تعشق لکھنوی	دہلی انڈیا
۳۲۔	چمن مرگ آئیے	لاہور پاکستان
۳۳۔	رباعیاتِ دبیر	دہلی انڈیا
۳۴۔	کلیاتِ غالب فارسی (دو جلد)	دہلی انڈیا

قریب نصف درجن کتب زیرِ اشاعت

اعزازات و انعامات:

☆ ایوارڈ آف آنرز (بہترین خدمات) سٹی بورڈ آف ٹورنٹو کینیڈا

باقی: صفحہ نمبر ۹۰ پر ملاحظہ فرمائیں

”پرسشِ کرم“

فاری شا

(لندن)

۲۲ فروری ۲۰۰۲ء
(لکھنؤ بھارت)

برادرم تقی عابدی صاحب، السلام علیکم

گرامی نامہ وصول ہوا۔ اس کے ساتھ اکبر حیدری صاحب نے آپ کی عظیم الشان کتاب کے کچھ اوراق دکھائے۔ انیس پر کام تو بہت ہوا ہے یعنی اقبال اور غالب کے بعد سب سے زیادہ اور منفرد مرثیہ پر غزل سے بھی زیادہ لیکن موازنہ کے بعد کوئی بڑا کام نہیں ہوا۔ آپ نے اس پر غیر معمولی محنت اور سلیقے سے کام کیا ہے۔ شاہکارِ انیس کے تجزیے میں ہر بند کے لفظوں کی کیفیت، صنائع و بدائع کی تفصیل اور دوسرے جملہ لوازم نے کتاب کو انیس شناسی کا بہت اہم ذریعہ بنا دیا ہے اور نہایت اہم ماخذ بھی۔ اس کتاب سے انیس کی زبان اور استعمالِ الفاظ پر کام کرنے والوں کو بھی غیر معمولی مدد ملے گی۔ آپ نے اصل ”شاہکارِ انیس“ کے رنگین ایڈیشن کو بھی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ اس میں اصل کتاب کو بھی نئی زندگی مل جائے گی۔ آپ کی اس کتاب کی سب سے زیادہ داد تو والد محترم مرحوم ہی دیتے۔ انہیں جب کوئی تحریر بہت پسند آتی تو آب دیدہ ہو جاتے تھے۔ ان کی نیابت میں آپ کو میں داد دیتا ہوں حالانکہ

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

میری ایک درخواست ہے کہ آپ شاہکارِ انیس کے اولین ایڈیشن کا ایک پاکٹ ایڈیشن بھی شائع کریں۔ اصل کتاب کے چھوٹی سائز میں اس کا رنگین عکس اور آپ کے مقدمے کا خلاصہ۔ اصل کتاب کا صرف متن اور سر ورق کا عکس۔ یہ دو ڈھائی سو صفحے کی کتاب ہوگی اور انیس کی دو سو سالہ سالگرہ ۲۰۰۲ء کے موقع پر آپ کی طرف سے ایک یادگار تحفہ جو عام دسترس میں بھی آ سکے گا۔ آپ کے مضامین اکثر پڑھتا ہوں اور ان سے بے حد متاثر ہوں۔ لیکن شاہکار انیس آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ ایسے اور بھی کارنامے انجام دیں۔

نیر مسعود

۱۳ مارچ ۱۹۹۸ء
گوجر خان، پاکستان

محبی ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب!

سالِ نو مبارک۔

اس مرتبہ کے سالِ نو نے جس قدر آپ اور آپ کے دولت کدے کی یاد دلائی ہے شاید اس سے پہلے کے کسی سال نے نہ دلائی تھی۔ آپ کی محبت اور خانم گیتی کی محبت نوازی نے ہمیں کیا اس تمام مجمع کو آپ دونوں کا مطیع کر لیا ہے جو آپ کے دولت کدے کی فراخ دلانہ اور مخلصانہ مہمان نوازی سے لطف یاب ہو چکے ہیں۔ آپ جس برق رفتاری سے اپنے تحقیقی اور تنقیدی کام سے اردو ادب میں نو بہ نو پھول کھلاتے جا رہے ہیں اس سے بھی زیادہ گرمجوشی سے ادبا اور شعرا کو دامِ اسیر کیا بھی نہیں بھولتے۔ میں غالباً مارچ کے دوسرے یا تیسرے ہفتے تک نیویارک پہنچ جاؤں گا۔ میرے ہمراہ آپ کی بھابھی والدہ احتشام و افشاں بھی ہوں گی۔ اصل میں اس مرتبہ نیویارک آمد ان کے علاج کے سبب کچھ جلد ہو رہی ہے۔ بیگم جہاں آرا ضمیر کو آدی کے ڈاکٹروں نے چھاتی کا سرطان بتلایا ہے اور عزیزی افشاں نے ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق امریکہ کے ڈاکٹروں سے رجوع بھی کر لیا ہے۔ آپ یہ جان کر شاید دل ہی دل میں یا شمعہ بلا کر تحسین کریں پریشان ہو نیا گھبرانے کے بجائے خوش ہو رہا ہوں کہ وہاں آپ جیسے محبت کے کئی پیکر مثلاً جوہر میر صاحب، صفوت علی صفوت صاحب اور شوکت فہمی صاحب میری مدد اور دلجوئی کے لیے موجود ہوں گے۔

سید ضمیر جعفری

۸ اگست ۲۰۰۲ء
دہلی بھارت

میرے مکرم عابدی صاحب! سلامت باشند

تقریباً ایک ماہ کا عرصہ ہوا عزیزم ڈاکٹر شاہد حسین نے آپ کی کتاب ”تجزیۂ یادگارِ انیس“ کا ایک نسخہ آپ کی جانب سے بطورِ ہدیہ عنایت کیا۔ نہایت ممنون ہوں کہ اس پیش بہا ادبی سوغات کے لیے آپ نے اس کمترین کو بھی یاد رکھا۔ کتاب کی تعریف سے قلم عاجز ہے الفاظ گنگ ہیں، زبان لال ہے۔ ظاہری حسن و جمال ہی بے مثال ہے مگر یہ تو زیادہ خرچ کرنے سے پیدا کیا جا سکتا ہے کہ آپ سونے کے حروف میں کتاب چھپوا دیں۔ اس کا اصلی حسن وہ جذبہ اور گہری عقیدت ہے جو آپ کو موضوعِ کتاب سے ہے اور میر انیس مرحوم یقیناً اس قدر دانی کے سچے حقدار تھے۔ اس کتاب میں ان کے بارے میں اتنی معلومات جمع کر دی گئی ہیں جو بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ پھر مرثیۂ انیس کا تجزیہ جس عالمانہ ژرف نگاہی، دقیقہ رسی اور نکتہ شناسی سے کیا گیا ہے وہ بھی بے نظیر ہے۔ آج تک اردو تو کیا انگریزی کے کسی بڑے سے بڑے شاعر یا ادیب کے فن کا تجزیہ ایسی عمیق نگاہ سے نہیں کیا گیا۔ ایک بار پھر تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کتاب میرے ذخیرے میں لعلِ شب چراغ کی طرح

چمکتی رہے گی اور آپ کی یاد دلاتی رہے گی۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

۱۰ فروری ۱۹۹۸ء

کراچی پاکستان

محبِ گرامی ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب!

احترامات

اس بار کینیڈا کے سفر میں سب سے بڑی کامیابی اگر کوئی تھی تو وہ آپ کے دولت کدے کی سیر جسے جنتِ ارضی کہا جائے تو مبالغہ ہرگز نہ ہوگا۔ آپ کی نسبت میں پہلے سے بہت کچھ جاننے کا دعویٰ دار تھا مگر آپ کے ذخیرۂ علمی اور ان کی نسبت آپ کی تہذیب، لگاؤ اور اشتیاق دیکھ کر اردو ادب سے دل ہی دل میں بہت سی توقعات باندھ بیٹھا ہوں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کی توانائیاں اسی طرح بحال رکھیں اور اس میں مزید ترقی و برکت عطا فرمائیں۔ آمین۔ ایک بات جو میں آپ سے نہ کہہ سکا اب تحریر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آپ جس پائے کے معروف طبیب اور ادیب ہیں وہ اپنے وقت کی اس طرح قدر نہیں کرتے ہیں۔ ادبا اور شعراء کے لیے آپ جس طرح ہر وقت اور ہر گھڑی جس بے دردی بلکہ بے رحمی سے وقت اور وسائل لٹاتے ہیں، اس کی داد کم از کم میں ہرگز نہیں دے سکتا اور نہ کسی اور کو ایسا کرنے کی اجازت دینا چاہوں گا۔ اس حقیر فقیر نے سرسری طور پر آپ کی ان کتب کی جانب اشارہ کیا تھا جن سے یہ عاجز محروم ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ آپ اتنی ڈھیر ساری کتب اتنے بھاری بھرکم بلٹ کے ٹکٹ لگا کر کراچی پاکستان ارسال فرمائیں جبکہ میرا کناڈا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے بہر حال میں ان عنایاتِ خاص کے لیے بے حد شکر گزار ہوں اور آپ کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو بھی۔ قدرت نے مہلت دی تو مرسلہ کتب کی بابت

ہیں۔ جواب الصاحب میں فرہنگ شامل کرکے آپ نے نئے پڑھنے والوں کی مشکل آسان کردی ہے۔ خدا آپ کی ادبی و تحقیقی توفیقات میں اضافہ کرے اور آپ کو صحت کے ساتھ سلامت رکھے۔

ڈاکٹر شارب ردولوی

۵ جولائی ۲۰۰۷ء

کراچی پاکستان

محترم ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب

تسلیمات!

یوں تو آپ کی شخصیت و فن کے سحر نے "گلشن رضا" کی تقریب رونمائی کے زمانے سے ہی اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے مگر انیس و دبیر پر آپ کے حالیہ کارنامے نے یہ سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ آپ مسند پایۂ تقسیم عاشقانِ اردو میں اول و افضل مقام پر برحق طور پر فائز ہو چکے ہیں۔ مستقبل کے حوالے سے میری امیدیں آپ کی ذات کی نسبت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہیں۔ سنا ہے آج کل آپ کی توجہ کا مرکز علامہ اقبال ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ اس کارِ دشوار سے جس قدر جلد ممکن ہو سرفراز ہو کر گزر جائیں اور گلشن اردو میں نئے باب کا اضافہ کریں۔

شبنم رومانی

۲۳ مئی ۲۰۰۲ء

نیویارک امریکہ

جناب تقی عابدی قبلہ!

تسلیمات۔

ایک زمانے سے آپ کی شہرت و ناموری سماعت تک محدود تھی۔ مگر جب آپ برادرم صابر بخش خانزادہ کے ہمراہ عزیزی گلزار جاوید کے جریدے "چہار سو" جسے گلزار جاوید سے زیادہ محترمی ضمیر جعفری مرحوم کا جریدہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کی خاص اشاعت کے لیے مسودات اور تصاویر طلب کرنے کی غرض سے تشریف لائے اور اپنی دو تازہ تصانیف "سید سخن اور انشاء اللہ خان انشا" پیش کیں تو میری خوشی کی انتہا آپ یا برادرم صابر بخش صاحب ہی لگا سکتے ہیں۔ میری نظریں آپ کی تازہ وارد آمدہ کتاب میر انیس کے تجزیے پر لگی ہوئی ہیں۔ خدا کرے آپ اس نادر کتاب کو میری رخصتی سے قبل منظر عام پر لے آئیں تاکہ اس کے مداحین میں ایک اور ادنیٰ کا اضافہ ہو سکے۔

گیان چند جین

۱۴ جون ۱۹۹۹ء

کراچی پاکستان

محترمی ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب

السلام علیکم۔

آج کا دن میرے لیے آپ کی بلند اقبال کتب کی شکل میں خوش قسمت دن ثابت ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ ادوم گلزار جاوید کا شکریہ ادا کروں یا آپ کے روبرو اظہار سپاس کروں کہ آپ نے کس قدر اہم اور نایاب کتب کا تحفہ عطا فرمایا ہے۔ اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں یا ان کتب کا طلب گار۔ آپ کے ہاں حافظ اور خسرو سے عقیدت کا جو انداز ہے وہ انوکھا نہ ہوتے ہوئے بھی جداگانہ حیثیت کا حامل ضرور ہے۔ آپ نے ان بلند قامت شعراء کی شاعری کو جس تنقیدی بصیرت کے آئینے میں جانچا اور پرکھا ہے اس سے آپ کی اردو اور فارسی کے کلاسیکی اور جدید شاعری کے گہرے مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری کی آبرو میر، غالب، انیس اور دبیر کے شاعرانہ مرتبے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت پر آپ کی جو نظر اور اس کے جو مختلف پہلو ہیں انہیں نہایت بصیرت افروز کہا جا سکتا ہے اور انہیں اردو ادب میں خصوصی اضافے کی حیثیت کا حامل بھی گردانا جا سکتا ہے۔ آپ کی شاعری، تنقید، تحقیق کی متنوع جہات کا تقاضا ہے کہ تمام علمی اور ادبی ادارے اور افراد آپ کی بجا اور بھرپور حوصلہ افزائی فرمائیں اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنے ساتھ نہیں آپ کے ساتھ بھی نہیں اردو ادب اور شاعری کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہوں گے۔

محسن بھوپالی

۱۴ جولائی ۲۰۰۵ء

بنگلور، بھارت

مکرمی علوی صاحب! تسلیم

آپ کی ارسال کردہ "کلام دبیر" کی ابتدائی تینوں جلدیں (مجموعہ کلام مرزا دبیر، مسلک سلام دبیر اور طالع مہر) مولانا آزاد لائبریری کے لیے موصول ہوئیں۔ آپ نے ہماری فرمائش پوری کی (ہمارا خط نمبر ۳۲۵ مورخہ ۱۸ مارچ ۲۰۰۵ء) ہماری اور ہماری لائبریری کے قارئین کی خواہش کا احترام کیا۔ اس کے لیے ہم آپ کے احسان مند ہیں۔ بقول فراق

اس پرسش کرم پہ تو آنسو نکل پڑے

لائبریری کے اندراج رجسٹر میں مذکورہ بالا تینوں جلدوں کا اندراج کرلیا گیا ہے۔ جس کے مطابق ان کا اندراج نمبر ۱۰۸-۱۲۱۵۰۶ ہے۔ چھ جلدوں پر مشتمل کلام دبیر کی کلیات اردو ادب کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ عظیم الشان کارنامہ صرف اس معنی میں نہیں کہ آپ نے بکھری چیزوں کو یکجا کر دیا بلکہ ان پر تحقیق، ان کی ترتیب و تدوین، ان کی تشریح، نیز طباعت غرض ہر پہلو سے کلام دبیر کو مکمل اور جامع کر دیا۔ اس عظیم الشان کارنامے کو انجام دینے کا سہرا آپ کے سر جاتا ہے اور آپ اس کام کے لیے لائق تعریف و قابل مبارکباد ہیں۔ آپ کے کام کرنے کا سلیقہ اور آپ کا تحریری اسلوب کافی پسند آیا۔ مرزا سلامت علی دبیر پر تو کام اب تقریباً مکمل ہو گیا سوائے "رسالہ دبیر" اور "معجزہ امیر المومنین" کے تلاش و جستجو میں لگے رہیں۔ "ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی ہم نئی دیتے ہیں" کے تحت امید ہے کچھ نئی چیز ہاتھ لگ جائے کیونکہ تحقیق میں کچھ بھی اور کبھی بھی "حرف آخر" نہیں ہوتا۔ دبیر کے بعد اب کس پر قلم اٹھانے کا ارادہ ہے؟

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

شکیل احمد خان

۳۰ جولائی ۲۰۰۷ء

سری نگر، کشمیر

مجھے اس بات پر فخر حاصل ہو رہا ہے کہ میں نے شہر پرآشوب وادی کشمیر میں آپ کی کتاب کے مسودے "تجزیہ یادگار مرثیہ جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کو متعدد بار پڑھا۔ اس کے بعد پانچ مرتبہ اس کی پروف ریڈنگ کا شرف بھی حاصل رہا۔ کتاب پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک پیشہ ور معالج (ڈاکٹر) کو اتنا وقت کہاں سے میسر ہوتا ہے کہ وہ اتنی بھاری بھرکم اور ضخیم ترین کتاب لکھ سکے۔ میں خود رثائی ادب کا ایک کم سواد طالب علم ہوں جس نے اردو لٹریچر میں ستر سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ میں یہ بات بلاخوف تردید پورے مطالعہ، ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک ایسی مختصر، مستند اور معلومات افزا کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ آپ کا یہ صحیفہ ادب چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ آخری تین ابواب نہایت اہم ہیں جو نہایت دیدہ ریزی اور محنت شاقہ سے مرتب کیے گئے۔ تیرھواں باب "تجزیہ کامل" حاصل کتاب ہے۔ اس میں آپ نے ہر بند کے سامنے پورے صفحے میں تجزیہ کیا اور وہ وہ شعری محاسن دکھائے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے کتاب کے آخر میں دو ضمیمہ یا گویا باب کو بھی شامل کیا جو عرصے سے برصغیر ہند میں عنقا ہو گئے تھے۔ یعنی مشہور مفسر قرآن سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی مرحوم سابق ڈین شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا منظوم عربی ترجمہ اور ڈاکٹر داؤد کشمیری کا منظوم انگریزی ترجمہ۔ ان دونوں ادبی شاہکاروں کو کتاب میں شامل کر کے آپ نے انہیں حیات جاودانی سے ہمکنار کیا۔ میں آپ کو اس عظیم کارنامے کی ترتیب و اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں اور سلام عقیدت پیش کرتا ہوں کہ آپ نے ایسا شاندار اور بے مثل کام کیا جو آج تک کسی سے نہ ہو سکا۔ اگر اردو لٹریچر اور رثائی ادب کی تاریخ از سر نو رقم کی جائے تو آپ کا نام نامی بہترین ادبیات میں سرفہرست ہوگا۔ جب تک دنیائے اردو میں خدائے سخن میر انیس کا سکہ جاری رہے گا آپ کی یہ کتاب بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جائے گی۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری

علامہ اقبال کا تصورِ "عشق و مستی"

ڈاکٹر سید تقی عابدی

علامہ اقبال نے مولانا روم سے متاثر ہو کر یہ بھی کہا ہے

پیر رومی مرشد روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

علامہ اقبال کے تصورِ عشق و مستی پر کوئی خاص کام ابھی تک نہ ہو سکا ہیں تو عشق، عشق فرد، عشق و دل، عشق و علم اور عشق کے مترادفات شوق، وجود، جنون، محبت، مودت، ولا، جذب وغیرہ کی ترکیبات پر گفتگو نظر آتی ہے لیکن اقبال کی ترکیب "عشق و مستی" جس کا امیر رومی ہے وہ تشنۂ تاویل و تشریح ہے۔ علامہ اقبال نے اس ترکیب "عشق و مستی" کو اپنے اردو اور فارسی کلام میں تقریباً تیس سے زیادہ بار استعمال کیا ہے اور ہر مقام پر اس کے معنی تقریباً یکساں ہیں جسے آسان الفاظ میں معرفتِ الٰہی اور عشقِ نبویؐ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ ترکیب "عشق و مستی"، "عشق مستی" نہیں "مستی عشق" نہیں "عشقِ مستی" مستانہ عشق یا عشق مست نہیں بلکہ صرف اور صرف "عشق و مستی" ہے۔ اگرچہ اقبال کے یہاں یہ ترکیب تیس سے زیادہ مقامات پر نظر آتی ہے لیکن یہ شاید فارسی اور اردو شعراء کے پاس نہ ہونے کے برابر ہے یہی نہیں اگر مولانا روم کی مثنوی معنوی جس میں تقریباً ساڑھے چھبیس ہزار اشعار ہیں اور ان کے دیوان کبیر جس کو دیوان شمس تبریزی کہتے ہیں تقریباً چالیس ہزار اشعار موجود ہیں یہ ترکیب "عشق و مستی" خال خال ہے۔ ہمیں اس ترکیب اور تصور "عشق و مستی" جو اقبال کی فکر کا نیا افق ہے سمجھنے کے لیے پہلے عشق اور مستی کو جداگانہ پھر ان دونوں حالتوں کو ان کی شکل میں علم کلام کی روشنی کے ساتھ داخلی واردات اور وجدانی منازل سے گزرنا ہوگا اور اس ترکیب کی تحلیل اور تحلیل کا تجزیہ کرنے کے لیے اقبال ہی کے کلام سے استفادہ کرنا ہوگا۔ راقم نے اس تصور "عشق و مستی" پر اپنی جدید تصنیف "اقبال کے چار مصرعے" میں مفصل گفتگو کی ہے۔

عشق یہ سہ حرفی عربی لفظ قرآن، حدیثِ نبویؐ، شعرِ جاہلیت اور صدرِ اسلام کے کلام اور عربی ادبیات میں نظر نہیں آتا۔ اگر عشق کے لفظ کی تاریخی حیثیت پر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین عربی شعراء نے اس لفظ کا استعمال کم کیا ہے۔ عشق کے لفظ کا استعمال اور اس کی تمام ترکیبات پر تفصیلی گفتگو سب سے پہلے فلسفۂ اشراق میں ملتی ہے۔ عشق کے مطالب و معانی قرآن و حدیث اور شعرائے صدرِ اسلام میں حُب، محبت، مودت اور ولا جیسے ہم معنی الفاظ سے ادا کیے گئے ہیں۔ محبت، محبوب، مُحب، حبیب کس مادے سے نکلے ہیں اس میں اختلاف ہے مگر اکثر علمائے ادبیات کا خیال ہے کہ یہ الفاظ "حب" سے مشتق ہے۔ حب کے معنی وہ گھڑا ہے جس میں کہ وہ پانی بھرا ہو جس کی وجہ سے نظر اس سے گزر نہ سکے یعنی جب دل محبت سے بھر جاتا ہے تو اس میں محبوب کے سوا کسی اور کے لیے جگہ نہیں ہوتی اس میں کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ بعض علمائے ادب نے ان الفاظ کو "حباب الماء" سے مشتق کیا ہے جس کے معنی بارش کا تیز بہتا ہوا پانی جو تھم نہیں سکتا چنانچہ محبت بھی جوش دل ہی ہے اور یہ تھم نہیں سکتی۔ بہرحال عشق اور محبت ہم معنی الفاظ ہیں چنانچہ شریعت اور طریقت میں یہ الفاظ مترادفات کے طور پر ملتے ہیں۔ مختلف علماء نے عشق و محبت کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن کا ذکر اس مختصر تحریر میں ممکن نہیں صرف اصطلاحی معنی کو واضح کرنے کے لیے چند نکات کو یہاں پیش کرتے ہیں۔

جناب سہل بن عبداللہ عشق و محبت کو محبوب کی عبادتوں سے تمسک اور محبوب کے احکام کی مخالفت سے برات مانتے ہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کے نظریے کے تحت عشق و محبت میں اپنے زیادہ کو کم اور محبوب کے کم کو زیادہ سمجھنا ہے۔ امام غزالی نے محبت و عشق کو کسی چیز کے اچھے ہونے کی وجہ سے پسندیدگی اور چاہت کے ارتقاء سے تعبیر کیا ہے اور اس کے خلاف کسی چیز کے برے ہونے کی وجہ سے نفرت اور بیزاری کا نام دیا ہے۔ کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخش نے عشق و محبت کے معنی کسی چیز کا حد سے زیادہ شوق ہو جانا بتایا ہے۔ بعض علمائے مشائخ صرف بندے سے خدا کا عشق روا جانتے ہیں اور خدا کا بندے سے عشق نہیں مانتے کیونکہ عشق و محبت کی صفات میں فراق شرط ہے اور ان مشائخ کے نظریے میں بندہ کا خدا سے وصال ہوگا۔ بعض مشائخ طریقت بندے سے خدا اور خدا سے بندہ کا عشق یا محبت روا نہیں مانتے کیونکہ عشق یعنی حد سے بڑھ جانا چنانچہ بندہ کے عشق میں خدا محدود ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس شک و ذہنی رسائی کا حاصل یہ ہے کہ فلسفۂ عشق و محبت میں کئی مکتبِ خیال اپنے اپنے نظریوں پر قائم ہیں۔

عراقی کہتا ہے

به عالم هر کجا درد دلی بود
بهم کردند و عشقش نام کردند

اقبال اپنی نظم محبت میں کہتے ہیں

یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی
نہ تاج سلطاں نہ مرعوب سلطاں

محبت ہے آزادی و بے نیازی
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

اقبال کی نظر میں عشق و محبت کس طرح چھائے گئے اس کی جھلک ان اشعار میں ملتی ہے

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیح ابن مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

عطار کہتے ہیں:

عاشقاں را با خود و با ہیچ کس تدبیر نیست
عین و شین و قاف را اندر کتب تفسیر نیست

میر تقی میر فرماتے ہیں۔

سخت کافر تھا جس نے پہلی بار
مذہب عشق اختیار کیا

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

ولی دکنی فرماتے ہیں:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا
گر نہیں راہ عشق سے آگاہ
فخر بے جاہ ہے فخر رازی کا

ہم یہ کہہ رہے تھے کہ عشق کے لفظ کو شیخ اشراق کی کتاب حکمۃ الاشراق کے بعد نیا مقام حاصل ہوا اور بعد میں یہ لفظ عشق حقیقی سے زیادہ عشق مجازی کا سرمایہ بنا۔ اردو شعر و ادب اور فلسفہ میں عشق کے معانی اور مطالب پر فارسی کا گہرا اثر رہا ہے عشق کی بیشتر واردات ہمیں فارسی سے ورثہ میں ملی ہیں۔ چنانچہ عشق کے لوازمات جن میں سوز و گداز، وصل و فراق، تمنا و آرزو و مستی، حیات و ممات، خودی و بیخودی، فکر و ذکر، دل و دیدہ وغیرہ شامل ہیں فارسی ادب سے شدید متاثر ہیں جن کی صاف گونج ہمارے مشاہیر خصوصی صوفی شعرا کے کلام میں ملتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اقبال بھی میر تقی میر کی طرح عشق کو اپنا امام اور عقل کو اپنا غلام بتاتے ہیں۔ لیکن امام عشق میر اور پیر عشق اقبال کے لوازمات عشق اور ان کے مقاصد اور نتائج میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

میر وصال کے خواہاں ہیں تو اقبال فراق کے دلدادہ۔ میر فنا کو مقصد زیست سمجھتے ہیں تو اقبال بقا کو۔ میر حیات اور ممات کے درمیان دم لینے کے قائل ہیں تو اقبال پیہم تسلسل اور تغیر کے ساتھ حرکت اور سکونت کے خلاف ہیں۔ میر بے آرزو مردانی کیفیت سے دوچار ہیں تو اقبال آرزو اور تمنا کو زندگی کا مزا جانتے ہیں۔ میر کی خودی میں بیخودی ہے تو اقبال کی بیخودی میں خودی ہے۔ چنانچہ میر کی طرح بیشتر اثرات اردو کے دوسرے شعرا کے کلام جن میں درد، غالب، آتش، فانی وغیرہ سرفہرست ہیں ہمارے بیان پر دال ہیں۔ ساڑھے سات سو سال قبل پیر رومی نے فخر الدین رازی کی معقولات اور منطقی گفتار کو تفسیر و تاویل کے لیے معتبر جانا کیوں کہ مولانا روم عقلی دلائل اور منطقی محسوساتی ادراک کو جذبات اور وجدان کو سمجھنے کا پیمانہ نہیں مانتے تھے۔ مولانا روم فرماتے ہیں منطق اور استدلال کے پاؤں لکڑی کے پاؤں کی طرح تکلیف دہ ہوتے ہیں اگر عشقیہ اور وجدانی واردات کی عقل رہبر ہوتی تو آج فخر الدین رازی دین کے رموز سے واقف ہوتے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود
اندریں بحث از خرد رہ بیں بود
فخر رازی راز دار دیں بود

اور اسی راز کو مرید رومی اقبال نے بھی محسوس کیا اور اسی لیے فرمایا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے رازی کا سرمہ دھو دیا ہے یا کیوں قرآن کے معنی رازی سے پوچھیں؟

چو سرمہ رازی را از دیدہ فرو شستم
چہ رازی معنی قرآن چہ پرسی؟
نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

اقبال رومی ہی کی صدا ہے بازگشت کو نئے طریقے سے چار مصرعوں میں پیش کرتے ہیں۔

جمال عشق و مستی نے نوازی
جلال عشق و مستی بے نیازی
کمال عشق و مستی ظرف حیدرؑ
زوال عشق و مستی حرف رازی

یعنی رازی کی معقولات، منطقی استدلال محسوسات سے جذب

وحال کی کیفیات کی تشریح عشق و مستی معرفت الٰہی کے نزول کا باعث ہے یہ
عشق و مستی کا راستہ عشق حضور اکرم ﷺ سے ہوتا ہوا رب العالمین تک پہنچا
ہے اقبال کہتے ہیں جانتے ہو عشق و مستی کہاں سے ہے یہ حضور اکرم ﷺ کے
سورج کی ایک کرن ہے

ی عراقی عشق و مستی از کجاست
ایں شعاع آفتاب مصطفیٰ است

ثقہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

عشق و مستی کی انتہا اس کے حصول میں کمال کا حاصل کرنا ہے جس کا
حاصل رومی کا "انسان کامل" نطشے کا "سوپر مین" جیلی کا "مرد کامل" بایزید کا
"مرد یقین" اور اقبال کا "مرد مومن"، "مرد مجاہد" اور "عبدہ" ہوتا ہے اور یہی مرد
کامل راز دار معرفت الٰہی، حاصل رضائے الٰہی اور لائق نیابت الٰہی ہے یہ
راستہ عشق کی قوت اور مستی کی طاقت سے طے ہوتا ہے جہاں بے خودی خودی کا
جوہر بن جاتی ہے جہاں شراب انسانی خون سے نشہ میں چور ہو جاتی ہے جیسا کہ
امیر عشق و مستی رومی اپنی غزل میں کیفیت مستی کو ظاہر کرتے ہیں۔

مائیم ہمیشہ مست بی مے
مائیم ہمیشہ شاد بی ما

(ہم ہمیشہ مست ہیں بغیر شراب کے اور ہم ہمیشہ خوش ہیں بیخودی میں)

باید کہ جملہ جاں شوی تا لائق جاناں شوی
گر تو سوی مستاں شوی مستانہ شو مستانہ شو

(محبوب کے لائق ہونے کے لیے مادی کثافتوں سے پاک ہو کر سراپا جان ہونا
چاہیے میخانہ مستی میں جانے کے لیے مست اور سرمست رہو)

ز جام عشق سرمستم دو عالم رفت از دستم
بجز رندی و قلاشی نباشد ہیچ سامانم
ہ ای شمس تبریزی چناں مستم درین عالم
کہ جز مستی و قلاشی نباشد ہیچ درمانم

میں عشق کے جام سے مست ہو گیا اور کائنات میرے ہاتھوں سے
نکل گئی اب صرف مستی اور فقر کے سوا میرا سامان کچھ بھی نہیں اے شمس تبریزی
اس دنیا میں تو ایسا مست ہو گیا کہ اس کا علاج سوائے مستی اور فقر کے کچھ اور نہیں
ہو سکتا۔

رومی امیر "عشق و مستی" کے کلام کا اثر اردو شعرا پر کہیں زیادہ اور
کہیں کم نظر آتا ہے اگرچہ عطار، سعدی، سلیمان ساوجی، حافظ کے علاوہ
برصغیر کے فارسی شعرا جن میں خسرو، عرفی، نظیری، کلیم، فیضی، قدسی، بیدل اور
ناصر علی نے بھی ہمارے اردو کے متقدمین اور متوسطین شعرا پر گہرے نقش
چھوڑے ہیں لیکن مولانا روم کی فکر اور ان کے ذکر کا رنگ نمایاں اور صاف نظر آتا
ہے اور بعض اشعار تو مولانا روم کے شعروں کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

خدائے سخن میر تقی میر ذکر میر میں لکھتے ہیں جب وہ آٹھ نو سال کے
تھے تب ان کے والد اور چچا نے انھیں نصیحت کی "بیٹا عشق اختیار کرو۔ عشق ہی
اس کارخانہ پر مسلط ہے اگر عشق نہ ہوتا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ عشق
میں دل کھوتا کمال بندگی ہے عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے یعنی آگ
قرار عشق ہے ہوا اضطرار عشق ہے پانی رفتار عشق ہے آگ سوزش عشق
ہے موت مستی عشق ہے حیات بیداری عشق ہے" ہم ان تمام مضامین کو مولانا
روم کے اشعار میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میر، درد اور غالب کے اشعار پر
بھی رومی کی تاثیر عیاں ہے جنھوں نے تصوف برائے شعر گفتن کی روایت ان
شعرا کے کلام سے متاثر ہو کر لکھی جن کے ساغروں میں رومی کی صراحی سے انڈیلی
گئی شراب عشق ہے ذیل کے اشعار جو مشاہیر اردو شعرا کے کلام سے لیے گئے
ہیں ان میں رومی کی صدائے بازگشت صاف گونج رہی ہے

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے
ہو فنا فی اللہ دائم یاد یزدانی کرے
(ولی)

فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوح مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے
(درد)

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
(درد)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
(میر)

سخت کافر تھا جس نے پہلی بار
مذہب عشق اختیار کیا
(میر)

پاتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم
کہنے کو اختیار ہے پر اختیار کیا
(میر)

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

(غالبؔ)

ابتدائے عشق و مستی قاہری است
انتہائے عشق و مستی دلبری است

(اقبالؔ)

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک ہیں قوموں کے مزار

(اقبالؔ)

رومیؔ عشق کی دولت سے سرشار اور معرفت کے نشے سے مست ہے رومی شریعت جو صرف احکام کے نفاذ اور حقی نظام کا نام ہے یعنی مثلاً نماز پڑھو شراب مت پیو وغیرہ سے آگے بڑھ کر طریقت میں محو کامل ہو جاتا ہے اور پھر تیسرے درجہ معرفت حقیقت میں حیرانی اور دنگی میں کھو جاتا ہے۔ اقبالؔ اگرچہ مرید رومیؔ ہے لیکن وہ بھی حقیقت کی منازل پر سیر کرتا نظر آتا ہے اور اسی لیے اقبال کو ترجمان حقیقت کہا ہے۔ رومیؔ کہتے ہیں۔

بادہ از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما ہست شد نے ما ازو

(شراب ہمارے نشے سے مست ہوئی ہم شراب سے مست نہ ہوئے۔ پیکر خاکی ہماری وجہ سے موجود ہے ہم اس پیکر کے وجود سے)

مولانا رومؔ کی غزل میں مستی کی تکرار کا مزا لیجیے اور مست ہو جائیے

مہر مست و خواب مست و یار مست اغیار مست
باغ مست و راغ مست و غنچہ مست و خار مست
آسمان چند گردی گردش عنصر ببیں
خاک مست و آب مست و باد مست و نار مست
حال صورت این چنین و حال معنی خود مپرس
روح مست و عقل مست و وہم مست افکار مست

(آسمان کب تک گردش کرتا رہے گا ذرا گردش عناصر اربعہ دیکھ یعنی خاک، آب، آگ اور ہوا جس سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے وہ سب مست ہیں۔ ہمارے وجد اور حال کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ ہم سے ہمارا احوال مت پوچھ روح عقل گمان اور فکر سب مست ہیں) اسی لیے تو علامہ اقبالؔ نے کہا تھا

ہم خوگر محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحر پر آشوب و پر اسرار ہے رومیؔ
تو بھی ہے اسی قافلہ شوق میں اقبالؔ
جس قافلہ شوق کا سالار ہے رومیؔ
اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام
کہتے ہیں چراغ رہ احرار ہے رومیؔ

Transcript of Elizabeth Alexander's inaugural poem 1:25 PM PST, January 20, 2009

The following is a transcript of the inaugural poem recited by Elizabeth Alexander:

Praise song for the day.

Each day we go about our business, walking past each other, catching each others' eyes or not, about to speak or speaking. All about us is noise. All about us is noise and bramble, thorn and din, each one of our ancestors on our tongues. Someone is stitching up a hem, darning a hole in a uniform, patching a tire, repairing the things in need of repair.

Someone is trying to make music somewhere with a pair of wooden spoons on an oil drum with cello, boom box, harmonica, voice.

A woman and her son wait for the bus.

A farmer considers the changing sky. A teacher says, "Take out your pencils. Begin."

We encounter each other in words, words spiny or smooth, whispered or declaimed; words to consider, reconsider.

We cross dirt roads and highways that mark the will of someone and then others who said, "I need to see what's on the other side; I know there's something better down the road."

We need to find a place where we are safe; we walk into that which we cannot yet see.

Say it plain, that many have died for this day. Sing the names of the dead who brought us here, who laid the train tracks, raised the bridges, picked the cotton and the lettuce, built brick by brick the glittering edifices they would then keep clean and work inside of.

Praise song for struggle; praise song for the day. Praise song for every hand-lettered sign, the figuring it out at kitchen tables.

Some live by "Love thy neighbor as thy self." Others by "First do no harm," or "Take no more than you need."

What if the mightiest word is love, love beyond marital, filial, national. Love that casts a widening pool of light. Love with no need to preempt grievance.

In today's sharp sparkle, this winter air, anything can be made, any sentence begun.

On the brink, on the brim, on the cusp -- praise song for walking forward in that light.

براہِ راست

اردو زبان اور اس سے وابستہ علوم و فنون کی برِصغیر کی بابت جس قدر کہا جائے خوش امیدی و خوش گمانی کا نام دیجیے! اصل کی بات یہ ہے کہ اردو زبان کے رضاعی والدین اور اجارہ داروں کی نسبت وہ حلقے اور احباب زیادہ ایمان داری اور تن دہی سے اردو کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں جہاں یہ زبان لطیف اور اس سے وابستہ رشتے نہ صرف مانوس ہی نہیں بلکہ محفوظ بھی ہیں۔ جب جب بات مستند پاسبانانِ اردو کی ہوگی تب تب یہ نام اور چہرے سامنے نکل کے پردے پر جلوہ گر ہو کر آپ کو اپنی جانب متوجہ ضرور کر لیں گے۔ ذرا سے غور اور تھوڑی سی فکر کے بعد تمام سب سے نیا روشن، نمایاں اور بلند ستارہ کمال دکھلائی دے گا وہ صرف اور صرف ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ہوگا۔ آج کی محفل ہم نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی کاوش اور کارناموں کے اقرار و اعتراف کی غرض سے صرف اس لیے سجائی ہے کہ درست وقت پر درست انداز میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی خدمات کا صرف اعتراف کیا جائے بلکہ اپنی زبان و ادب کے بحرِ مشکل کی خاطر کشادہ دلی سے اُن کی پذیرائی بھی اس انداز میں کی جائے کہ انیس و دبیر، غالب و اقبال کی ارواح کو اتنا اطمینان ضرور ہو کہ اردو نے اُن کی زندگی میں اگر نہ سہی اُن کے ایک سچے عاشق اور نیازمند کو اُس کی زندگی میں عزت و توقیر سے سرفراز کیا!!!

گلزار جاوید

☆ ڈاکٹر صاحب! آپ کی علمی، ادبی اور تحقیقی جہات سے باخبر حلقے آپ کی شخصیت سے اُس طور واقف نہیں جس طور آپ کے کارناموں سے آگاہ ہیں۔ کیوں نہ آج کی نشست میں گفتگو کی ابتدا خاندانی پس منظر سے کی جائے؟

☆☆ میرا آبائی تعلق امروہہ سے متصل سادات کی بستی نوگاواں سادات سے ہے۔ ہمارا خاندان سید بڑے کا خاندان کہلاتا ہے اور ہمارا شجرۂ نسب حضرت نظام الدین اولیاء سے جا ملتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی ثانی اسی نسبت سے مجھے اپنا رشتہ دار کہا کرتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں راسخ علوم کے بے شمار علماء گزرے ہیں۔ ہمارے جد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی "حق الیقین" نامی دو سو اٹھارہ سال پرانی کتاب میرے پاس ابھی بھی محفوظ ہے۔ میری پیدائش البتہ دہلی میں ہوئی اور حیدرآباد دکن بچپن ہی سے میرا وطن بن گیا۔ بچپن ہی سے شعر و ادب سے خاصی دلچسپی رہی جس کے باعث اسکول و کالج کے ایام میں شعری مشغلہ جاری رہا۔

☆ آبا کا پیشہ اور دہلی سے منتقلی کے اسباب پر روشنی ڈالیے؟

☆☆ میرے دادا سید شبیر علی عابدی تک ہمارا خاندانی پیشہ زمینداری ہوا کرتا تھا۔ میرے والد سید سبطِ نبی عابدی نے سب سے پہلے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ قانون کی ڈگری بھی حاصل کی اور دہلی میں مجسٹریٹ متعین ہوئے۔ ازاں بعد والد صاحب کا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا اور یوں ہمارا مستقل مسکن حیدرآباد دکن بنا۔

☆ آگے بڑھنے سے قبل کھیل کود کے میدان اور علمی درسگاہوں کے لڑکپن کو کچھ دیر کے لیے آواز دیجیے؟

☆☆ میں نے عرض کیا نا کہ گھریلو ماحول علمی و ادبی ہونے کے باعث کھیل کود تو میں اُس قدر ہی کھیل سکا جس قدر بچپن میں عام بچے کھیلتے ہیں۔ میرے والد صاحب کو بھی شاعری سے شغف تھا اور انہی سے یہ وصف میرے اندر بھی منتقل ہوا۔

☆ آپ نے باقاعدہ شعر کہنا کب اور کس طور شروع کیا؟

☆☆ فطری شاعری ایک قدرتی چشمے کی مانند آپ ہی آپ سینے سے اُبل پڑتی ہے یہی فرق ایک فطری اور اکتسابی شاعر میں ہوا کرتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اسکول میں شاعری کا ماحول قطعی نہ تھا اور اتفاق کہیے کہ کالج میں بھی شعر و ادب کا گزر نہ ہونے کے برابر تھا۔ چونکہ میرے دل میں شعر و شاعری کی نسبت خاص امنگ تھی اس لیے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر شعر و سخن کی محافل میں شرکت کرتا اور بیت بازی کے مقابلوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں شاعری کو اپنی شناخت بنانا چاہتا تھا مگر جب تعلیم اور معاش کی بندشوں سے ذرا فرصت ملی اور میں نے شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا تو بہت ہی کم عرصے میں بطور شاعر میری شناخت قائم ہو گئی۔

☆ اب سوال بنتا ہے قلم و کتاب سے آپ کے سنجیدہ عشق یعنی نثری سفر کے آغاز اور اُس کے ابتدائی نتائج کا؟

☆☆ روزنامہ سیاست اور حیدرآباد کے بعض پرچوں میں میرے مضامین کی ابتداء اس عمر میں ہو گئی تھی جسے انگریزی میں Teen Age کہا جاتا ہے۔ روزنامہ سیاست کے ایڈیٹر مرحوم عابد علی خاں اور جوائنٹ ایڈیٹر محبوب حسین جگر ہمیشہ میری ہمت افزائی کرتے اور میرے مضامین کو سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے جس کے سبب مذکورہ مضامین میری شناخت بن گئے۔ میڈیکل کالج اور مغربی ممالک کی اعلیٰ تعلیم کے دوران شاعری سے کسی قدر کنارہ کش رہ کر نظم اور صحافت کے حلقے میں شامل ہوا۔ اس کے بعد میری توجہ طب سے زیادہ ادبی مضامین پر مرکوز ہو گئی اور میرے اندر سویا ہوا شاعر اور ادیب پھر سے جاگ اٹھا۔ اس دوران میرا ادبی و شعری مطالعہ شدید اور بھرپور رہا۔ ایک ہفتے میں کئی کئی کتابیں کھنگال ڈالتا اور اکثر کتابوں کے حاشیوں پر نوٹس بناتا اور اس طرح کئی دفتر اپنے لیے نوٹس اور مطالب کے تیار کر لیے۔

☆ بیرون ملک آمد کب اور کس مقصد کے تحت کی گئی؟

☆☆ آپ کے سوال کا جواب میرے تعلیمی سفر کے اندر پنہاں ہے اور یہی میری بیرون ملک آمد کا واحد جواز تھا۔

☆ امریکہ سے کینیڈا منتقلی کے اسباب کیا تھے؟

☆☆ ہر آدمی پرسکون اور پرلطف زندگی کا متلاشی ہوا کرتا ہے۔ امریکہ کی

نسبت کناڈا کا ماحول پُرسکون ہے اور صرف اُنچاس سال کی عمر میں جس وقت میرے موجودہ ادارے نے مجھے پروفیسری کے اعزاز کے ساتھ یہاں کام کی دعوت دی تو میرے خاندان کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ کناڈا میں مستقل سکونت اختیار کرنا ہمارے لیے ہر لحاظ سے سودمند ہوگا۔ اس کی ایک اور وجہ میری بیٹی کا میڈیسن میں داخلہ بھی تھا۔

☆ محترمہ گیتی عابدی سے پہلی ملاقات سے خاتون خانہ تک کی مختصر روداد اور آپ کے قلمی سفر میں اُن کے کردار و دلچسپی کی بابت کچھ فرمائیے؟

☆☆ مختصر طور پر آپ کے سوال کے جواب میں یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ بطور طبیب جب میں ایران میں مشاغل تھا تو میری خاتون خانہ سے وہیں ملاقات ہوئی اور تھوڑے عرصے بعد ہم دونوں کی رضا مندی اور بڑوں کی اجازت سے ہماری شادی ہوگئی۔ میری شریک حیات گھر کی دیکھ بھال بچوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ میرے قلمی جہاد میں ہمیشہ میری معاونت کرتی رہی ہیں اور آج بھی ان کے تعاون کے بغیر میرا ادبی سفر جاری رکھنا ممکن ہے۔

☆ آپ کی فارسی زبان و ادب کی جانب توجہ میں محترمہ کا کس قدر کردار یا تعاون شامل ہے؟

☆☆ باقاعدہ فارسی کی تعلیم میں نے قیام ایران کے دوران ایرانی معلم سے حاصل کی۔ ازاں بعد فارسی ادب اور فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ کر کے اپنی تحقیق اور تخلیق کے سفر میں اس گنج بے بہا سے بے پناہ استفادہ کیا۔ بہر حال چونکہ ہمارے گھر کی زبان فارسی ہے اس لیے خاتون خانہ کا کچھ نہ کچھ کردار میری فارسی دانی میں لامحالہ شامل ہے۔

☆ اس مقام پر آپ کی اولاد اُن کے مشاغل اور آپ کی مصروفیات کی نسبت اُن کی توجہ و اشتیاق سے واقفیت بھی ضروری ہے؟

☆☆ ہماری چار اولادیں ہیں دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔ میرے بچے فارسی بولنے کے ساتھ کسی حد تک پڑھ لکھ بھی سکتے ہیں اور میری خصوصی توجہ کے باعث اردو زبان سمجھتے اور کچھ کچھ بول لیتے ہیں۔

☆ گہرے مشاہدے کی بات ہے کہ ادبی انجمنوں، گروہوں، ٹی ہاؤس، حلقوں اور محافل میں سرگرم نہ ہونے والے اہل قلم کو کم کم ہی اعتراف دی جاتی ہے۔ آپ کے بارے میں اس حوالے سے صورت حال کس قسم کی ہے؟

☆☆ گلزار صاحب! معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ آپ کا سوال مجھے کچھ کچھ Out of Date سا محسوس ہو رہا ہے۔ میری ذات سے قطع نظر پڑھے لکھے اور روشن دماغ اہل قلم کے پاس اس قسم کی مصروفیات کے لیے کم از کم آج کل وقت دستیاب نہیں ہے اور مغرب کی تیز رفتار زندگی میں تو اس قسم کے اشغال کا تصور بھی محال ہے۔

☆ ڈاکٹر صاحب! آپ علمی، ادبی اور تہذیبی طور پر کس دبستان سے قربت رکھتے ہیں مثلاً دہلی، لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد، کراچی وغیرہ نیز ان حوالوں کی اب کوئی حیثیت ہے بھی کہ نہیں؟

☆☆ میں اس سوال کو بھی اس سبب لائق توجہ نہیں گردانتا کہ جو شخص کسی دائرے یا خول میں جس دن گرفتار ہوا اسی دن اس کے سیکھنے کا عمل یوں جانیے کہ ختم گیا۔ میں تمام مکاتب فکر کا احترام کرتا اور ان کی مثبت تعلیم سے فیضیاب ہونے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔

☆ کبھی کبھی آپ کی قلمی فتوحات دیکھ کر رشک آتا ہے کہ آپ جیسا بلند پایہ پیشہ ور طبیب تصنیف و تالیف کے لیے اس قدر وقت کیونکر نکال پاتا ہے۔ کیا آپ ہمیں اپنے نظام الاوقات سے باخبر کرنا پسند کریں گے؟

☆☆ اگر سچ کہا جائے تو زندگی میں وقت کی کمی نہیں ہے۔ وقت کی کمی کو بہانہ بنا کر ہم لوگ بہت سے کاموں سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود ہر ہفتے اوسطاً پینتیس سے چالیس گھنٹے لکھنے پڑھنے پر صرف کیا کرتا ہوں۔ ہر وقت میرے ذہن کے خانے میں اُن موضوعات پر غور و فکر جاری رہتا ہے جن پر میں آئندہ لکھنے کی منصوبہ بندی کرتا ہوں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ادب میرا اوڑھنا بچھونا ہے جسے میں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے غور و پرداخت رکھتا ہوں۔ معنی اور مطالب خود بخود سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور جب قرطاس و قلم لے کر بیٹھتا ہوں تو الفاظ باران رحمت کی طرح خود بخود برسنے لگتے ہیں۔ بات صرف ذوق و شوق کی ہے۔

☆ دو زشاعری میں بقول ڈاکٹر شان الحق حقی نہایت آسان زبان اور عام فہم انداز میں فنی عروض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قول ہے کہ آپ نے فنی عروض پر اس قدر کمال کہاں سے حاصل کیا اور اس کمال کے وسیلے سے شاعری میں کیا نمایاں مقام کیوں حاصل کر سکے؟

☆☆ شاعری میں میرا کوئی باقاعدہ استاد تھا اور نہ ہے۔ علم عروض و قافیہ سے بے خبر شعر کہنے سے بعض اوقات تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کی طرف توجہ کر کے میں نے از خود علم عروض و قافیہ اور شاعری سے مربوط دیگر علوم و ادب کا دقیق مطالعہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شعر کی تقطیع میرے لیے مدرسی کی وہ تختی بن گئی جس پر اطفال حروف تہجی کی مشق کیا کرتے ہیں۔ جب اس فن پر کچھ گرفت حاصل ہوئی تو میں نے دو زشاعری کے نام سے ایک کتاب تحریر کی جس میں اردو کے مروجہ اوزان کی تقطیع مثالوں کے ساتھ پیش کی۔ اس کے علاوہ ایران میں رائج تقطیع ہجائی بھی اس میں شامل کی تا کہ وہ شاعر جن کو اردو کے رسم الخط پر عبور نہیں وہ بھی شعر کی صحت سے واقف ہو سکیں۔ ڈاکٹر شان الحق حقی مرحوم کے علاوہ دیگر اکابرین عروض نے بھی اس کتاب کی آسان زبان اور عام فہم مطالب کی تعریف و ستائش کی ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ شاعری میں میرا جو بھی مقام ہے دل سے اٹھتی ہوئی لہروں کے باعث ہے جنہیں دبا

میرے بس میں نہیں۔ اس کا لطف کیا ہے وہ تو صرف قدرتی چشمے کا بہتا ہوا پانی
بتائے گا کہ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے آبشار میں گنگناتے ہوئے دریا کی روانی
میں گم ہو کر کیا سرور ملتا ہے اس قدر تخلیق کا حق تو قدرت نے ہر شاعر کو دیا ہے
بقول جمیل مظہری

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

اور دیکھئے مولانا روم جن کا میں خلوص دل سے معتقد ہوں کیا
فرماتے ہیں۔

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگران

☆ تیرہ ادب شناس ہستیوں کی نسبت سے "ذکر دیار دل" نامی اور
کتاب کا احوال اور اس میں شامل شخصیات کی نسبت سے کچھ فرمائیے؟

☆☆ جب بھی کسی فنکار پر ظلم ہوتا ہے تو ادب کی روح تڑپ جاتی
ہے اس پر آشوب دنیا میں حق دار کو اس کا حق نہیں ملتا چنانچہ دیگر فرد کی طرح
میری بھی سعی و کوشش یہی رہی کہ ایسے نامور شعراء اور ادباء جن کے ساتھ اہل قلم
انصاف نہ کر سکے ان کے فن اور شخصیت کو کسی طور اجاگر کیا جائے اسی خواہش
کے پیش نظر یہ کتاب تحریر کی گئی ہے کامیابی اور ناکامی کی بابت فیصلہ کتاب کے
قارئین اور ناقدین ہی کرنے کے مجاز ہیں۔

☆ کائنات نجم آپ نے کس جذبے کے تحت ترتیب دی اور آپ کی
اس کاوش سے علامہ نجم آفندی کی شخصیت و فن کے کون سے نئے گوشے منظر عام
پر آئے اور اہل علم نے اس کی بابت کیا رائے قائم کی؟

☆☆ بیسوی صدی کے عظیم شاعر نجم آفندی کی حیات، شخصیت اور کلام پر
دو جلدوں میں سترہ سو صفحات پر مشتمل کتاب برصغیر میں مقبول ہوئی اور اس عظیم
شاعر جس نے انگریز سامراج کے خلاف بغاوت کی جس نے مزدور، کسان اور
محنت کش طبقہ کی حمایت کی اس کا تعارف اردو ادب میں اس طرح ہے ہو جس
طرح اُس عظیم شاعر کا استحقاق بنتا ہے چنانچہ کائنات نجم اس سلسلے کی وہ کڑی
ہے جو ذہنی انسانی کو جھنجھوڑتے ہوئے ہے کائنات نجم میں ایسی نظمیں موجود ہیں
جو اس بات کا محکم ثبوت ہیں کہ نجم کے دل میں محنت کش طبقے کا بے پناہ درد
تھا۔ بقول حسین آغا:

کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو

☆ انشاء اللہ خاں انشاء پر مرتب کی گئی کتاب میں آپ نے کیا کچھ نیا
دریافت کیا اور اس کے اثرات کس قسم کے رہے؟

☆☆ میں نے اوپر کے کسی سوال کے جواب میں عرض کیا ہے کہ میرا
مقصود یہ ہوا کرتا ہے کہ کوئی بھی شاعر و مصنف ہو تا فانی ہو یا نظیر ہو یا کوئی بھی فراموش
شدہ ادیب و شاعر جسے اس کا صحیح حق نہ دیا گیا ہو یا جس کے خاندان میں کوئی ایسا
فرد نہ ہو جو اس کا حق ادا کرنے کی سکت رکھتا ہو جیسے حالی، شیفتہ، شبلی اور ڈپٹی
نذیر احمد کے خاندان کے لوگ کرتے رہے ہیں انشاء اللہ خاں انشاء پر کتاب اسی
جذبے کے تحت تحریر کی گئی جو میں نے اوپر عرض کیا ہے سوال جہاں تک کتاب
کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا ہے اس کا اختیار میرے پاس نہیں ہے۔

☆ مرزا غالب کی نسبت تازہ کتاب میں مرزا غالب کی کس جہت اور
کارنامے کو آپ نے بحث کا موضوع بنایا ہے؟

☆☆ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی مرکزی کمیٹی نے مجھے غالب کے فارسی
کلام کی تدوین اور ترتیب کی ذمہ داری سونپی۔ چنانچہ راقم نے دقیق تحقیقی دیدہ
ریزی اور دلچسپی سے اس سنگین پتھر کو یک وتنہا اٹھا کر حرب عشق پر لیا جا دیا جو
آئندہ وقتوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ چودہ سو سے زیادہ صفحات
پر مشتمل دو جلدوں میں مرزا غالب کا فارسی کلام جس میں کئی سو اشعار کا ترجمہ اور
تشریح بھی شامل ہے چنانچہ "کلیات غالب فارسی" میں گیارہ ہزار تین سو
بتیس اشعار شامل ہیں جن کو تحقیق، تقسیم، تدوین اور ترتیب کے ساتھ رائج الوقت
فارسی کے رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے اس کلیات میں اختلافات نسخ کی بھی
نشاندہی کی گئی ہے اس کے علاوہ ایک مختصر اور منتخب سوانح عمری غالب بھی
قارئین کی معلومات کے لیے شامل اشاعت کی گئی ہے تا کہ غالب کی فارسی
شاعری کو سمجھنے کے لیے آسانی ہو اور ان پر تحقیقی تنقیدی سکالرز کو مطالب تک پہنچنے
میں دشواری نہ ہو اس کتاب کی رونمائی دہلی کے گورنر جنرل اور سفیر ایران ڈاکٹر
نبی زادہ کے ہاتھوں انجام پائی۔

☆ "کلیات غالب" کے ایک ہزار چار سو صفحات کا ذکر اس کے دو سو
صفحات پر مشتمل پیش لفظ کے بغیر نامکمل گردانا جائے گا کیا واقعی آپ نے اس
قدر طویل پیش لفظ تحریر کیا ہے؟

☆☆ جی ہاں! آپ کی اطلاع درست ہے آپ کی بات کو آگے
بڑھاتے ہوئے آپ کے ذریعے ہی قارئین چہار سو کو یہ خوشخبری بھی سنانا چاہوں
گا کہ نہ صرف "کلیات غالب فارسی" کا دیباچہ دو سو صفحات پر مشتمل ہے بلکہ اس
میں عنقریب جدید مطالب کے اضافے کے ساتھ بہت سے نئے صفحات کے
اضافے کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ جنہیں علیحدہ طور پر کتابی شکل میں
شائع کیا جائے گا۔

☆ رثائی ادب کی جانب آپ کی خصوصی توجہ کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ مرزا دبیر پر میری سات کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ دبیر شناسی
اردو ادب کے لیے عموماً اور رثائی ادب کے لیے خصوصاً اس لیے بھی ضروری ہے
کہ اس سے اردو ادب کی فصاحت و بلاغت کو ترقی ہوگی۔ مرزا دبیر اردو کا وہ عظیم

شاعر ہے جس نے سب سے زیادہ اشعار کہے، سب سے زیادہ رباعیات لکھیں، سب سے زیادہ الفاظ اردو میں استعمال کیے۔ افسوس موازنۂ انیس و دبیر میں علامہ شبلی نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ دبیر کے فن، حسب نسب، کسب اور کلام پر بے رحمانہ حملے کیے گئے۔ انیس دبیر کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں میر انیس کا رنگ نظر آتا ہے لیکن میر انیس کے کلام میں دبیر کا پرتو بالکل نہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اردو کی ترقی اور توانائی کے لیے دبیریت کو کالج اور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا جائے جیسے یوسف کو بازار مصر میں پیش کرنا ہمارا فرض ہے کوئی بھی تھا کوشش کے باوجود کسی تحقیق کار کو مل نہیں سکا۔ خدائے سخن میر تقی میر کیا خوب فرماتے ہیں:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

☆ آپ نے ایک نہایت ضخیم کتاب میر انیس کے ایک مرثیے کو عنوان بنا کر لکھ ڈالی۔ کچھ اس کی بابت ہمارے قارئین کو باخبر کیجیے؟

☆☆ میر انیس کے شاہکار مرثیے "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کا تجزیہ راقم نے قریب آٹھ سو صفحات پر کیا ہے جو دنیائے ادب میں کافی مقبول بھی ہوا۔ اس تجزیے میں میر انیس کی حیات، شخصیت و فن پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ مرثیے کے ہر شعر کا جدا جدا تجزیہ کیا گیا ہے جس میں فصاحت، بلاغت، محاورے، روزمرہ، تشبیہات، استعارات، کنایات اور مجاز مرسل کی شاعری کے علاوہ صنائع لفظی اور صنائع معنوی کو اس طرح جتایا گیا ہے کہ میر انیس کی قادر الکلامی کی سند صرف ایک ہی مرثیے سے ثابت کی گئی ہے۔ اس ایک مرثیے میں صرف صنعتوں کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ ہے۔ تجزیہ کامل ہر شعر کو جداگانہ، پھر ہر بند کو جداگانہ اور آخر میں پورے مرثیے کو اکائی جان کر کیا گیا ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کو رثائی ادب کا ماہر کیوں گردانتے ہیں؟

☆☆ اصولی طور پر تو یہ سوال انہی لوگوں سے کیا جانا چاہیے جن کی جانب آپ اشارہ فرما رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ خود کو ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم گردانا ہے اور آئندہ بھی میں اپنی اس شناخت کو برقرار رکھنے کا آرزومند ہوں۔

☆ آپ سے قبل پروفیسر مسعود حسن ادیب کا نام "مرثیہ" پر کام کرنے والوں میں نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ آپ اپنے کام کو پروفیسر مسعود حسن ادیب کے کام سے کس قدر مختلف یا برتر گردانتے ہیں؟

☆☆ انیسیات پر جس نوعیت کا عمدہ کام پروفیسر مسعود حسن ادیب نے کیا ہے اس کی دوسری مثال رثائی ادب میں موجود نہیں۔ اگرچہ میں بھی اسی راستے پر گامزن ہوں مگر:

گو شبِ خاک ہوں مگر آدمی کے ساتھ ہوں

میر انیس کے مطبوعہ مرثیوں میں ایک اندازے کے مطابق بارہ ہزار سے زائد غلطیاں موجود ہیں جن کی نشاندہی ڈاکٹر صفدر حسین، جناب ہادی علی ناقی، ڈاکٹر نیر مسعود، پروفیسر ادیب اور سفارش حسین نقوی نے کی ہے۔ ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں "کلیات انیس" تصحیح کے ساتھ آٹھ جلدوں میں مرتب کر رہا ہوں۔

☆ ایک سوال یہ بھی شدت سے سامنے آیا ہے کہ مرثیہ پابند اجزائے ترکیبی کی وجہ سے بہت حد تک متاثر ہوا ہے۔ کیا آپ مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں کمی کی بیشی کی گنجائش محسوس کرتے ہیں؟

☆☆ مرثیے کے کلاسیکی اجزائے ترکیبی میں چہرہ، گریز، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن جدید مرثیہ میں لازم نہیں کہ یہ اجزا موجود ہوں۔ چنانچہ آج کے دور کی ضروریات کے تحت بعض اجزا جس میں چہرہ، شہادت اور بین کے اشعار شامل ہیں مرثیہ کی شناخت نظر آتے ہیں جبکہ آمد، رجز اور جنگ جس میں تلوار، گھوڑا اور لڑائی شامل ہیں، جدید مرثیوں میں خال خال ہیں۔

☆ عشقی، سکرتی اردو زبان و ادب کے آئینے میں مرثیے کا مستقبل آپ کے خیال میں کیا ہے؟

☆☆ میرے اندازے کے مطابق آج کے اس دور میں تیس، چالیس افراد کسی نہ کسی طور پر مرثیہ کی صنف سے خود کو وابستہ رکھے ہوئے ہیں جبکہ دس بارہ افراد مربوط انداز میں مرثیہ لکھنے میں مشغول ہیں۔ میں مرثیے کے مستقبل کی بابت اس لیے پر امید ہوں کہ مرثیے میں اردو ادب کا بہت بڑا خزانہ محفوظ ہے۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو شاعر مرثیہ لکھ رہا ہے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب صورت بات کہی ہے "اردو ادب کی جانب سے غالب کی غزلیات اور انیس کے مرثیے دنیائے ادب کو تحفے میں پیش کیے جا سکتے ہیں"۔

☆ علامہ اقبال سے آپ کے خصوصی تعلق اور لگاؤ کے ہم بھی شاہد ہیں۔ کیا آپ اس عقیدت کی وجوہات بتانا پسند کریں گے؟

☆☆ علامہ اقبال برصغیر کی ان عہد ساز شخصیات میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں جنھوں نے ایک سے زائد نسلوں کو اپنے اقوال و افکار سے متاثر کیا ہے۔ بالخصوص جن گھرانوں میں علوم و فنون پہلی ترجیحات میں شامل تھا وہاں علامہ کے کلام سے نیاز مندی کے ساتھ عقیدت کا کوئی نہ کوئی پہلو بھی ضرور موجود تھا چنانچہ ہمارے گھرانے میں بھی علامہ اقبال کو ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا جس کے باعث میں بھی بچپن ہی سے علامہ اقبال کی شاعری، فلسفے اور فکر سے بے پناہ متاثر ہوا اور آج تک ہوں اور وقت گزرنے کے ساتھ اس عقیدت میں مزید پختگی آ رہی ہے۔

☆ آپ کے جواب کی روشنی میں یہاں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا آپ کی عقیدت کا مرکز علامہ سے شروع ہو کر علامہ پر ہی ختم ہو جاتا ہے یا

اس کے مراکز ہو سکتے ہیں؟

☆☆ دیکھیے! یہ سوال پھر انسانی آزادی کے پر کترنے کے مترادف ہے۔ علامہ اقبال سے عقیدت و نیازمندی کبھی بھی آپ سے یہ سوال نہیں کرتی کہ آپ دنیا کے تمام علوم و فنون سے منہ موڑ کر صرف علامہ کے حصار میں مقید ہو جائیں۔ علامہ اقبال تو خود دعوتِ فکر دینے والے مفکر اور دانشور ہیں لہٰذا میرے غور و فکر کا سلسلہ بھی علامہ کی تعلیمات کے عین مطابق ہے سکڑا ہوا ہرگز نہیں ہے۔

☆ قول یہ کہ علامہ کے خطوط نے آپ کی توجہ کب اور کیونکر حاصل کی نیز یہ کہ بارہ سو خطوط میں صرف طبی خطوط کا انتخاب کیوں اور کس پیمانے کے تحت کیا اور یہ کتاب اپنی افادیت کس طرح ثابت کر رہی ہے؟

☆☆ ”علامہ اقبال کے عرفانی زاویے“ کی مقبولیت کے بعد راقم نے ”چوں مرگ آید“ تصنیف کی جس میں دو سو اکیاون خطوط کو اس لیے منتخب کیا جن میں علامہ کی بیماری، پرہیز اور علاج کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اردو ادب کا شاید ہی کوئی بڑا ادیب یا شاعر رہا ہو جس نے اس تفصیل سے اپنی بیماری اور اس سے مربوط مسائل کا ذکر کیا ہو۔ اس کتاب میں اقبال کا فلسفۂ موت اور زندگی کے کاروبار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ عوام میں اس کتاب کی پذیرائی عمدہ طریقے سے کی گئی ہے۔ اس کتاب کو اقبال اکادمی لاہور نے شائع کیا ہے اور پوری کتاب میری ویب سائٹ www.drtaqiabedi.com پر پڑھی جا سکتی ہے۔

☆ علامہ کے آخری ایام میں ہونے والے علاج پر آپ کے تحفظات کس قسم کے ہیں؟

☆☆ میرے تحفظات بھی اسی نوعیت کے ہیں جو علامہ سے شیفتگی رکھنے والے عام نیازمند کے ہو سکتے ہیں۔ بطور طب کے طالب علم میں یہ سمجھتا ہوں کہ کاش اس وقت علامہ کے علاج پر جدید طبی نقطۂ نظر رکھنے والے مغربی طبیبوں کو علاج کا موقع دیا جاتا تو شاید ہمیں علامہ سے مزید استفادے کا موقع میسر آ سکتا۔

☆ آپ علامہ اقبال کو عالمی مفکر و دانشوروں کی صف میں کس مقام کا حامل گردانتے ہیں اور مستقبل میں علامہ کو کس مقام پر متمکن دیکھتے ہیں؟

☆☆ میرا یہ مقام ہرگز نہیں ہے میں تو اپنے بارے کسی قسم کی پیش گوئی کرنے کی پوزیشن میں نہیں پھر بھلا علامہ جیسے دیوہیکل کے بارے کچھ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں البتہ! اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ وقت گزرنے کے ساتھ علامہ کی شخصیت عظمت کی جانب گامزن ضرور رہے گی۔

☆ مجموعی طور پر اگر ہم آپ سے یہ دریافت کرنا چاہیں کہ آپ کی اب تک کی تگ و کاوشات سے اردو ادب کو اور آپ کو کیا حاصل ہوا نیز مستقبل میں کیا حاصل ہونے کے امکانات ہیں تو آپ کیا ارشاد فرمائیں گے؟

☆☆ سوال جہاں تک میری ذات کا ہے تو الحمدللہ میں کلی طور پر مطمئن ہوں۔ میری تیس (۳۰) سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں میرے دو شعری مجموعے ”مشکیزہ رہا“ اور ”جوشِ مودت“ شامل ہیں۔ مختلف ادبی و شعری ہستیوں اور شاعری کے فنی تقاضوں، رسم الخط اور محاسن زبان و صنائع بدائع پر مختلف مضامین تین جلدوں میں مطبوعہ شکل اختیار کر چکے ہیں۔ میرے مقالات کی تین کتابیں ”عروسِ سخن“، ”ذکرِ دربار“ اور ”سیدِ سخن“ احباب علم و ہنر کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہیں ان کی بابت فیصلہ ہونا باقی ہے جس کی بابت کبھی بھی میرے دل میں بے اطمینانی کے احساسات موجزن نہیں ہوئے۔

☆ رام بابو سکسینہ نے ”تاریخِ اردو“ مرتب کرتے ہوئے فرمایا تھا ”اس کام میں رام بابو سکسینہ ختم ہو جائے گا اور رام رام باقی رہ جائے گا“ آپ کی بابت اگر یہ محاورہ استعمال کیا جائے تو کیا کچھ باقی بچنے کے امکانات ہیں؟

☆☆ پہلی بار اس قسم کا سوال آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا ہے۔ میں بھی رام بابو سکسینہ کی پیروی میں یہی عرض کروں گا کہ سب فنا ہو جائے گا باقی جو رہے گا وہ اللہ ہوگا۔

☆ اس قدر ہمہ رنگ، ہمہ جہت اور کثیر الاطراف شخصیت ہونے کے باوجود آپ کے متعلق کوئی پختہ تاثر قائم نہ ہونے کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں اور یہ کہ آپ کس حوالے سے اپنی شناخت کے آرزومند ہیں اور آپ کی آرزو کی تکمیل کے کتنے فیصد امکانات ہیں؟

☆☆ دنیا کے ہر بڑے ادب میں شہرت اور اعتبار دو علیحدہ علیحدہ قدریں ہیں یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو دونوں قدریں حاصل ہو سکیں۔ غالب یہ قدریں علیحدہ علیحدہ بٹتے میں رکھی جاتی ہیں۔ اردو ادب خصوصاً ادب لطیف اس سے مستثنیٰ ہرگز نہیں۔ قدرت ہر دو کسی کی محنت کو ضائع ہونے نہیں دیتی۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ بہترین اجرت وہ ہے جو پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدور کی ہتھیلی پر رکھ دی جائے لہٰذا میری ایک نہیں دونوں ہتھیلیوں میں احباب کی بے پناہ محبت، خلوص اور احترام اتنی مقدار میں موجود ہے جس سے میری تمام طلب کی تسکین بآسانی ہو رہی ہے اگر آپ میرے خیال سے اتفاق کریں تو یہی میرا ثمر اور یہی میری شناخت ہے۔

☆ جس قدر مفید اور بامقصد کام آپ سرانجام دے چکے ہیں اس سے کہیں کم کام کرنے والے محققین اور ناقدین کی بحث کا موضوع ہوا کرتے ہیں جبکہ آپ کے باب میں ابھی تک اس طرح کی کوئی پیش رفت ہمارے علم میں نہ ہے؟

☆☆ اردو کے گہوارے میں موجود افراد کی شناخت دیگر افراد کی نسبت سریع اور نمایاں ہوتی ہے۔ انجمن مطلقوں کی باہمی کشمکش اور رقابت اردو کا شب و

رونق کا ماحول بالخصوص ان شخصیات کے لیے جن کی روزی روٹی اردو سے جڑی ہوتی ہے ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جس میں شہرت کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر افراد بہت جلد سرنگوں اس لیے ہو جاتے ہیں کہ اس پرواز میں ان کی طاقت نہیں بلکہ دوسروں کی قوت شامل ہوتی ہے۔

ع   فوارہ چوں بلند شود سرنگوں شود

الحمدللہ میں اپنی کوششوں کے فیض و برکات سے مطمئن ہوں اس لیے کہ اردو کی موجودہ عظیم ہستیوں کے سامنے میرا ایک اعتبار ہے، ایک وقار ہے، ایک عزت ہے۔ یہی اعتبار، یہی وقار اور یہی عزت میری اردو زبان و ادب سے محبت بلکہ دیوانگی حقیقت میں فرزانگی کا پروانہ بن جاتی ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ اپنے منہ میاں مٹھو بنوں اور اپنے کارناموں اور ان پر تحقیقی کام کی تفصیل بیان کروں یہ مجھے یا کسی بھی حقیقی فنکار کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ آپ کے اصرار پر اتنی عرض کر سکتا ہوں کہ آج کل بھارت اور پاکستان میں اس حقیر و فقیر کے فن و شخصیت پر کام ہو رہا ہے جو میری ہمت افزائی اور فن شناسی کی جانب مثبت قدم ہے۔ میرے خیال میں ناقدین کی آراء، تبصرے، اشارے، تشریحات، مبالغات وغیرہ سب کسی اہم کام کی حوصلہ افزائی کے لیے مفید ہیں لیکن سچی اور کھری بات یہ ہے کہ:

ع   ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

☆   یادگار انیس کا جو ترجمہ ڈیوڈ میتھوز صاحب نے کیا ہے اس کی اشاعت اور تقسیم کس مرحلے میں ہے نیز اور کہاں کہاں تراجم ہو رہے ہیں؟

☆☆   ”جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے“ کے منظر عام پر آنے سے قبل پروفیسر ڈیوڈ میتھوز نے ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور وہ اس شاہکار کتاب میں شامل اشاعت ہے۔ سوال کے دوسرے حصے کی بابت یہی عرض کروں گا:

ع   پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

☆   آپ کی تخلیق کردہ کتب انتہائی دیدہ زیب اور بیش قیمت ہوتے ہوئے بھی مفت تقسیم ہونے کے باعث احباب میں آپ کی مالی حیثیت کی بابت خاص طرح کا اشتیاق پایا جاتا ہے؟

☆☆   جیسا کہ میں نے اوپر کہیں عرض کیا ہے کہ میری تیس سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ میری سب سے پہلی کتاب ”شہید“ (فارسی) کا اردو میں ترجمہ تھا جو ۱۹۸۰ میں تہران سے شائع کیا گیا۔ میری بہت سی کتابیں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، اقبال اکیڈمی لاہور، تعمیر انسانیت لاہور، اظہار اینڈ سنز لاہور اور ملتان سے شائع ہوئی ہیں۔ بعض کتابیں دہلی اور حیدرآباد دکن سے بھی طبع کی گئی ہیں۔ جو کتابیں اکادمی، انسٹی ٹیوٹ، انجمن اور دوسرے ادارے شائع کرتے ہیں وہ ان اداروں کے تحت باقاعدگی سے فروخت کی جاتی ہیں۔ میرے حصے کی جتنی جلدیں مجھے عنایت کی جاتی ہیں وہ میں حق بہ حقدار کے مصداق احباب کی خدمت میں بلا معاوضہ پیش کر دیتا ہوں بلکہ جو کتابیں میں اپنے خرچ سے شائع کرتا ہوں وہ بھی اپنے دوستوں، کرم فرماؤں اور پرستاروں کو بلا قیمت مہیا کرتا ہوں۔ یہ سب توفیق خداوندی ہے کہ میں اپنی آمدنی کا کچھ حصہ لہو و لعب میں صرف کرنے کے بجائے اس شریف زبان پر قربان کر سکوں۔ شاید اسی کو ادب میں دال دوسرے، تحفے خدمت کہا جاتا ہے۔ ہر تخلیق کار کی جملہ خواہشات میں ایک خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا دیوان یا مجموعہ دیدہ زیب شائع ہو۔ مرزا غالب نے اپنے خط میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے اور اقبال کا کلام اپنے زمانے کی عمدہ ترین مطبوعات میں شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ جو دلی خواہش ان عظیم شعراء کی ان کے دلوں میں رہ گئی اس کی کسی حد تک واجب تلافی کرنے کی سعادت ان چند کتب کی صورت مجھے حاصل ہوتی ہے۔ یقیناً اس پر آشوب اور کم فرصت کے زمانے میں کسی اردو زبان کے اہل قلم کی کتاب کا مطالعہ مصنف یا مؤلف کے لیے بجائے خود کتاب کی قیمت تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

☆   دنیا کے کسی کونے میں اردو زبان و ادب کے نام پر کوئی کانفرنس، سیمینار یا مجلس برپا ہو تو اس کے روح رواں آپ ہوتے ہیں وگرنہ شریک محفل ہونا تو لازمی تصور کیا جاتا ہے اور یہ سب آپ ذاتی خرچ کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ یہاں پھر سوال آپ کی مصروفیت اور سرمائے کی دستیابی کا بنتا ہے؟

☆☆   امریکہ اور کینیڈا میں تین عالمی اردو کانفرنسز ہوئیں جن کا تعلق نیویارک اردو فورم سے تھا۔ ان کانفرنسز کی مرکزی کمیٹی کا صدر مجھے بنایا گیا۔ اس اہم ذمہ داری کی وجہ سے میری خط و کتابت اور بات چیت مختلف شرکائے کانفرنس سے رہی تاکہ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں ان کی شرکت اور مختلف موضوعات پر ان کی عالمانہ گفتگو اور اس پر سیر حاصل مباحثہ یقینی بنایا جائے۔ چنانچہ ان عالمی کانفرنسز میں میری ذات اس سبب نمایاں رہی۔ شمالی امریکہ کی کانفرنسز کے علاوہ بھارت، پاکستان، برطانیہ اور مڈل ایسٹ کی بعض عالمی اردو کانفرنسز میں شرکت کرنے کا موقع اس لیے دستیاب رہا کہ میرا تعلق اردو کی نئی بستیوں سے ہے اور اردو کی ان نئی بستیوں کی حیات کا دارومدار اردو کے گہوارے سے ضروری ہے۔ اس رابطے کی کڑی کو برقرار رکھنے کے لیے ان کانفرنسز میں میری شرکت مفید ثابت ہوئی۔ شمالی امریکہ کی کانفرنسز کے مضامین اور بحث و مباحثے کے مطالب نے بھی میری شرکت کو دیگر عالمی کانفرنسز میں یقینی بنایا۔ میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ہر کانفرنس میں اپنا مقالہ، اپنا نظریہ اور اپنا سواد پیش کروں۔ اس کام کے لیے ہو ہو کہ بھی ضروری جانتے ہوئے میں ان افراد کی صف میں شامل ہو گیا جن کا کانفرنسز میں شرکت کا مقصد تفریح یا سیاحت نہیں بلکہ علمی، ادبی اور تحقیقی ہو۔ گزشتہ تیس سال سے مغربی دنیا میں رہتے ہوئے سیر و سیاحت کی آرزو نہیں رہی۔ یہ سچ ہے کہ میں کسی ادارے یا اکادمی سے سفر و حضر

کے مطالبات نہیں کرتا اگر کوئی اپنی مرضی اور منشا سے یہ سہولیات مہیا کرتا ہے تو شکریے کے ساتھ قبول کر لیتا ہوں ورنہ یہ ایسا بھاری پتھر نہیں جس کو میں اٹھا بھی نہ سکوں۔ بقول شاعر:

کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں
مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

☆ ڈاکٹر صاحب! آپ کی تمام عمر علمی، ادبی، تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی اور تعلیمی مصروفیات میں شہرت کی طلب کو کس قدر دخل ہے؟

☆☆ یہ درست ہے کہ شہرت و ستائش انسان کو پر کے بغیر ہی مائل بہ پرواز کر دیا کرتی ہے مگر میرا منشا اور مقصود شہرت ہی ہوتا تو مغرب میں رہ کر ایک پڑھے لکھے اور باشعور انسان کے لیے اس کو حاصل کرنے کے ذرائع اور بھی ہیں۔ میں جہاں ہوں جس حال میں ہوں بلکہ جس کمال میں ہوں بہت خوش ہوں۔

☆ ایک زمانے میں آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کے ذخیرہ کتب میں ڈیڑھ ہزار سے زائد مخطوطات محفوظ ہیں۔ آج ان کی تعداد کتنی اور ان کی اہمیت کیا ہے؟

☆☆ جہاں تک قلمی ذخائر اور مخطوطات کا تعلق ہے میرے کتب خانے میں چودہ سو کے لگ بھگ مخطوطات ہیں جن میں زیادہ تعداد قلمی مرثیوں، رثائی بیاضوں اور قدیم مسودوں کی ہے۔ ان مخطوطات کو میں نے تیس سال کے عرصے میں جمع کیا ہے۔ کتب خانے کی نادر کتابیں اور مخطوطات تمام برصغیر سے جمع کیں گئی ہیں۔ رثائی ادب کی کتابیں اور کچھ قلمی مرثیے اور قلمی بیاضیں راقم کو "جعفر منزل" سے حاصل ہوئی ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ بہت سی کتب کاڈا نہیں پہنچ سکیں اور یہ بھی پتہ چل نہ سکا کہ وہ کہاں رہ گئیں۔

☆ کاڈا میں اردو کی سرگرمیاں اور اردو زبان و ادب سے کاڈا کے لوگوں کی دلچسپی کی بابت کچھ آگاہی دیجیے؟

☆☆ اردو کی نئی بستیوں میں اردو کا فروغ جاری ہے۔ اردو اب صرف اردو محلّی تک محدود نہیں بلکہ اردو محلّوں میں رونق بازار ہے۔ اب اردو کا پرچم اردو محلّی پر نہیں بلکہ اردو محلّوں پر لہرا رہا ہے۔ دبستان دہلی، لکھنؤ، آگرہ، حیدرآباد، ڈھاکہ، کراچی وغیرہ میں اردو کی نشوونما کے لیے جدید لسانی تجربات کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے۔ کسی دبستان کو دوسرے دبستان پر قطعاً فوقیت حاصل نہیں۔ اب اردو عالمی شہرت کی حامل زبان ہے۔ اب داغ کا شعر زمان و مکاں کی حدوں سے باہر نکل چکا ہے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

☆ سنا ہے! آپ نے اپنی ذاتی لائبریری کاڈا کے کسی ادارے کے نام وقف کی ہوئی ہے جس کا مطلب ہے کہ آپ کے بعد اردو کا آپ کے خاندان میں کوئی مستقبل نہیں۔ کیا آپ کو اس خیال سے خوف نہیں آتا؟

☆☆ چونکہ میرا تعلق تحقیق اور تنقید کے ساتھ بہت گہرا ہے اور میں نے ذاتی تجربات سے بھی محسوس کیا ہے کہ میرے پاس محفوظ ذخائر مستقبل میں تحقیق و تنقید کے لیے بے حد کارآمد اور مفید رہیں گے لہٰذا میری حیات تک ان ذخائر سے میں استفادہ کرتا رہوں گا میرے بعد فوری طور پر یہ علمی اور ادبی ذخائر یونیورسٹی کے ذخائر علمی میں ضم ہو جائیں گے میں نے اپنی اولاد اور قریبی رشتہ داروں کو بے دخل کرنا اس لیے مناسب جانا کہ عام پرستاروں کی اس تک رسائی آسانی سے ہو سکے۔ میرے مشاہدے میں یہ تلخ حقیقت بارہا آئی ہے کہ خاندان کا کوئی فرد اس طرح کتاب و کتب خانے پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور دوسروں کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتا جس کے نتیجے میں دیمک علمی ذخیروں کا مقدر بن جاتی ہے۔

☆ اردو زبان کے رسم الخط کے حوالے سے جاری بحث کی بابت آپ کا نقطہ نظر اور تجاویز نہایت اہمیت کی حامل ہوں گی؟

☆☆ اردو ایک زندہ اور توانا زبان ہے چونکہ زندہ ہے اس لیے ہر روز اس کے مسائل نئے ہیں۔ اردو زبان کے اس قدر کم عمری میں اتنی بڑی زبان بن جانے کا راز اس کا دوسری زبانوں سے لین دین ہے۔ آج بولنے والوں کی شمار بندی کے لحاظ سے یہ دنیا کی چوتھی یا پانچویں بڑی زبان ہے۔ اقوام متحدہ کے لحاظ سے بیسویں نمبر پر اس لیے ہے کہ ہم نے اپنی مادری زبان سندھی، پنجابی، گجراتی، بنگالی، بلوچی یا ملیالم لکھوایا ہوا ہے۔ بہرحال اردو پھیل رہی ہے۔ اب یہ زیادہ تر کانوں کی زبان بن چکی ہے بعض مقامات پر یہ آنکھوں کی زبان نہیں رہی ایسے نازک موقع پر اس کے رسم الخط اور اس کی تہذیب کی حفاظت ہم سب کی ذمہ داری بنتی ہے۔ جہاں تک سوال اردو کے ادباء، شعراء اور ناقدین کے اختلاف رائے کا ہے اس میں کچھ اثر تو ماحول کا اور کچھ بڑی شخصیات اثر انداز ہو رہی ہیں۔ بقول شاعر:

اردو کی سرنوشت میں ہے اس لیے نفاق
اردو کے چار حرف ہیں چاروں جدا جدا

☆ ڈاکٹر صاحب! اپنی دانست میں ہم نے آپ کی شخصیت اور فن کو گفتگو کا موضوع بنانے کی دیانتدارانہ کوشش کی۔ آپ کے خیال میں کوئی پہلو تشنہ رہ گیا ہو یا آپ ہمارے قارئین سے کسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہوں تو بصد شوق کیجیے۔

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

اپنا دُکھڑا سنا کے دیکھ لیا
جگ کو خود پر ہنسا کے دیکھ لیا
وہی ہمارے اجاڑ تھی محفل
اس نے سب کو بلا کے دیکھ لیا

نیزے پہ اسی سر کو اٹھاتے ہیں تقی جو
شیطان کی چوکھٹ پہ جھکایا نہیں جاتا

دل میں تو بسا ہو ترا اک سمت روا ہے سجدہ
سر جھکے میرا جدھر کعبہ ادھر ہو جائے گا

ان اشعار میں جو چیز مشترک ہے وہ جذبے کی صداقت اور بیان کی سادگی ہے۔ ہر چند کہ بعض اشعار نہایت فکر انگیز ہیں لیکن شاعری کا دلفگاری کی معرفت بات ایسی سادگی سے کہہ دی گئی ہے کہ یک بیک میر تقی میر یاد آ جاتے ہیں۔ میر کا کہنا ہے کہ

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

کچھ یہی صورت تقی عابدی کے شاعرانہ لب و لہجے کی ہے۔ نہ کہیں مشکل تراکیب و الفاظ کا استعمال، نہ استعارات و کنایات کا غیر ضروری ابہام۔ سچے جذبے کے دباؤ اور بہاؤ کے تحت ہر خیال و احساس اپنا لفظی پیکر اپنے ساتھ لایا ہے اور شعر کی صورت میں ایسا دل کشا و دل نشیں بن گیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس کی داد دینے پر مجبور پاتا ہے۔ بے شک یہ خوش ذوقی اور سخن فہمی کی توفیق بطور عطیہ الٰہی میسر ہوتی ہو۔

میری دعا ہے کہ تقی عابدی کا "گلشنِ رویا" سدا شاداب و آباد رہے اور اس کی تعبیرات رویائے صادقہ و رویائے صالحہ کی شکل و نظیر بن جائیں۔

بقیہ۔ متاعِ آگہی

☆ علامہ اقبال ایوارڈ (بہترین کارکردگی) گورنمنٹ آف انٹاریو، کینیڈا۔ جون
☆ ایوارڈ (ڈاکٹر آف دی ایئر) ایسٹرن نیوز ٹورنٹو، کینیڈا۔
☆ ایوارڈ (بہترین خدمات) ادارہ فیضِ ادب، واشنگٹن، امریکہ۔
☆ ایوارڈ (بہترین خدمات) شیعہ پوسٹ گریجویٹ کالج، لکھنؤ، بھارت۔
☆ ایوارڈ (فخرِ اردو انٹرنیشنل) کیلی فورنیا، امریکہ۔
☆ ایوارڈ (بہترین خدمات) منسٹری آف اردو بورڈ، پاکستان۔
☆ ایوارڈ (بہترین خدمات برائے ادب) ٹیگور یونیورسٹی، نیوارک۔
☆ ایوارڈ (بہترین ادب و تحقیق) انٹرنیشنل لٹریری کونسل، پاکستان۔
☆ ایوارڈ (بہترین نقاد) بیک سلو۔
☆ مجلہ اردو ایوارڈ (حسن آرا ٹرسٹ)، دہلی انڈیا
☆ میر انیس ایوارڈ (صدائے دل)، دہلی انڈیا

☆

بقیہ۔ بستی بستی پربت پربت

"جو آپ فرمائیں۔" تقی عابدی کو کامیابی نظر آنے لگی۔
بزرگ سوچتے رہے پھر بولے۔ "تیرہ ہزار روپے"
تقی عابدی کے لیے یہ قیمت تیرہ کوڑیوں کے مول تھی۔
"جی ----- میں پیش کرتا ہوں۔" جیب سے روپے نکال کر بزرگ کو دیئے۔ انہوں نے پلے کپڑے سے کتاب تقی عابدی کے حوالے کیا۔
چہرے سے لگتا تھا اپنے جگر کا گوشہ حوالے کر رہے ہیں۔
"یقین کریں اس کی بہت دیکھ بھال کروں گا۔"
بزرگ آزردہ تھے۔
"ایک گلاس پانی مل جائے گا" عابدی بولے۔
بزرگ مردہ قدموں سے اٹھ کر گئے۔ مٹی کے کوزے میں پانی لے آئے اور وہ پلاتے ہوئے کہا۔
"میں نے تیرہ ہزار مانگے تھے آپ نے غلطی سے 26 ہزار دے دیئے بیٹا لو تیرہ واپس ہیں۔"
"قبلہ میں نے 26 ہزار ہی دیئے ہیں۔ کاش میں 26 لاکھ دے سکتا۔ آپ نے انمول خزانہ دیا ہے اس کا کوئی مول نہیں۔ براہ کرم یہ حقیر نذرانہ قبول کر لیجئے۔" تقی عابدی نے نرم لہجے میں کہا۔
سفید بالوں والے بزرگ سامنے کھڑے تھے اور تقی عابدی نے دیکھا ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا ان کناروں سے چھلکا چاہتے تھے۔ پھر وہ منہ پھیر کر اندر چلے گئے۔
تقی عابدی گاؤں سے واپس آ رہے تھے تو گرمی تھی نہ پیاس نہ تھکن۔ موسم جانے کب خوشگوار ہو گیا تھا۔ کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ پات ہرے تھے۔ پھول کھلے تھے۔ رم جھم پھوار سی تھی۔ اور تقی عابدی تیز تیز قدموں سے فیض آباد کی طرف آ رہے تھے جیسے اودھ فتح کر کے آ رہے ہوں۔

☆

''موت پر مجھ کو اختیار نہیں''

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)

تقی عابدی اپنے مستقر اعتبار سے بظاہر بہت دور شمالی امریکہ اور کینیڈا میں بستے ہیں۔ بظاہر ہم میں نے یوں کہا کہ یہاں وطن ہو کر آج بھی اپنے آبائی وطن عزیز سے بہت قریب ہیں اور ان کا دل جنوبی ہند کے سیاسی و سماجی نشیب و فراز کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ دل کی یہ دھڑکن ایشیائی مسلم ممالک کے نشیب و فراز تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہ انسانی سطح پر دنیائے اسلام کے سارے خطوں کے تغیرات سے منسلک ہو جاتی ہے۔ ایسا ہونا نہ تو بے سبب ہے اور نہ اتفاقی و لاشعوری ہے بلکہ تقی عابدی کے افتادِ طبع کے عین مطابق ہے، سوچا سمجھا ہے اور شعوری ہے، اس لئے کہ وہ اس محدود جمہوریت یا نظامِ حکومت کے قائل نہیں ہیں جو وطنیت کی تنگ نظری اور علاقائی قومیتوں کی حد بندی سے جنم لے کر انسانی معاشرے کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے بلکہ وہ ایسے جمہوری نظام کے قائل ہیں جو انسانی قدروں اور انسان کے بنیادی حقوق کے مستقل تحفظ کی اساس پر استوار کیا گیا ہو۔ چنانچہ تقی عابدی کی شاعری میں محدود وطنیت کی نہیں بلکہ عالمی وطنیت و اخوت کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ وہ اقبال کے باشعور پرستاروں میں ہیں اور انہیں کی طرح اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

نتیجتاً ان کی شاعری جسے شاعر کی زندگی کی ترجمان کہا جانا چاہیے مخاطب کے حوالے سے مقامی نہیں رہتی بلکہ عالمگیر بن جاتی ہے اور پاک و ہند سے آگے بڑھ کر کشمیر، افغانستان، بوسنیا اور فلسطین کے دور دراز علاقوں کے باسیوں کو بھی اپنا مخاطب بنا لیتی ہے۔

اردو اور فارسی ادب کے باب میں تقی عابدی کا مطالعہ قابلِ رشک حد تک وسیع ہے۔ وہ اردو فارسی دونوں زبانوں کے مزاج شناس، ان کے تاریخی و ثقافتی پس منظر سے واقف اور ان کے نمائندہ شعراء کے محاسن و کمالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ سخن گوئی کے ساتھ ساتھ وہ سخن شناسی کا بھی سچا ذوق رکھتے ہیں۔ عروض و علمِ بیان کے رموز و نکات سے بھی بے بہرہ نہیں ہیں۔ وہ المعجم فی معیار الاشعار و العجم سے لے کر پروفیسر ناتل خانلری کی انتقادِ عروض و زبانِ فارسی تک کی شناوری کر چکے ہیں اور قدیم ادب کی راہوں اور منزلوں سے بھی اتنا ہی واقف ہیں جتنا کہ جدید سے۔ انہیں غالب اور علامہ اقبال سے خاص لگاؤ ہے اور علامہ اقبال کے فلسفۂ پیام و عمل اور فکر و فن کے حوالے سے وہ علی شریعتی کی طرح اقبال کے پرستار و شیدائی ہیں چنانچہ تقی عابدی کی شاعری خصوصاً ان کی نظموں میں جذبات کی جو بلند آہنگی نظر آتی ہے وہ علامہ اقبال اور ان کی شاعری کے اثرات کا ثمر ہے۔

تقی عابدی کا تازہ مجموعۂ کلام "گلشنِ رویا" طرح طرح کے پھولوں اور پھلوں سے سجا ہوا ہے۔ اس میں غزلوں اور نظموں کے ساتھ حمد و نعت، منقبت و قطعات بھی کچھ شامل ہیں اور سب میں فکر و فن کے قابلِ توجہ رعنائیاں موجود ہیں۔ نظموں میں ملی زاویۂ نظر سے "کشمیر، عراق، مسجد اقصیٰ، بوسنیا، جستجو، نہج البلاغہ، عید الفطر اور خاص فکری نہج سے بچوں کی ہنسی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

آخر الذکر نظم "بچوں کی ہنسی" تو ایک فکر انگیز اور خوبصورت نظم ہے جسے اپنے موضوع کی ندرت اور فنی ترویج کی بنا پر جدید اردو نظموں کے ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ خیال کرنا چاہیے۔ اس نظم کو تقی عابدی جس انداز خاص سے پڑھتے ہیں وہ الگ ایک سماں باندھ دیتا ہے اور مجمع کو دیر تک اپنے سحر میں لئے رہتا ہے۔

تقی عابدی کی غزلیں بالعموم چھوٹی بحروں میں ہیں اور جذبات کے آبشار کا عجب رنگ و آہنگ رکھتی ہیں۔ اس جگہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے البتہ چند منتخب اشعار دیکھتے چلئے ان سے اندازہ ہو جائے گا کہ فکر و فن اور جذبات و محسوسات کی سطح پر تقی عابدی کی غزل کا کیا روپ ہوتا ہے

وہ آنسوؤں میں مجھ کو بہا کر چلے گئے
سیلاب میری آنکھ کا لیکن رکا نہیں

موت پر مجھ کو اختیار نہیں
اس لئے اس کا انتظار نہیں

مثلِ خوشبو کسی پہ بار نہیں
میں کسی دوش پر سوار نہیں

درد میرا ہے کچھ، دوا ہے کچھ
میں نے مانگا تھا کچھ دیا ہے کچھ

اٹھایا جس کو خدا نے کوئی گرا نہ سکا
گرایا جس کو خدا نے کوئی اٹھا نہ سکا

ہر شعر اس غزل کا ہے تیرے لئے مگر
کس کو غزل سناؤں ترے روٹھنے کے بعد

رثائی ادب کا مسیحا

ڈاکٹر عظیم امروہوی
(امروہہ، بھارت)

سماعت کی سرحدوں میں ایک آواز داخل ہوئی ''ڈاکٹر تقی عابدی''۔ یا کبھی بصارت کے دائرے میں نقوش بکھر یا الفاظ چمکے یعنی ''ڈاکٹر تقی عابدی'' تو فوراً ذہن کے افق پر رثائیت کی قندیل جل جاتی ہے۔ اور کبھی میر انیس تو کبھی مرزا دبیر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان کی ذات والا صفات سے یوں تو دیگر ادبی تصورات بھی وابستہ ہیں۔ انھیں انشاء، غالب اور اقبال سے بھی دلچسپی ہے اور ان کی فکر جو شاعری کی تہوں میں غوطہ زنی کر کے ایسے موتی نکالنے کی کوشش کی ہے جو ابھی تک ادبی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل تھے یا سامنے آئے بھی تھے تو پوری طرح پہچانے نہیں گئے تھے۔

لیکن ڈاکٹر تقی عابدی نے جتنے کم وقت میں شعرائے مرثیت یعنی میر انیس، مرزا دبیر اور فرید لکھنوی پر مختلف اور انوکھی جہات سے جتنا نیا اور کام کیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین اور ناقابل فراموش ہے اور ان کا یہ کام قابل رشک حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی ایک کتاب کی رسم اجرا کی تقریبات مختلف ممالک میں اختتام پذیر ہونے سے قبل ہی دوسری کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہوتی ہے۔

تجزیہ یادگار مرثیہ انیس، میں میر انیس کے صرف ایک مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے''

کو تحقیق و تنقید کے ساتھ اپنے منفرد انداز میں ترتیب دیا کہ جسے ہم ادب کی تاریخ میں بالکل منفرد مقام دے سکتے ہیں۔ اس میں ترتیب کے سلیقے کے ساتھ ہی جو عرق ریزی کی گئی ہے وہ ایسا بھاری پتھر تھا کہ جسے چومنے کی دوسرا کوئی آسانی سے ہمت بھی نہ کرتا۔ اور اگر چومتا بھی تو صرف چوم کو چھوڑ دیتا۔ لیکن انھوں نے مرثیے کے آخری بند تک اس کام کو اسی انہماک سے انجام دیا جس سے شروع کیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک مرثیے پر اپنے زاویوں سے کام کر کے انھوں نے دنیائے ادب کے سامنے ایک غیر معمولی نمونہ پیش کر دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس سلسلے میں بالکل صحیح فرمایا ہے کہ یہ ایک کتاب نہیں بلکہ لفظی و معنوی فصاحت و رموز بلاغت کا ایک سرچشمہ ہے جس میں لفظی و معنوی کا ایک خزینہ ہے۔ اردو مرثیہ نگاری کی تفہیم و تحسین کی ایک نئی مثال پیدا کیا ہے اور انیس شناسی و انیس فہمی کے باب میں ایک نادر کاری ہے۔

کربلائی ادب کے ایک فراموش کردہ شاعر فرید لکھنوی سے اہل علم بھی پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فرید لکھنوی کا وہ خزانہ تلاش کر لیا اور ان کے مراثی، سلام، رباعی، قطعات و دیگر کلام تلاش و تحقیق کے بعد ''اظہار حق'' کے نام سے اپنے تبصرے کے ساتھ دنیائے ادب کے حوالے کر دیا۔ آج یہ ایک ضخیم کتاب ہندو پاک میں پذیرائی حاصل کر چکی ہے اور علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہے۔

ادب کی تاریخ میں آج کا دن یقیناً ایک ایسا یادگار اور اہم ترین دن ہے کہ جس میں رثائی ادب کے امام مرزا دبیر پر چھ تصانیف مختلف عنوانات سے منظر عام پر آ رہی ہیں۔ کسی بھی ایک فنکار پر کسی بھی ایک ادیب کی اتنی اہم کاوش و کوشش، تحقیق و تلاش، تشریح و تفسیر اور تنقید و تبصرہ اتنے کم وقت میں منظر عام پر آنے سے بھی ایک نئی مثال قائم ہو رہی ہے۔ اور یہ حیرت انگیز کام نہیں بلکہ کارنامے ہیں اور وہ بھی ایک ایسی شخصیت کے جس نے اردو دنیا سے ہزاروں میل کی دوری پر بیٹھ کر یہ سب کچھ کیا ہے جہاں کا ماحول الگ، معاشرہ مختلف، تہذیب جدا، تمدن علیحدہ بلکہ دنیا ہی دوسری یقیناً ان کا صرف جسم وہاں رہتا ہوگا اور وہ ذہنی طور پر اسی اردو دنیا یعنی دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، لاہور اور کراچی کی فضاؤں میں اپنے آپ کو رکھتے ہوں گے۔ کیونکہ یہ تو ویسے بھی مشکل ترین کام تھا۔

بہر حال مرزا دبیر پر مندرجہ ذیل کتب کی آج ۲۱ مارچ ۲۰۰۵ء کو رسم اجرا صدیعت ولی ٹرسٹ کی جانب سے انجام دی جا رہی ہے۔

۱۔ مصحف فارسی (مجموعہ کلام) تحقیق، تدوین، ترتیب
۲۔ مثنویات دبیر
۳۔ مجتہد نظم مرزا دبیر
۴۔ طالع مہر، مرزا دبیر کا غیر منقوط کلام
۵۔ سلک سلام دبیر
۶۔ ابواب المصائب، تصنیف مرزا دبیر مع مقدمہ سوانح عمر و تشریح

اور اس کے بعد رباعیات دبیر اور کلیات نجم زیر تالیف ہیں اور امید ہے وہ بھی جلد ہی منظر عام پر آ جائیں گی۔ ہم بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہیں کہ پروردگار عالم ڈاکٹر تقی عابدی کو نظر بد سے محفوظ رکھے اور رثائی ادب کے لیے ان کا یہ کار مسیحائی اسی طرح معیاری انداز میں جاری رہے کیونکہ اس کی اشد ضرورت ہے۔ یوں تو ہر دور میں ہر قسم کا ادب جتنا تخلیق ہوا ہے سب محفوظ نہیں رہ سکا کچھ ضائع اور تلف بھی ہوتا رہا لیکن جہاں تک رثائی ادب کا سوال ہے یہ سب سے زیادہ ضائع ہوا ہے۔ اور اسے محفوظ نہیں رکھا جا سکا۔ آج بھی شمالی

ہندوستان میں بستی بستی پر انے دیوان خانوں، عاشور خانوں، حویلیوں کے تہ
خانوں، عزاخانوں، امام باڑوں، سوزخوانوں اور تحت اللفظ خوانوں کے بستوں میں
ایک کثیر سرمایہ غفلت کے گرد و غبار کے نیچے دبا ہوا ہے جسے محفوظ کرنا ہماری ذمہ
داری اور فرض ہے۔ اور پھر اس لیے بھی اسے محفوظ رکھنا ضروری ہے کہ اس کی
افادیت ہمارے آج کے معاشرے کے لیے خاص طور سے بہت زیادہ ہے
کیونکہ یہ سارے کا سارا ادب اعلیٰ اخلاقیات اور تہذیب کا نمونہ ہے جس کی آج
کے سماج کو خاص طور سے ضرورت ہے۔ معاشرے میں اخلاقی اقدار کی گرتی
ہوئی دیواروں کو سنبھالنے میں یہی مستحسن ادب اور ثقافتی ادب ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے
مذکورہ بالا تمام تصانیف میں اس وقت صرف "ابواب المصائب"
زیرِ نظر اور زیرِ غور ہے۔ جو مرزا دبیر کی نظم سے زیادہ نثر کا نمونہ ہے اس کو نہ صرف
ڈاکٹر تقی عابدی نے مرتب کیا ہے بلکہ مرزا دبیر کا زندگی نامہ کے عنوان سے ان
کی حیات کا خاصا تفصیلی خاکہ بھی پیش کیا ہے اور ایک نہایت جامع مقدمہ بھی
تحریر فرمایا ہے۔ ساتھ ہی مشکل الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے تاکہ آج کا عام
طالب علم بھی فیض یاب ہو سکے۔

کتاب کے انتساب کے لیے جس ذات کا انتخاب کیا گیا ہے اس
سلسلے میں بھی ڈاکٹر تقی عابدی کو داد دینی پڑے گی، یعنی یہ انتساب "عاشقِ دبیر
امیر کبیر راجہ پیوہ رام افتخار الدولہ کے نام" ہے۔ انتساب کے اگلے دو جملے بھی
ملاحظہ ہوں جن میں راجہ پیوہ رام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "جو عشقِ محمد و آل
محمد میں ڈوب کر ابھرے تو کشتی اسلام میں نجات ملی، جنھوں نے اپنی دولت سے
عالی شان امام باڑہ بنوا کر عزاداری کو رونق بخشی جہاں رمضان کی شہادت کی شبوں
میں دبیر مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ جو آخر عمر کربلائے معلیٰ جا کر مجاور روضۂ حسینؑ ہو
گئے اور زندگی مجاورت ضریح اقدس میں گذار کر خاکِ شفا میں پیوند ہو گئے اور
ہمیشہ کے لیے ہمدمِ عالیشان پاک جنت بن گئے"

یہاں انتساب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے جو تحقیق کے بعد معلومات
فراہم کی ہے وہ بھی اہم ہے اور اسے انھوں نے جس اسلوب میں پیش کیا ہے وہ
بھی دلکش ہے۔

کتاب میں مرزا دبیر کا زندگی نامہ صفحہ ۱۳ سے صفحہ ۳۳ تک یعنی ۲۱
صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں نام، تخلص، تاریخ ولادت، مقامِ ولادت، والد،
دادا، جد، شریک حیات، اولاد، بھائی بہن، تعلیم و تربیت، اساتذہ، مذہب، شغل،
شکل و صورت، تصویر، آواز، لباس، غذا، نظام الاوقات، آدابِ محفل، حافظہ، خط
، اخلاق و کردار، رحم و مروت، سخاوت، مہمان نوازی، نیک و خیرات، قناعت،
عدالت، متانت، خودداری، احترام و دل جوئی، وعدہ وفائی، شاعری کا آغاز،
مشقِ سخن، پہلا قطعہ، آخری قطعہ، پہلا مرثیہ، آخری مرثیہ، اساتذہ، ضمیر و دبیر
میں رنجش، ضمیر و دبیر میں صفائی، شاگردان، پڑھنے کا طریقہ، طریقۂ تصنیف،
اصلاح کا طریقہ اور ایجادات وغیرہ وغیرہ کے علاوہ کئی اہم دلچسپ اور معلوماتی
حکایات بھی پوری تحقیق کے بعد بیان فرمائی ہیں۔ جس سے قاری کی دلچسپی میں
اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شعرا کے تذکرے سے ثابت لکھنوی کی "حیاتِ دبیر"
اور شاد عظیم آبادی کی "تعبیرِ سخن" آج چونکہ کمیاب ہو چکی ہیں اس لیے ضروری
تھا کہ مرزا دبیر کی ایک جامع اور مختصر سوانح تحقیق کے بعد منظرِ عام پر آئے۔ یہ
ذمہ داری بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے بڑے سلیقے سے پوری کی ہے اور صرف ۲۱
صفحات پر تجسیم پیش کر دی ہے۔

یہ مرزا دبیر کا زندگی نامہ صرف زندگی نامہ ہی نہیں بلکہ مختصر سیرت
نامہ بھی ہے۔ کیونکہ اس میں پیش کی گئی حکایات سے کردار کے مختلف پہلو بھی
سامنے آتے ہیں۔

البتہ صفحہ ۱۸ پر نواب حامد علی خاں صاحب دبیر شناس کو لکھنوی لکھا
ہے جب کہ نواب حامد علی خاں امروہوی تھے لکھنو میں ہجرت ضرور کی ہے
لیکن آبائی وطن، اور ولادت وغیرہ امروہہ کی تھی۔ جیسا کہ "حیاتِ حامد" میں دیا
ہوا ہے۔ ان حضرت حامد علی خاں کا ذکر میر نفیس نے بھی کیا ہے اور جوش ملیح آبادی
نے بھی "یادوں کی برات" میں امروہہ کا ساکن لکھا ہے۔

"ابواب المصائب" میں ڈاکٹر تقی عابدی نے اردو مرثیے میں مرزا
دبیر کی ۲۱ ایجادات یعنی اضافوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی اس رائے سے اختلاف
کی گنجائش نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ جن موضوعات کا مرثیے میں مرزا دبیر کو
موجد قرار دیا ہے ان میں سے چند موضوعات کے ابتدائی عناصر اور نقوش کی
جھلک قبل دبیر بھی مل جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مرزا دبیر نے ان
موضوعات کو مرثیے میں باقاعدہ اور باضابطہ طور پر شامل کیا اور وسعت دی۔ ان
۲۱ ایجادات کے علاوہ مرزا دبیر کی ایک ایجاد اور بھی ہے یعنی وہ پہلے مرثیہ نگار ہیں
جنھوں نے اپنے ایک مرثیے کو عنوان بھی دیا۔ ورنہ عنوانات سے مرثیہ کہنے
کا باقاعدہ سلسلہ مرزا دبیر کی وفات کے بھی تقریباً ۵۰ سال بعد شروع ہوا ہے
مثلاً نسیم امروہوی کا "سازِ حرمت" یا جوش ملیح آبادی کا "حسین اور انقلاب"
وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس زندگی نامے میں مرزا دبیر کی صرف زندگی
ہی بیان کی ہے اس میں اختتامِ زندگی کا ذکر نہیں ہے اور موت کے بارے میں
کچھ تحریر نہیں فرمایا۔ ایک صفحے پر مرزا دبیر کی اردو اور فارسی تصانیف نظم و نثر بھی
شامل ہیں۔ جہاں تک کتاب پر مقدمے کا سوال ہے یہ بھی ایک خاص انداز میں
تحریر کیا گیا ہے اور پہلے ان کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن میں "ابواب
المصائب" کا ذکر ہونا چاہیے تھا لیکن مصنفین کی غفلت یا عدم توجہی کے سبب قطعاً
ذکر نہیں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مرزا دبیر کی پہلی سوانح جو فارسی میں ہے یعنی "ثمر

"انجمن" کتاب کا ذکر ہے ان کا ذکر بھی تمام مقدمہ میں حوالے کے ساتھ کر دیا ہے۔ جیسے "حیات دبیر" افضل حسین ثابت، "شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر اور باقیات دبیر" ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری، "مرزا سلامت علی دبیر" ڈاکٹر محمد زماں آزردہ اور "پیام عمل" کے مرزا دبیر نمبر میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا مضمون "اردو ادب کی توسیع میں دبیر کا حصہ" وغیرہ وغیرہ میں جو "ابواب المصائب" کا ذکر ہے اسے بھی شامل کر لیا ہے۔

"ابواب المصائب" کا موضوع مجالس عزا ہیں جن میں سورۂ یوسف سے واقعات کربلا کو مربوط کر کے بیان کیا گیا ہے۔ اس خالص رثائی موضوع پر اسی انداز سے اس سے قبل کی فارسی میں ملا واعظ حسین کاشفی کی "روضۃ الشہدا" اور اس کے بعد "کربل کتھا" اور دونوں تصانیف سے موضوع کے اعتبار سے تقابل اور موازنہ بھی کیا ہے اور تینوں تصانیف کا جائزہ لے کر نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس میں زبان و بیان، مسجع و مقفیٰ عبارت، صنعتوں کے استعمال، جمع الجمع کا استعمال، صرف و نحو کے اصولوں کی پابندی یا عدم پابندی اور مصنفین کے جذبۂ تفاخر و مباہات اور عجز و انکسار کے بیان کا بھی تقابل کیا ہے۔

دوسری طرف اسلوب کے اعتبار سے "ابواب المصائب" کی نثر کا "فسانۂ عجائب" کی نثر سے بھی موازنہ کیا ہے اور مرزا دبیر کی نثر نگاری کی خصوصیات، خوبیاں، سادگی اور صفائی کا بیان کر کے نثر نگاری میں ان کی اہمیت اور مقام کو ظاہر کیا ہے۔ ساتھ ہی قدیم اردو نثر نگاری کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ یہ اسلوبیاتی تجزیہ ڈاکٹر تقی عابدی کی ژرف نظری کا ثبوت ہے۔ انھوں نے ابواب المصائب کو اردو کے نثری ارتقا کا ایک سنگ میل ثابت کیا ہے اور گراں بہا تصنیف بتایا ہے اور اسے صرف اس لیے نظر انداز کیا کہ اس نثر پارے کا موضوع رثائی ہے یہ ادب میں بے ادبی ہے۔

مقدمے کے علاوہ ایک باب "واقعاتی مناظرہ" عنوان سے بھی ہے اس میں بھی دیدہ وری اور دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "ابواب المصائب"، "روضۃ الشہدا" اور "کربل کتھا" سے علیحدہ اور تخلیقی تصنیف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے رثائی ادب کی خدمت کا جو بیڑا اٹھایا ہے جو رثائی ادب کے دبے چھپے اور گمشدہ خزینے کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ رثائی ادب کے سلسلے میں جو باقاعدہ تحریک چلائی ہے جو غیر معروف یا گمنام مرثیہ نگار شعرا کو متعارف کرانے کی پیہم کاوش ہے اور جو رثائی ادب منظر عام پر آچکا ہے اس کا نئے اور تحقیقی زاویوں سے تنقیدی جائزہ لینے کی ٹھانی ہے وہ یقیناً نہ صرف رثائی ادب بلکہ اردو زبان و ادب پر بھی ایک احسان عظیم ہے اس لیے آج ڈاکٹر تقی عابدی اور رثائی ادب لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ اور یقیناً وہ عصر حاضر میں رثائی ادب کے ایک مسیحا ہیں۔

حجامت کرانے کے دن

حجامت کرانے کے دن آ رہے ہیں
سروں کو منڈانے کے دن آ رہے ہیں

صبا لے کے خیبر سے آئی خبر ہے
کہ ڈاڑھی بڑھانے کے دن آ رہے ہیں

کرو بند مکتب کہ اب عورتوں کو
گھروں میں بٹھانے کے دن آ رہے ہیں

بشارت یہ دو شوخ رنگ عورتوں کو
کہ کوڑے لگانے کے دن آ رہے ہیں

کہو ساقیوں سے یہ بزمِ طرب کے
کہ ساغر بڑھانے کے دن آ رہے ہیں

گلستاں میں جا کر کہو بلبلوں سے
کہ رونے رلانے کے دن آ رہے ہیں

انہیں دیکھ کر لو جا کر سے دل بھر کے شیداؔ
کہ اب منہ چھپانے کے دن آ رہے ہیں

خالد حمید شیداؔ
(یو ایس اے)

منہ کھولے تیغیں پھرتی تھیں لیکن اِدھر اُدھر
بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر
تھے تیر تشنگی تیغ، مگر آب تھے جگر
دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

غرضیکہ یہ بند کئی خصوصیات کا حامل ہے اس میں متعدد محاوروں کے علاوہ کئی صنعتیں بھی ہیں۔ سب سے اہم صنعت مبالغہ کی ہے جس کو فنِ تنقید نگاری کے بانی ارسطو نے شاعری کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا۔ یہی وہ صنعت ہے کہ جس سے شاعر اور مورخ میں فرق کا تعین ہوتا ہے۔ انیس شاعر تھے مورخ نہیں۔ بند میں تعداد الفاظ ۴۶ اور حروف ۱۳۶ ہیں۔

انیس کو اپنے ممدوح مظلوم کربلا کی قدر و منزلت کا اتنا احساس تھا کہ وہ ان کی شان کے خلاف ذرا بھی کمی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں یہ لکھنا بھی گوارا نہیں تھا کہ میدانِ جنگ میں امام کو دھوپ کی تمازت سے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے دھوپ کی شدت کو شاہی ساز و سامان میں بدل کر آفتاب کو چھتری کے طور پر سایۂ ظلِ قرار دیا ہے۔ بند کی ٹیپ ملاحظہ ہو۔

چلتی ہے لُو، حرارتِ خورشید سے دو چند
مرجھا گئے ہیں گُل ہوائیں ہیں پُر گزند
جھیلوں میں ہیں دمہ، درختوں پہ ہیں پرند
ہے دھوپ میں رسول کا فرزندِ ارجمند
غربت میں بے کسی ہے شہِ دیں پناہ پر
سایہ ہے آفتاب کا زہرا کے ماہ پر

یا ذیل کے بند کی ٹیپ کی نزاکت اور طرز ادا کو دیکھئے کہ امام کی بے سروسامانی کو عالم غربت میں کس شاہانہ تجمل اور شان عظمت کے ساتھ بیان کیا ہے

سر پر لگائے تھا پسرِ سعد چتر زر
خادم کئی تھے مروحہ جنباں ادھر اُدھر
کرتے تھے آب پاش مگر روز میں کوثر
فرزندِ فاطمہ پہ نہ تھا سایۂ شجر
وہ دھوپ دشت کی، وہ جلال آفتاب کا
سنولا گیا تھا رنگ مبارک جناب کا

یہ شعر بھی قابل توجہ ہے

پرتو نگن تھا نور رسالت مآب کا
سر پر لگا تھا چتر زری آفتاب کا

مرثیے میں ایک شعر یوں لکھا گیا ہے

قرآن رحل زین سے سرِ فرش گر پڑا
دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

ڈاکٹر صاحب نے اس شعر میں ایک نیا گوشہ نکالا ہے جو کیا قیامت کے منظر سے بھی زیادہ ہولناک ہے فرماتے ہیں "میر انیس کے کلام کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ واقعہ کو بیان کرتے ہوئے واقعیت کو ختم نہیں ہونے دیتے۔ وہ خیال اور الفاظ کے صحیح جوڑ سے واقف ہیں۔ امام مظلوم آخری وقت گھوڑے سے زمین پر گرے لیکن ذاکرین کے لفظ "گرنے" میں جو کمی ہے اس کو دور کرنے کے لیے اور امام کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ امام زخموں کی تاب نہ لا کر گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے جو صحیح واقعہ نہیں۔ تشریف لانا ایک اختیاری فعل ہے اور "گرنا" ایک بے اختیار عمل۔ میر انیس کو ایک طرف اس لفظ کی کمی کا احساس اور منزلت امام کا قرار تو دوسری طرف صحیح واقعہ نگاری کی ذمہ داری۔ چنانچہ انہوں نے اس ایک لفظ "گرنے" کی کمی کو مٹانے کے لیے امام کو قرآن، عرش اور کعبہ سے تشبیہ دے کر ان سب کو گرا دیا ہے جس سے سامع اور قاری کو امام کے "گرنے" کا احساس نہیں ہوتا۔ اس طرح میر صاحب نے تجزیاتی سے واقعہ نگاری کے آداب سکھائے"

جس نے بھی شرق و غرب میں یہ بھاری بھرکم مجمع حسن کی بے مثال کتاب دیکھی وہ ششدر سا رہ گیا۔ خوشی کے مارے پھولے نہیں سمایا اور ان کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر آیا۔

پوچھیں ذرا وہ نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صحبتِ صالح ہے پاک بینوں کو

غرضیکہ ڈاکٹر صاحب کی زیر نظر کتاب ان کے ادبی کمالات کا مظہر اور بین ثبوت ہے۔ خوشی اس کی ہے کہ ایسی صاف ستھری اور خوبصورت کتاب جو صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے اعلیٰ معیار کی ہے آج تک چشم بشر نے نہیں دیکھی ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب گویا ہرفن مولا ہیں۔ وہ تین درجن سے زائد اعلیٰ پائے کی کتابوں کی مصنف ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ایک ممتاز ناقد بھی اور با کمال شاعر بھی ہیں۔ تقی تخلص کرتے ہیں۔ انہیں علم عروض، علم معانی و بیان اور فارسی زبان میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ فارسی اس روانی کے ساتھ بولتے ہیں کہ گویا ان کی مادری زبان ہے۔ عربی اور دینی معاملات میں بھی کافی حد تک واقفیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی کے پاس رثائی ادب کا ایک نادر موجود مطبوعہ اور قلمی مرثیوں کا ذخیرہ ہے۔ ابھی چند دن ہوئے کہ لکھنؤ کے دو صد سالہ ولادت انیس کی تقریبات میں اعلان فرمایا کہ وہ مکمل کلیات انیس مرتب کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو اس مقصدِ اعلیٰ کے لیے توفیق عطا کرے۔ آمین

☆

تجزیہ یادگار انیس

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

اکبر حیدری کشمیری (حیدرآباد دکن)

کتاب کا نام مقطع کی مناسبت سے رکھا گیا ہے "عالم میں یادگار ہیں گے یہ چند"۔ بند کا آخری مصرعہ:

"ہیرے کے کو لوٹے ہیں غزلوں کی بہار ہے"۔

کینیڈا کے انٹرنیشنل انیس سیمینار کے مشاعرے میں طرحی مصرعہ قرار دیا گیا تھا کتاب کے مرتب ڈاکٹر صاحب سید تقی عابدی فن طب کے ماہر ہیں۔ وہ تہران، لندن، امریکہ کینیڈا وغیرہ ممالک میں اپنے فن کا لوہا منوا چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب patho logist یعنی علم التحلیل کے ماہر ہیں۔ انہوں نے اپنے تجربے اور وسعت نظر سے اس مرثیے کی رگ و ریشہ یعنی ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ، ایک ایک محاورے اور ایک ایک صنعت کا ہر پہلو سے جائزہ لیا۔ ان کے اجزا و اقسام کو بہ تحقیق دیکھا اور پھر ان کی تفصیلی رپورٹ اپنے دماغ کی تجربہ گاہ میں محفوظ کر کے کتابی صورت میں پیش کیا۔ موصوف نے اس معرکۃ آرا کام کی تکمیل کے لیے برسوں جہاد کیا اور آخرکار لٹریری دنیا میں ایک اعلیٰ معیار کی اجتہادی ڈگری حاصل کر کے اپنے مقصد میں سرخرو ہو گئے۔ میں انھیں ادبیات کا ایک اولوالعزم مجتہد سمجھتا ہوں۔ جب تک خدائے سخن میر انیس کا سکہ اردو میں جاری رہے گا اس کتاب کی وجہ سے ان کا نام بھی قدر و منزلت کے ساتھ لیا جائے گا۔ کس خلوص و محبت اور سکون و اطمینان سے لکھتے ہیں:

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ڈاکٹر صاحب کی دریا دلی اور انیس شناسی دیکھئے کہ اس مجموعہ ادب پر محنت شاقہ کے علاوہ کافی زر و رقم خرچ ہو چکی ہے۔ کتاب اس قابل ہے کہ اس کی رسم رونمائی مغربی ممالک کے علاوہ مرتب کی موجودگی میں برصغیر کے بڑے بڑے شہروں میں کی گئی ہے۔

کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں بعض علمائے ادب کی منظوم تقریظیں اور اہم تحریریں موجود ہیں۔ آخری باب میں مرثیے کے منظوم عربی اور انگریزی ترجمے شامل ہیں۔ باب نمبر ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ یہ ہیں۔ محاسن مرثیہ فہرست کامل جدول بہ ترتیب شعر و بند مرثیہ اور تجزیہ یادگار مرثیہ۔ یہ تینوں ابواب انیس شناسی کے لیے دعوت فکر کے متقاضی ہیں۔ ان میں بعض ایسے گوشے پہلی مرتبہ دریافت کئے گئے ہیں جو میری نظر سے نہیں گزرے ہیں۔ میں یہ بات نہایت ذمہ دارانہ الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ ان شاہکاروں کے باعث عابدی صاحب کو ماہرین ادبیات میں تقدم حاصل ہے۔ جو کام علامہ شبلی اور دوسرے لوگوں سے نہ ہو سکا اس کام کو ڈاکٹر صاحب نے ۱۰۰ سال کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اب یہ کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ انیس کا فن شبلی سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

اگر ناقدین ادب ۱۹۷۲ء کے بعد رواداری سے کام لیتے۔ تعصب و رنگ نظری کو چھوڑ کر انیس کے ساتھ انصاف کرتے تو نہ معلوم علم بیان کی منزلیں طے کرتے کرتے یہ زبان محتشم یعنی اردو کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوتی۔ عابدی صاحب نے درست کہا ہے کہ لوگوں نے انیس کو مرثیے کا سرِ دفتر کہہ کر ساری اردو شاعری کو سرِ دفتر کھینچا ہے۔

انیس کے پاس الفاظ و معانی کا بحر زخار تھا۔ اگر ان محاسن کلام کو کوئی دیکھنا چاہتا ہے تو ڈاکٹر صاحب کا زیرِ نظر مرثیہ دیکھ سکتا ہے۔ اس میں محاورات کی تعداد ۵۹۶، علم بیان کے محاسن کی تعداد ۱۸۵، علم بدیع کی صنعتوں کی تعداد ۱۲۸۵ یعنی کل محاسن اور صنعتوں کی مجموعی تعداد ۲۱۲۹ ہے۔ علم معانی و بیان، علوم شرقیہ میں نہایت سنجیدہ اور مشکل فن ہے۔ اس فن کا سورج عرصہ دراز سے یہاں سے غروب ہو چکا ہے۔ اب خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب کے ذوق سلیم کی بدولت مغرب میں طلوع ہونے لگا ہے۔ علمائے ادب نے انیس کو تشبیہات کا بادشاہ قرار دیا ہے۔ خود انیس کو اس فن پر ناز تھا۔

کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

عہد حاضر کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے عدم معلومات کی بنا پر اس فن کے آگے سپر ڈال دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس فن کی تجدید کے لیے اکیلے سینہ سپر ہو گئے ہیں۔ میں ایسے مجدد فن کو سلام کرتا ہوں کہ انہوں نے انیس کے زیرِ نظر مرثیے میں ایسی تشبیہات کی نشاندہی کی ہے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ انہوں نے ان تشبیہات کو اس سلیقے و ہنرمندی کے ساتھ جمع کیا ہے کہ انیس کا شعر بے ساختہ یاد آتا ہے۔

نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیس
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

ذیل میں چند مثالیں مشتے نمونہ از خروارے پیش کی جاتی ہیں۔ یہ تشبیہات اگرچہ پڑھنے میں مشکل نظر آتی ہیں لیکن ان کی مثالیں نہایت شاندار اور مسرت افزا ہیں۔

(۱) تشبیہ حسی بصری۔ اس تشبیہ کو کہتے ہیں جو قوت باصرہ سے محسوس کی جاتی ہیں مثال:

قرآن کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز
بسم اللہ آگے جیسے ہو یوں تھے شہ حجاز

پہلے مصرعے میں قرآن کی سطر پہ جماعت کی گنتی، دوسرے
میں بسم اللہ۔ شرچاز یعنی ما اعجاز۔

(۲) تشبیہ حسی سمعی۔ وہ تشبیہ جس کا تعلق سننے سے ہو۔ مثال:

گویا صدا رسول کی کانوں میں آ گئی

یہاں رسول کی صدا علی اکبر کی آواز سے مراد ہے۔

(۳) تشبیہ حسی شامی۔ وہ تشبیہ جس کا تعلق سونگھنے سے ہو۔ مثال:

خوشبو سے جس کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول
(خوشبو، جنگل، خلد کی مہک کی طرح)

(۴) تشبیہ ذوقی۔ جس تشبیہ کا تعلق چکھنے سے ہو۔ مثال:

سوکھی زباں میں شہد فصاحت سے کامیاب

تشبیہ مرکب حسی ذوقی کی یہ مثال بھی دیکھئے:

کلیوں پہ شائران عرب تھے مرے ہوئے
پتے لبوں کے وہ جو نمک سے بھرے ہوئے

(۵) تشبیہ حسی لمسی۔ اس تشبیہ کا تعلق چھونے سے ہے۔ مثال:

آب خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

تضمین المزدوج۔ انیس نے یہ صنعت مرثیے میں کم و بیش ہر بند
میں استعمال کی ہے دیکھنے میں یہ صنعت بھاری بھرکم دکھائی دیتی ہے لیکن معا
بہت آسان۔ یعنی شاعر میں قوافی کے علاوہ کچھ الفاظ ہم قافیہ بھی لائے جاتے
ہیں۔ مثال:

سر گوش ہو بدن نہ گزرے ہو علم کے پاس

تیرھواں باب۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے "تجزیہ یادگار مرثیہ"
حاصل کتاب ہے اس میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے کمالات و حالات کا مظاہرہ
اس خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مثال میں ایک بند کا خلاصہ
مختصر ترین الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ موصوف نے یہ تجزیہ فارسی اور انگریزی ادب
کے نقطہ نظر سے کیا اور یہ ایک کامیاب تجربہ کا نمونہ ہے۔

ٹھنڈی ہوا میں سبزہ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا، پھولوں کی وہ مہک
ہر برگ گل پہ قطرہ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

پہلے مصرعے میں سبزہ صحرا میں صنعت تضاد ہے۔ ٹھنڈی اور زنگاری
میں صنعت المزدوج ہے۔ دوسرے مصرعے میں اطلس زنگاری فلک استعارہ
ہے آسمان سے۔ تیسرے مصرعے میں درختوں اور پھولوں میں تضمین المزدوج
ہے درختوں، پھولوں، برگ گل، مہک اور شبنم میں صنعت مراعات النظیر ہے۔
تیسرے شعر میں صنعت عکس ہے یعنی دوسرا مصرعہ پہلے بند کے
سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ آخری مصرعے میں دو کے "تھے" میں
تضمین المزدوج ہے اور پورا مصرعہ حسن تعلیل سے مزین ہے۔ آخری شعر میں
متعدد صنعتیں ہیں ایک صنعت وہ ہے جس کے موجد عابدی صاحب ہیں۔ اس کا
نام انہوں نے "مساوی الفاظ" رکھا ہے۔ یعنی جتنے نقطے پہلے مصرع میں ہیں
اتنے ہی دوسرے میں ہوتے ہیں یہاں مصرع اول میں ۲۲ اور مصرعہ دوم میں بھی
اتنے ہی ہیں۔ مرثیے میں اس صنعت کے بہت سے شعر ہیں۔

کتاب کا دسواں باب انیس کی معجز بیانی پر مشتمل ہے۔ جب میں
نے اسے بنظر غائر دیکھا تو مرتب کے جادو نگار قلم نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔
انیس کا ایک شعر ہے:

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار

شعر کا تجزیہ ڈاکٹر صاحب یوں فرماتے ہیں:

"شعر میں حسن ادا کی جدت دیکھئے۔ جہاں وقت سحر ہر چیز حمد خدا
میں مصروف ہے وہاں چیونٹی بھی دعا میں محو نظر آتی ہے۔ چیونٹی کو روز بھی لوگ
دیکھتے ہیں۔ یہ اتنی حقیر شے ہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں روز پامال ہو جاتی ہیں
لیکن باوجود حقیر ہونے کے انیس کے یہاں اس کی بھی وقعت ہے۔ ذرا اس
مشاہدے observation کی وسعت کو دیکھئے کہ ہم لوگ اکثر و بیشتر
چیونٹیوں کو پچھلے پاؤں قائم رکھتے ہوئے اور اگلے پاؤں اٹھاتے ہوئے کسی دانے
کو لے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن یہ کبھی ذہن میں نہ آیا ہوگا کہ اس انداز کا
استعمال ایسی شان و شوکت اور دلاویزی سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور جگہ چیونٹی کو
ذی حیات سمجھ کر فرماتے ہیں:

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"دقیق نیچر کا مطالعہ منظر کشی کی جان ہے۔ مچھلیوں کی جلد کو کس
نے نہیں دیکھا؟ پانی میں سانس لیتی ہوئی مچھلیوں کے منہ کو کس نے نہیں دیکھا۔
نہنگ سمندر کی گہرائیوں میں ہوتے ہیں کس نے نہیں سنا۔ موج، گرداب بہتا
دریا اور پانی پر بلبلوں کو ہر شخص دیکھتا ہے لیکن جب میر انیس نے اسے دیکھا تو
دوسرے ہی رنگ میں دیکھا۔ چنانچہ ان مشاہدات کو حسن تعلیل کے زیور سے
آراستہ کر کے اس طرح پیش کیا کہ حسن کلام دوبالا ہو گیا۔ بند ملاحظہ ہو:

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر

مثنوی شہادت امیر المومنین دریافت پروفیسر آذر [illegible] ۷۔ مثنوی واقعہ شہادت حضرت علی اکبر ۸۔ مثنوی عزائے حیدر کرار بہ غرۂ ماہ شوال کہ روز عیدست۔

ان مثنویات کے موضوعات کی تفصیل یوں ہے: احسن القصص ایک طولانی مثنوی ہے جس میں تین ہزار تین سو سولہ اشعار ہیں اور اس میں چہاردہ معصومین کی ولادت اور معجزات قصوں میں نظم کیے گئے ہیں۔ "معراج نامہ" چھ سو چوراسی اشعار پر مشتمل ہے اس میں معراج نبوی اور آئمہ اثنا عشر کے فضائل رقم کیے گئے ہیں۔ دبیر کے علاوہ اس موضوع پر دیگر شعراء نے بھی مثنویاں کہیں مثلاً مظفر علی اسیر کی "معراج الفضائل" منیر شکوہ آبادی کی "معراج المضامین" اور میر مجیر کی "ریحان معراج" وغیرہ ان میں رسولؐ و آئمہ اثنا عشر کے فضائل، مناقب اور معجزات نظم کیے گئے ہیں۔ دبیر کا "معراج نامہ" شعری و فنی اعتبار سے قابل قدر کارنامہ ہے۔ بے عنوان مطبوعہ مثنوی سلکی حالات پر ہے اس میں پانچ سو اٹھارہ اشعار ہیں۔ مثنوی شہادت علی اکبر میں اکتیس اشعار ہیں۔ البتہ نودریافت مثنویاں مثلاً مثنوی شہادت امیر المومنین (چودہ اشعار) اور "مثنوی عزائے حیدر کرار بہ غرۂ ماہ شوال کہ روز عیدست" (سولہ اشعار) مثنویوں سے زیادہ صنف ماتم کے قریب ہیں ان میں یہی رنگ پایا جاتا ہے اور عام طور پر دبیر کی یہ مثنویاں ماتم کے طور پر ہی مجالس عزا میں ماتمی لے میں پڑھی جاتی ہیں۔ خصوصاً اول الذکر جس کا یہ شعر ٹیپ کے مصرعے کی طرح ماتم کے دوران بار بار دہرایا جاتا ہے۔

یہ رات مرتضیٰ کی شہادت کی رات ہے
زہرا کی بیٹیوں پہ قیامت کی رات ہے

اس طرح مثنوی عزائے حیدر کرار بھی عید کے موقع پر حضرت علی کے دسویں کی یاد میں ماتم کا انداز لیے ہوئے ہے اور مادر عباس جناب ام البنین کی جانب سے فریادی ماتم کی شکل ہے۔ ملاحظہ ہو:

ماہ عید اب ہمارا ہو گیا
آج دسواں بھی تمہارا ہو گیا

مثنوی تاریخ ولادت وفات حضرت چہاردہ معصومؑ کی ادبی اہمیت سے قطع نظر یہ مثنوی محض اس غرض سے کہی گئی معلوم ہوتی ہے کہ لوگ اس بہانے سے چودہ معصومین کی ولادت کی تاریخیں حفظ کر لیں۔ لہذا اس مثنوی کو مذہبی سے زیادہ مدرسی یا فرہنگی مثنوی کہا جا سکتا ہے۔ بقول علی جواد زیدی شاعروں نے یہ مثنویاں صرف اس لیے لکھیں کہ پڑھنے والوں کو منظوم ہونے کی وجہ سے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ ایسی مثنویوں کی تعداد خاصی ہے جن میں عقیدہ، فقہ وغیرہ سے متعلق معلومات کو بحر و قافیہ کے سانچوں میں ڈھال دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مثنوی کے ضمن میں خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے لیکن یہ اسی سبب سے بعض محققین نے انہیں قابل اعتنا نہ گردانا ہو۔ بہر حال ہر مثنوی کی ابتداء میں اس کا تنقیدی جائزہ اور تاریخی و تحقیقی حال قلم بند کیا گیا ہے۔ نیز مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی ذیلی حاشیوں میں درج ہے۔ اس دریافت سے ایک نیا دبیر ہمارے سامنے آتا ہے جو ایک اعلیٰ مقام مرثیہ گو ہی نہیں، ایک قادر الکلام مثنوی نگار بھی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ "دبیریات" کے ادب میں یہ تحقیقی کاوش ڈاکٹر تقی عابدی کا بلاشبہ ایک کارنامہ ہے اور دبیر سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

☆

ایک تجربہ

"چہارسو" کے انگریزی داں قارئین کے لیے

Rhyming couplet, GHAZAL

Though the life is a journey the night
Force the mind always to think positive and bright

Justify not your wrong-doings for somebody else's offence
For, two wrongs do not make a right

Where there is bloodbath in the name of religion
Inside every human society, it's the most shameful sight

Indise every human a spiritual mirror surely lies
That shows them what is black and what is white

Move up with flowers to win the hadest human heart
It was never overcome with main and might

Tell me Meeraq, where does the dark exist?
All the faith says, God, the omnipresent, is light

Meeraq Mirza
(Mumbai , India)

"شوقِ کلامِ دبیر"

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی (ممبئی بھارت)

دہلی میں پیدا ہونے والے اور کینیڈا میں مقیم، ہندوستانی نژاد ادیب و شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی کہ ڈگریوں کی تعداد کے اعتبار سے بھلے ہی ایک شان دار طبیب ہوں لیکن کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک اہلِ قلم ادیب ہیں۔ جن کا ذوق و شوق تحقیق و تنقید ہے اور مزاج اور افتادِ طبع عرفانی اور روحانی۔ اس کا اظہار ان کی اُن تصانیف سے ہوتا ہے جن میں مذہبی عقائد و اعترافات کے ساتھ ساتھ روحانی اور عرفانی ادب کا ذائقہ بھی شامل ہے۔ مثلاً جوشِ مودت، سلکِ سلامِ دبیر، تجزیۂ یادگارِ انیس، اقبال کے عرفانی زاویے، تجزیۂ شکوہ جواب شکوہ اور رباعیاتِ دبیر وغیرہ وغیرہ۔ اس جان بکف محقق نے مختلف سمتوں میں دشت نوردی کی ہے جن میں سلام، مرثیہ، رباعی وغیرہ کے علاوہ چند نثری اصناف بھی شامل ہیں۔ اور اب ان کا یہ شوق کلامِ دبیر سے متعلق اس سلسلۂ مطبوعات سے مترشح ہے جس کی چھ جلدیں حال ہی میں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "مثنویاتِ دبیر" اسی سلسلے کی چوتھی جلد کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب کی ابتدا میں قاری کی تفہیم اور موضوع کی مناسبت سے ایک باب "مثنوی۔ ایک اہم صنفِ سخن" کے عنوان سے شامل ہے جس میں صنفِ مثنوی کی فنی و معنوی ہیئت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اس کی ہیئت، وزن و بحور، معنوی ساخت، محاسن و لوازم اور معیارِ نقد پر مختلف نقادوں کی آرا کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ جہاں تک مثنوی کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ وہ اردو کی تمام اصنافِ سخن میں اپنی انفرادی خصوصیات کے باعث ممتاز مقام رکھتی ہے۔ شبلی کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "انواعِ شاعری میں یہ صنف تمام انواعِ شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے" شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کی ابتدائی نظمیں بھی مثنویوں کی شکل میں ملتی ہیں۔ مثلاً خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور شاہ برہان الدین جانم کے چکی نامے، ولی ویلوری کی روضۃ الشہدا اور قطبی کی مرگاوتی وغیرہ۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ جتنی طبع زاد، غیر طبع زاد یا ماخوذ اور ترجمہ شدہ مثنویاں اردو میں لکھی گئیں، اتنی تنقیدی کتابیں اس صنف پر نہیں ملتیں۔ پھر بھی اطمینانِ قلب کے لیے یہ امر کافی ہے کہ جو کام مثنویوں پر ابتدا سے آج تک ہوا ہے وہ اپنی اپنی جگہ لائقِ توجہ اور قابلِ قدر ہے۔ مثلاً اردو مثنوی کا ارتقا (عبد القادر سروری)، تاریخِ مثنویاتِ اردو (جلال الدین احمد جعفری)، اردو مثنویات (امیر احمد علوی)، اردو مثنوی شمالی ہند میں (ڈاکٹر گیان چند جین)، اردو مثنوی۔ ایک عمومی مطالعہ (اطہر علی فاروقی)، اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں (سید محمد عقیل)، اردو کی دو قدیم مثنویاں (نائب حسین نقوی)، اردو کی تین مثنویاں (خان رشید)، اردو کی منظوم داستانیں (فرمان فتح پوری)، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) اور شمالی ہند کی نادر مثنویاں (ڈاکٹر کندن لال کندن) وغیرہ۔ ان میں سے بیشتر کے حوالے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ہاں موجود ہیں لیکن ایک اہم نام علی جواد زیدی کا ہے جن کی کتاب "مثنوی نگاری" (مطبوعات سلسلہ اتر پردیش نمبر ۲) جس میں اتر پردیش کی مثنویوں پر تحقیقی کام ملتا ہے اور جس میں صنفِ مثنوی سے متعلق ایک بسیط اور وقیع مقدمہ شامل ہے۔ غالباً ڈاکٹر تقی عابدی کی نظر سے نہیں گزر سکی یا انھیں دستیاب نہیں ہو سکی، ورنہ وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ کیوں کہ موضوع سے متعلق براہِ راست تنقیدی کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر عابدی نے ان تنقیدی کاوشات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے جن میں ضمناً مثنوی کے فن پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً امداد امام اثر کی کاشف الحقائق، مولانا حالی کی مقدمہ شعر و شاعری، علامہ شبلی کی "شعر العجم" وغیرہ۔

ہر چند کہ مثنوی کی اصطلاح عربی سے لی گئی اور یہ "مزدوجہ" یعنی دو دو ہم قافیہ مصرعوں کے جوڑی دار اشعار پر مشتمل ہوتی ہے جس کی خوبی تسلسلِ بیان اور ترتیبِ واقعات ہے لیکن اس کا فروغ ایران میں ہوا۔ اردو پر اس کے دیرپا اثرات ملتے ہیں۔ فارسی مثنویات کی مروجہ بحروں کے جن پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے بحث کی ہے اور سنسکرت کی طویل رزمیہ نظموں کی جو "دوہا کوش" کی روایت سے وابستہ رہیں، اردو والوں نے ان میں اضافہ کر کے مثنوی کی بحروں کی تعداد گیارہ تک پہنچا دی۔ بعض نقادوں نے تو موضوع کے اعتبار سے مثنویوں کے لیے بحریں بھی مخصوص کر دیں۔ تقی عابدی نے ان مروجہ بحروں کے ارکان بھی تحریر کیے ہیں جو اردو مثنویوں میں عام طور پر مستعمل ہیں۔

بہر حال اردو میں مثنویاتی ادب وافر مقدار میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ یہ طے کرنا بھی مشکل ہے کہ اردو کی اولین مثنوی کون سی ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تحقیقی سفر بھی آگے بڑھتا جا رہا ہے اس لیے اس ضمن میں نقادوں میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل حضرت بابا فرید شکر گنج کے ان صوفیانہ اشعار میں اردو مثنوی کا پہلا نقش دیکھتے ہیں جو ۱۲۶۳ء کی تحریر ہے۔ جس کے دو شعر یہ ہیں۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا پاک
پیش رو اصفیا کے ہوتے خوک
خاک لانے سے گر خدا پائیں
گائیں بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (اور ڈاکٹر جمیل جالبی) کے مطابق اردو کی اولین مثنوی بہمنی دور کے شاعر نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ"

(۸۱۷ھ۔۸۱۵ھ) ہے۔ جب کہ علی جواد زیدی ''مثنوی نگاری'' میں ملا داؤد کی مثنوی ''چنداین'' (۷۸۱ھ مطابق ۸۰-۱۳۷۹ء) کی نشان دہی کرتے ہیں جو لورک اور چندا کے قصے پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے سید محمد عقیل کے حوالے سے بابا فرید شکر گنج کی مثنوی ہی کو اولین مثنوی قرار دیا ہے نیز اٹھارھویں صدی کے اواخر اور خصوصی طور پر بیسویں صدی میں مثنوی نگاروں نے ہیئت کی جو تبدیلی کی جس کی وجہ سے مثنوی اور نظم کا فرق جاتا رہا، ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی ڈاکٹر گیان چند جین اور سید محمد عقیل کی طرح اس دور کی نظموں کو مثنوی کی بحث سے خارج کر دیا ہے۔

چونکہ مثنوی میں موضوع اور اشعار کی قید نہیں، لہٰذا اس میں ایک تنوع ملتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی دیگر نقادوں کی طرح موضوع کے اعتبار سے مثنویوں کی مختلف قسموں کو گناتے ہوئے مذہبی مثنویوں کا ذکر کیا ہے اور مثنویات دبیر کو مذہبی مثنویوں کے زمرے ہی میں رکھا ہے۔

مصنف مثنوی سے قطع نظر ایک پورے باب میں انھوں نے اس بات پر اظہار تاسف کیا ہے کہ ہمارے اکثر ناقدین اور محققین نے سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے مثنویات دبیر کو طاق نسیاں کے سپرد کر دیا۔ سب سے زیادہ شکوہ انھیں مولانا امداد امام اثر کی ''بے خبری'' سے ہے جنھوں نے دبیر کی مثنوی نگاری سے انکار فرمایا ہے۔ اس سے زیادہ دکھ انھیں اس بات کا ہے کہ خود دبستان دبیر کے شعرا نے بھی اس طرف سے غفلت برتی، یہاں تک کہ چودھری سید نظیر الحسن فوق کی ''المیزان'' مرزا دبیر کی شاعری پر مفصل بحث کے باوجود دبیر کی مثنویات کے ذکر سے خالی ہے۔ اوج لکھنوی کے شاگرد سید فراز حسین خبیر لکھنوی، جنھوں نے مرزا دبیر کے چھ عدیم النظیر مرثیوں کو ''سبع مثانی'' کے عنوان سے مرتب کیا، اس میں بھی مثنویات دبیر کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اگر بعض حضرات نے ذکر کیا بھی ہے تو سرسری اس جہان سے گزر گئے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی کے مطابق ان میں مرزا دبیر کی پہلی سوانح حیات ''ثمر المجنی'' کے مصنف مولوی افضل علی بھی شامل ہیں۔ جن نقادوں یا محققوں نے دبیر کی طرف دو مثنویوں ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کا تذکرہ کیا ہے ان میں ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر سید سلیمان حسین (مثنویات دبستان لکھنو) اور ڈاکٹر سید محمد عقیل ہیں جنھوں نے اپنی کتاب کے ضمیمہ نمبر ۲ میں دبیر کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی ایک ایک دو دو جملے میں۔ ''حیات دبیر'' کے مصنف ثابت حسین کو ڈاکٹر تقی عابدی اس لیے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ دبیر سے وابستگی کے باوجود ان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' دو الگ الگ مثنویاں ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین سے انھیں گلہ ہے کہ انھوں نے امیر اللہ تسلیم کی مثنویات کے بارے میں تو پچیس سے زیادہ صفحات میں تبصرہ کیا ہے اور ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کو صرف ڈیڑھ صفحے کے تبصرے کے قابل گردانا۔ جب کہ ان مثنویوں پر ڈیڑھ سو صفحات لکھے جا سکتے تھے۔ ڈاکٹر کندن لال کندن سے وہ اس لیے شکوہ کناں ہیں انھوں نے ''جنوبی و شمالی ہند کی تاریخی مثنویوں'' میں سو کے قریب تاریخی مثنویوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے لیکن مرزا دبیر کے مثنویات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ راقم کا خیال ہے کہ اس ضمن میں ڈاکٹر تقی عابدی کو ڈاکٹر کندن لال کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی طرح، جن کے نام یہ کتاب منسوب کی گئی ہے مستثنیٰ قرار دینا چاہیے کیوں کہ دونوں کا موضوع اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ جس طرح ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا موضوع ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' ہیں۔ جن میں مقامی موضوعات کی بنیاد پر مثنویوں کو جن چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ان میں پہلی قسم ان مذہبی مثنویوں کی ہے جو ہندوستانی قصوں سے ماخوذ ہیں لہٰذا مثنویات دبیر اس میں شامل نہیں کی جا سکتی تھیں کہ وہ ہندوستانی قصوں کی نہیں، اسلامی اور خصوصاً شیعی عقاید کی تشریح کرتی ہیں اس طرح ڈاکٹر کندن لال کندن کا موضوع تاریخی مثنویاں ہیں جب کہ تقی عابدی خود اس کا اقرار کرتے ہیں کہ مثنویات دبیر کا شمار مذہبی مثنویوں میں ہونا چاہیے کہیں کہیں ضمناً تاریخ ضرور قلم بند ہو گئی ہے۔ البتہ وہ غیر مطبوعہ مثنوی جس کا موضوع سراسر تاریخی ہے ہنوز تحقیق کی منزلوں میں ہے غالباً اسی لیے اس کا ذکر نہ ڈاکٹر نارنگ کے یہاں ملتا ہے اور نہ ڈاکٹر کندن کے۔ البتہ ڈاکٹر تقی عابدی ان محققین و ناقدین سے گلہ گزار ہونے میں حق بجانب ہیں جنھوں نے دبیر کی مثنویوں کا ذکر تو کیا مگر وہ بھی سرسری۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے بھی جن کا شمار ماہر دبیریات میں کیا جا سکتا ہے، دبیر کی جس مثنوی کا انکشاف ''ممتاز نامہ'' کے عنوان سے کیا ہے وہ بھی دراصل ''معراج نامہ'' ہی کا دوسرا نام ہے جو عہد نظیر الدین حیدر شاہ میں ان کی ملکہ ممتاز الدہر کی فرمائش پر لکھی گئی اور اسی نسبت سے ان کے نام سے منسوب ہو کر ممتاز نامہ کہلایا۔ اسی طرح ڈاکٹر کاظم علی خان دبیر کی تیسری مثنوی کا جو دفتر ماتم کی بیسویں جلد میں شامل ہے ذکر تو کرتے ہیں مگر اس کے متعلق خاطر خواہ معلومات نہیں دے پائے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اس مثنوی کا پورا نام ''کتاب دعوۃ الحمد و فضائل چہاردہ معصوم علیہم السلام'' ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر زماں آزردہ کی دریافت شدہ غیر مطبوعہ مثنوی کے علاوہ ڈاکٹر تقی عابدی نے دفتر ماتم کی بیسویں جلد سے دبیر کی مزید چار مثنویاں دریافت کی ہیں۔ فاضل محقق کی ان کاوشوں کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ دبیر نے نہ صرف دو مثنویاں نہیں بلکہ کل آٹھ مثنویاں لکھیں۔ تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق جن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ احسن القصص، ۲۔ معراج نامہ یا ممتاز نامہ ۳۔ کتاب دعوۃ الحمد و فضائل چہاردہ معصوم علیہم السلام دریافت کاظم علی خاں، ۴۔ ولادت و وفات حضرت چہاردہ معصوم علیہم السلام ۵۔ غیر مطبوعہ مثنوی ۶۔

مشاہیر احباب اور افراد سے خط و کتابت بھی کی اور اس طرح سیاست اور قومی مسائل میں پوری طرح شریک بھی ہے۔"

اسی قیام کے دوران اقبال نے ایک فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے نام لکھنی شروع کی جو بعد ہو جا کر تکمیل کی۔ اس مثنوی کی بابت ۲۹ جولائی ۱۹۳۶ کو سر راس مسعود کو لکھتے ہیں:

"۳ اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا۔ میں نے تمہارے دادا حضرت اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کی متعلق حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے۔ اب مجھے خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی نیا دہ بڑی مثنوی کا حصہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمد للہ۔"

مصنف نے اقبال کے وہ فارسی اشعار بھی پیش کیے جن میں علامہ نے اپنی بیماری اور بیچارگی کا ذکر کیا ہے۔ وہ اشعار یوں ہیں:

کار این بیمار نتوان برد پیش
من چوں طفلاں نالم از داروئے خویش
در دوا نزد بادوار باجان زار
تلخ و بوئش بر مشامم نا گوار
با ستارہ‌ام شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

(ترجمہ) بیماری سے چھٹکارا نہیں اور میں بچوں کی طرح کڑوی دواؤں سے گھبراتا ہوں۔ میں تاریکی پھیلانے والوں سے لڑ رہا ہوں کچھ تیل اور میرے چراغ میں ڈال دے۔"

ان تمام اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال شعری و ادبی سطح پر کیا کیا منصوبے رکھتے تھے اور کیا کیا کرنا چاہتے تھے۔ قدرت نے انھیں چند برس اور عطا کر دیے ہوتے تو وہ یقیناً کچھ اور شعری سرمایہ بھی چھوڑتے اور قرآن شریف کے نوٹس بھی تیار کرتے جو ظاہر ہے کہ عصر کے کی چیز ہی ہوتیں لیکن۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کتاب کے آخری حصہ میں علاج کی کاوشیں۔ پرہیز کی کمزوریوں اور دوسری قسم کی چیزوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے اور پھر آخر میں ایک سوال بھی قائم کیا ہے کیا اقبال نے تیس سال عمر کم پائی؟ اور یہ بھی کہ اقبال کی قبل از وقت موت نے ان کے کن کن منصوبوں کو ادھورا چھوڑ دیا جس میں سر فہرست ہے قرآن کے نوٹس یعنی مقدمۃ القرآن کا نہ لکھا پانا اور راس مسعود کے نام یہ خط:

"میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصے سے میرے زیر غور ہیں لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کرنے کا سامان میسر آ جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیشکش مسلمانان عالم کو پیش نہیں کر سکتا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف کے نوٹ لکھنے پر صرف کروں گا۔"

مقدمۃ القرآن کے علاوہ وہ ایک اور کتاب فراموش شدہ پیغمبر کا صحیفہ لکھنا چاہتے تھے۔ نہ لکھ سکے۔ ان مہلک اور تو ہنا ک بیماریوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ وہ گلستری لیگ کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی لینے نہ جا سکے۔ ترکی و مصر تقریر کی دعوت دی گئی نہ جا سکے اور بہت کچھ نہ کر سکے۔ جس کی تفصیل مصنف نے بڑے سلیقے اور عرق ریزی سے ترتیب دی ہے جس سے نہ صرف ان کے آخری دور کی تکالیف۔ مجبوریاں اور پریشانیاں کھل کر سامنے آتی ہیں بلکہ اقبال جیسے عظیم شاعر و مفکر کی مایوسی و بیچارگی پر رونا بھی آتا ہے کہ مذہب۔ قوم۔ شاعر وغیرہ کو زندہ کرنے والا شاعر۔ فلسفی۔ مفکر کو قدرت نے کتنی جلدی آواز۔ حرکت و عمل سے محروم کر دیا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی خود اقبال پر رقت طاری ہو جاتی۔ فقیر وحید الدین نے ایک خط کے حوالے سے لکھا ہے "خدا نے مجھے زبان تو عطا کی ہے لیکن آواز سے محروم ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان پر رقت طاری ہو گئی۔" اقبال انسان تھے کبھی کبھی اس کیفیت کا طاری ہونا فطری تھا لیکن اس کیفیت کا تعلق اپنی ذات کے لیے قائم کم تھا بلکہ وہ قوم و ملت کو ابھی اور بہت کچھ دینا چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ اکثر امید و شادی کی کیفیت میں رہتے۔ لوگ حیران ہوتے۔ سوال کرتے تو وہ کہتے:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

مصنف نے علاج و معالجہ کی تفصیل تو لکھی ہے اس طرح کے واقعات سے اقبال کی شخصیت و شاعری پر بھی جا بجا روشنی ڈالی ہے۔ زندگی کے آخری لمحات یہاں تک کہ اقبال کے جلوس جنازہ تک کو بھی اس کتاب میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے اور پھر سب سے آخر میں مقبرہ تک کا ذکر ملتا ہے۔ غرضیکہ اس گراں قدر کتاب میں مصنف نے نہایت عرق ریزی و دیدہ وری اور دیانت داری کے ساتھ اقبال سے متعلق ایسی روداد اور ایسے حقائق جمع کر دیے ہیں جن کو اس انداز سے آج تک کوئی نہ جمع کر سکا۔ یہ سچ ہے کہ یہ حقائق۔ خطوں۔ کتابوں یا تذکروں میں بکھری ہوئی شکل میں کہیں نہ کہیں موجود تھے لیکن مصنف نے بے پناہ تلاش و تحقیق اور تخلیقی نوعیت کی ترتیب دینے کا جو غیر معمولی کام سر انجام دیا ہے اس کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ یہ کتاب اپنی انفرادیت اپنی حقیقت و وقعت اور غیر معمولی ترتیب و تدوین کے ذریعہ دنیائے اقبال شناسی میں مدتوں یاد کی جائے گی جس کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

"چوں مرگ آید"

ڈاکٹر علی احمد فاطمی
(الٰہ آباد، بھارت)

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے گراں قدر، اہم ادبی و تحقیقی کارناموں کے ذریعہ ایک ادیب اور محقق کی حیثیت سے اپنی ایک ممتاز و منفرد حیثیت بنالی ہے۔ انیس، دبیر، غالب، نجم آفندی وغیرہ نیز اردو فارسی اور دیگر امور پر جس نوعیت کی علمی و تحقیقی کتابیں رقم کی ہیں اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اہل علم و فن لگا چکے ہیں اور اپنی پسندیدگی و معیار بندی کی مہر بھی لگا چکے ہیں۔ تازہ ترین اور زیر نظر کتاب "چوں مرگ آید" نہ صرف اس سلسلے کی اگلی کڑی ہے بلکہ اپنے نام اور کام کی انفرادیت اور انوکھے پن کی وجہ سے ڈاکٹر تقی عابدی کی غیر معمولی وابستگی، عرق ریزی اور حق شناسی کی غیر معمولی دلائل و براہین پیش کرتی ہے۔

"چوں مرگ آید" اقبال کے ہی مصرعہ سے عنوان قائم کر کے عابدی نے اقبال کے حیات و موت کے درمیان علالت و امراض کے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جس پر ابھی تک کسی نے توجہ نہ دی یا اگر دی تو بہت کم۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ موضوع ایسا تھا ہی نہیں کہ جس پر علم و تحقیق اور شعور و نقد اپنی توجہ مبذول کرے اور باقاعدہ کتاب رقم کرے لیکن تقی عابدی کی نظر دقیق اور پیش رفتی نے ایک ایسے موضوع کو نہ صرف تلاش کیا بلکہ علامہ کی حیات و امراض کے حوالے سے ایسے مخفی پہلوؤں پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈال دی کہ وہ ایک روشن کتاب بن گئی۔ انتہائی دلچسپ، معلومات افزا اور کہیں کہیں بصیرت افروز بھی۔ اپنے مقدمے کی ابتدا میں وہ لکھتے ہیں:

"علامہ کی زندگی کے اس پہلو پر گفتگو کی جائے جس سے ان کی ذات کا تعلق تھا اس سے عوام کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور انتقال کے بعد خود علامہ کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ان تمام سوالوں کا تشفی بخش جواب اس کتاب کے ہر صفحہ پر سطور سے زیادہ بین السطور یا خفی تحریر کی طرح روشن ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں طبی معلومات، بدنی کیفیات، روحانی اعتقادات کو خاص طریقے سے برتا گیا ہے۔ گفتگو لفظ بہ لفظ خطوں کے آئینے میں مستند حوالوں کی روشنی میں کر کے نتائج اخذ کیے ہیں جن کے مطالعہ سے عوام ہی نہیں اقبالیات کے خاص طالب علموں کو بھی معلومات فراہم ہو سکتے ہیں۔"

مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ اقبال، فردوسی، عطار، حافظ، جعفر زٹلی وغیرہ کی طرح خوش نصیب نہ تھے کہ ان کو قتل کیا گیا یا مفلسی کی موت مرے بلکہ اس کے برعکس اقبال ان خوش نصیبوں میں سے تھے جن کے علاج کے لیے اس عہد کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر، حکیم، وید سب دست بستہ اقبال کے حضور میں استادہ تھے اور ہر طرح کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ اس کے باوجود قسمت، فطرت نے یاوری نہ کی اور علامہ ایک نہیں کئی موذی و مہلک امراض میں گرفتار رہے اور محض اکسٹھ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ چونکہ یہ امراض ایک دو نہیں متعدد تھے اور معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی تھے اس لیے اقبال نے ان کے علاج کی ہر طرح کی کوشش کی۔ اس ضمن میں انھوں نے قرب و بعد تمام حکیموں و ڈاکٹروں سے رابطے کیے اور خطوط لکھے۔ یہ کتاب انھیں خطوط کی چھینٹوں اور بعض بنیادی کتابوں کے تعاون سے رقم کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف رقمطراز ہیں:

"اردو فارسی ادب کا شاید ہی کوئی دوسرا عظیم شاعر ہو جس نے علامہ کی طرح اپنی بیماری کی کیفیتوں کو لکھا ہو۔ علامہ کے مطبوعہ ساڑھے چودہ سو خطوں میں 251 خطوط ہمارے بیان کی سند ہیں۔"

ان خطوں کے حوالے سے اخذ کردہ حقائق سے بے حد اہم، دلچسپ اور معلومات افزا صداقتیں ہمارے سامنے آئی ہیں جن سے نہ صرف اقبال کے امراض بلکہ ان کی ذہنی کیفیت، گھریلو حالات اور امکانات پر قابل قدر روشنی پڑتی ہے۔ نیز ان حکماء، رفقاء اور خدمت گذاروں کے بارے میں علم ہوتا ہے جن کے بارے میں اب تک اردو قارئین اور اقبال پسندوں کا علم نہ کے برابر تھا۔ چنانچہ اسی خیال کو مصنف نے اپنے چند نکات میں برفہرست رکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اقبالیات کے طالب علم اُن چند افراد کے نام و نشان سے واقف ہیں جنھوں نے اقبال کے انتقال کے بعد اقبال کی قربت کو اپنے مقام کو بلند کرنے کے لیے صرف کیا اور بات کا بتنگڑ بنایا اور خود کو اقبال کے خدمت گزاروں کی صف میں برفہرست رکھا۔ اقبال کے ساتھیوں میں بعض افراد جو خصوصی طور پر اقبال کی نگاہ میں معتبر اور مستند تھے ان کا ذکر بھی نہیں کیا۔ چنانچہ اس کتاب میں خطوں اور مستند حوالوں سے ان کے حقیقی خدمت گزاروں کے نام اور کام سے بھی آشنائی ہو سکے گی۔"

اقبال کی طب سے واقفیت، اقبال کے نظام اوقات، معمولات، نیز بیماری کی نفسیات اور پھر اقبال کی ذہنی کیفیت، ہمت اور استقلال کو بھی بڑے پرسوز انداز میں پیش کیا گیا ہے چونکہ تقی عابدی خود ڈاکٹر ہیں اس لئے انھوں نے بڑے تجربے کی بات کی ہے:

"راقم کے تیس سالہ طب کے تجربہ میں کئی بار دیکھا گیا ہے کہ جب کسی مریض کو اس کے مہلک مرض کی اطلاع دی جاتی ہے تو بڑے سے بڑے بلند اور دلیر شخص کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جاتی ہے

لیکن جب لاہور کے ریڈیالوجسٹ ڈاکٹر ڈاک ہیٹے کے ایکس رے کے معائنے کے بعد علامہ کے سینے میں مہلک ٹیومر کی تشخیص دیتے ہیں اس کے چند گھنٹوں بعد جو خط علامہ نے سید نذیر نیازی کو حکیم نابینا سے مشورہ کرنے کے لیے لکھا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اقبال تمام آزمائش قلب و ذہن تشویش کے زندگی اور موت کے مباحث میں مشغول ہیں۔ بجائے موت سے کچھ گھنٹے قبل درد کم کرنے کے لیے انجکشن دواؤں کے استعمال کو یہ کہہ کر منع کر دیا کہ میں نیم بیہوشی یا بیہوشی میں مرنا نہیں چاہتا۔

علامہ کے عزم۔ استقلال مزاج اور حقیقت حیات اور ممات کے مسائل اور مراحل بھی اسی دفتر میں نظر آئیں گے۔

ہر چہ از دوست می رسد نیکو است

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں موجود برصغیر میں طبی سہولتوں کا بھی پتہ چلتا ہے کیوں کہ علامہ کے مرض کی جدید طبی آلات سے بھی تشخیص کی گئی تھی۔

علامہ کی آواز بیٹھ جانے۔ دمہ قلبی۔ رسولی اور مرض قلب وغیرہ کی صحیح علت اور تشخیص جدید طبی اصولوں سے اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔

بیماری کی وجہ سے جو صدمات اقبال کے جذبات اور زندگی کے روزمرہ مسائل پر وارد ہوئے اس کا اجمالی ذکر بھی کیا گیا ہے۔"

اس سے زیادہ ایک ادب دوست اور اقبالیات کے پرشوق قاری کے لیے یہ اہم ہے کہ ان بیماریوں کی وجہ سے اقبال وہ کام نہ کر سکے جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ قدرت نے انہیں جن دینی اور دنیاوی ذہن سے نوازا تھا اور ان کے علمی و ادبی منصوبے پورے ہوئے ہوتے تو یقیناً ادب اور قوم کو کچھ اور بیش قیمتی چیزیں میسر آ گئی ہوتیں۔ مقدمہ کے آخر میں تقی عابدی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سب سے اہم نکتہ جو اس موضوع سے ہمارے سامنے ابھر کر آتا ہے وہ حکیم الامت کی کوشش جدوجہد محنت اور خدمت خلق و امت ہے جو زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جب خطرہ کی گھنٹی بجتی ہے تو لوگ اپنے تمام مشغلے جس میں شاعری و دیگر کام وغیرہ بھی شامل ہیں چھوڑ چھاڑ کر بستر علالت پر صرف فکر دنیا کے عالم میں منتظر رہتے ہیں جب کہ علامہ جو کہ بخوبی جانتے تھے کہ وہ چراغ سحری ہیں اور صرف کچھ دنوں یا گھنٹوں کے مہمان ہیں لیکن انتقال کی آخری شب تک اگر ان کے نظام الاوقات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی انہماک اور کوشش سے امت کے کاموں میں مصروف ہیں جیسے انہیں کچھ ہوا ہی نہیں۔ علامہ اقبال کی یہ قیمتی فکر ہمارے لیے بہت بڑا درس ہے۔"

مقدمہ کے بعد کتاب کی باقاعدہ ابتدا علامہ کی بیماریوں سے ہوتی ہے جن میں سرفہرست علامہ کی آنکھ کی بیماری ہے دائیں آنکھ کی ضعف بصارت۔ دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آنا۔ اس کے علاوہ عوارض گردہ (Kindney Problem) نقرس (Gret) عوارض قلب (Heart Problem) عوارض ریوی (Lung Problem) اس کے علاوہ درد گلو، امراض دہان، ملیریا، کم خوابی وغیرہ بیماریاں تھیں۔

مصنف نے بالترتیب ان بیماریوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہ مرض کیا ہے کیوں ہوا اور کیسے ہوا کس مرض کا علاج کس ڈاکٹر سے ہوا۔ ان ڈاکٹروں کے اقبال سے کیا مراسم رہے اور اقبال کس قدر پریشان رہے۔ ان سب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جس سے اقبال کی علالت ہی نہیں ان کی شخصیت اور حیات کے مختلف اور کارآمد گوشوں پر معنی خیز روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً آنکھ کی کمزوری کے بارے سید نذیر نیازی دانائے راز میں لکھتے ہیں:

"اقبال دو سال کے ہوئے تو ایک بیماری کے علاج کے لیے ان کی بے جی (والدہ) نے ان کی دائیں آنکھ کے قریب جونکیں لگوائیں۔ جونکوں نے فاسد خون چوس لیا۔ بیماری جاتی رہی لیکن آنکھ کی بینائی متاثر ہوئی۔ یہاں تک کہ عمر کے ساتھ ساتھ بینائی بالکل جاتی رہی۔"

روزگار فقیر میں سید وحید الدین لکھتے ہیں:

"اقبال کی ایک آنکھ بچپن ہی سے کمزور تھی۔ ۱۹۱۰ء میں جب ایکسٹرا اسسٹنٹ کے امتحانی مقابلہ میں شریک ہوئے تو طبی بورڈ نے آنکھ کی بینائی کمزور ہونے کے سبب ان کو سرکاری ملازمت میں لیے جانے کی سفارش نہیں کی۔ یہ بظاہر ایک طرح کی ناکامی تھی مگر علامہ کے مستقبل کے نتائج کے ہو کامیاب ہونے کا پیش خیمہ تھی۔ سرکاری ملازمت میں وہ کمشنر اور گورنر بن سکتے تھے مگر ترجمان حقیقت اور حکیم مشرق نہ بن سکتے۔"

ضعف بصارت سے اقبال کو کس قدر پریشانیاں ہوتی ہوں گی اس کا اندازہ خود علامہ کے دو مختلف خطوط کے ان جملوں سے لگایا جا سکتا ہے:

"میری بصارت کمزور ہو گئی ہے اس واسطے اب میری خط و کتابت جاوید کرتا ہے یا دیگر احباب۔ آپ کالی سیاہی سے سفید کاغذ پر لکھیں تو آپ کا خط میں خود بھی پڑھ سکوں گا۔"

مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں:

"مجھے ضعف بصارت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے۔ یہ خط ایک دوست سے لکھوایا ہے۔ قلم کا ان سے دوسرا بند لکھا گیا ہے معاف فرمائیے۔"

اب ذرا درد گردہ کی پریشانی بھی اقبال کی زبانی سنیے:

"مجھے درد گردہ کی شکایت رہی جس کا سلسلہ ایک ماہ سے اوپر جاری

ہے۔ جدید طبی آلات کے ذریعہ گردہ کا معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا
کہ گردہ میں پتھر ہے اور عمل جراحی کے بغیر چارہ کار نہیں ہے مگر تمام
اعزا اور دوست عمل جراحی کے خلاف ہیں۔ درد فی الحال ٹل گیا ہے
اور میں حکیم نابینا صاحب سے علاج کرانے کی خاطر آج شام دہلی جا
رہا ہوں۔ وہاں چند روز قیام رہے گا۔"

فقیر وحید الدین نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں علامہ کو درد گردہ کی
شدت سے تکلیف اٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں حسب ذیل دعائیہ اشعار کہے جو
روزنامہ انقلاب میں شائع ہوئے:

دہم فرصت ہوس دہر روزے دگرے
کر دوایی دہر کہن بندۂ بیدار کجاست
مہر و مہ زاب سیاست دل و دین باختہ اند
جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

ایک اور دلچسپ اور سبق آموز واقعہ غلام رسول مہر نے کتاب
"درون خانہ" کے دیباچہ میں لکھی ہے:

"ایک مرتبہ گرمیوں میں گردے کی تکلیف ہوئی اور وہ کئی روز بیمار
رہے۔ میں دوپہر کے وقت دفتر جاتے جاتے مزاج پرسی کے لیے
حاضر خدمت ہوا۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں ان کی خواب گاہ کے پیچھے
ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ شمال جانب تھا۔ اس میں تپش کم ہوتی
تھی۔ فرش پر خوب پانی ڈلوا کر اس کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اس
اثنا میں ایک اور صاحب بھی عیادت کے لیے آ گئے اور میرے پاس
بیٹھ گئے۔ یکایک مرحوم نے مجھ سے پوچھا۔ مہر صاحب! تکلیف
انسان پر اس کے نفس کی طرف سے آتی ہے یا اللہ کی طرف سے؟ میں
جواب میں حدیث جبرئیل سے وہ الفاظ دہرانا چاہتا تھا جو رسول
اکرم ﷺ نے قیامت کے سوال پر فرمائے تھے یعنی
"جس سے پوچھا گیا ہے اس کا علم پوچھنے والے سے زیادہ نہیں"
لیکن سب کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ جو صاحب میرے پاس بیٹھے تھے
بول اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب! سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔
یہ سنتے ہی ان پر عجب کیفیت طاری ہوئی۔ پہلے چیخ نکلی پھر
روتے روتے کہتے جاتے۔ اگر یہ تکلیف اللہ کی طرف سے ہے تو
میری توبہ۔ میں نے کیوں شکوہ کیا۔"

اس کے بعد نقرس (Gret) کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک
ڈاکٹر ہونے کے ناطے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نقرس کیا ہے اور اقبال کے یہاں اس
بیماری کی کیا نوعیت تھی اس کی تصدیق کے لیے وہ اقبال کے خطوط کے حوالے
دیتے ہیں مثلاً ایک خط میں حکیم نابینا کو لکھتے ہیں:

"اس بات کا بھی خیال رہے کہ گاہے گاہے بعد نقرس بھی ہو جاتا ہے
اس کی روک تھام بھی ہوتی رہے۔ انگوٹھے پر لگانے کی دوا بھی ہو تو
اور بہتر ہے"

ڈاکٹر جاوید اقبال بھی زندہ رود میں لکھتے ہیں:

"اس کے بعد درد نقرس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اس کے دورے پڑتے
تو ساری ساری راتیں کرب اور بے چینی کے عالم میں تڑپتے گزر جاتیں"

روزگار فقیر میں وحید الدین لکھتے ہیں:

"صاحب درد ہونا علامہ کی قسمت میں لکھا تھا۔ درد گردہ گیا تو اس کی
جگہ نقرس نے لے لی جو پاؤں کے انگوٹھے کے جوڑ میں ہوتا تھا۔ اس
کا دورہ جب بھی پڑتا علامہ کے لیے سخت تکلیف دہ ثابت ہوتا۔"

ان بیماریوں کی تمہ بیماری۔ بیماری قلب۔ جس کی وجہ سے
وحشت، گھبراہٹ اور نیم بے ہوشی کی حالت سی رہتی لیکن اس حالت میں بھی وہ
علم اور عالم کے گھیرے میں رہتے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ تو بے خبری میں پلنگ سے فرش پر گر گئے۔ انہی ایام میں
دمے کے پے در پے دوروں کے بعد نیم بے ہوشی کے عالم میں راقم
نے انہیں دو مرتبہ اپنی خواب گاہ میں مرزا اسد اللہ غالب اور مولانا
جلال الدین رومی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ دونوں مرتبہ علی بخش کو بلوا
کر پوچھا کہ مرزا غالب یا مولانا رومی ابھی اٹھ کر گئے ہیں دیکھا نہیں
چلے تو نہیں گئے اور علی بخش کے اس جواب پر کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں
تھا، فرمایا چلو ٹھیک ہے"

اس کے بعد مصنف نے اقبال کے اختلاج قلب اور تمباکو نوشی کا
تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں عابدی صاحب نے اقبال کی زندگی کے
کچھ بے حد اہم واقعات درج کیے ہیں۔ ہر چند کہ ان واقعات کا ذکر اقبال کے
خطوں یا بعض اہم کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن فاضل مصنف نے ان کو
کچھ ایسی ترتیب دی اور حقائق کو کچھ اس طرح ترتیب دے دیا اور سجایا ہے کہ یہ
کتاب اپنے آپ میں ایک زندہ رودی لگنے لگتی ہے۔ جانے انجانے میں اقبال
کی شخصیت کی کمزوریاں یا مزاجی کیفیت وغیرہ بھی بڑے دلچسپ انداز میں
سامنے آتی ہیں۔ اور یہ بھی کہ کچھ غلط فہمیاں بھی دور ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ کچھ لوگوں
کا کہنا ہے کہ اقبال تمباکو کے علاوہ شراب نوشی بھی کرتے تھے لیکن مصنف نے
بڑے وثوق سے یہ بات کہی ہے:

"علامہ اقبال ہرگز شراب نوش نہ تھے بلکہ شراب نوشی کو خودکشی کے
مترادف قرار دیتے تھے۔ یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ
قیام یورپ کے تین برسوں میں اور بعد میں بھی جب کبھی وہ یورپ
گئے انھوں نے گوشت بالکل استعمال نہ کیا۔ چہ جائیکہ شراب"

اس دعویٰ کی تائید میں وہ کئی واقعات اور کئی ثبوت بھی پیش کرتے
ہیں جو یقین کی منزلوں کو چھوتے ہیں اور باتوں باتوں میں ہدایت و تفریح پر

تبصرے بھی ہوتے چلتے ہیں جو اقبال کی ذاتی زندگی کو سمجھنے میں مدد کرتے ہی ہیں نیز ان کی شاعرانہ و مفکرانہ شخصیت کی تفہیم میں معاونت کرتے ہیں۔ اور آگے بڑھتے ہوئے مصنف نے اقبال کی معمولی اور چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً امراضِ حلق وسینہ۔ بروانکائٹس۔ تنگی نفس۔ دم پھولنا۔ ورم اور نمونیا۔ اگست حلق کی بیماریاں۔ آواز کا بیٹھ جانا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ آواز کا ختم ہوتے چلے جانا اقبال کی نہ صرف ذاتی زندگی بلکہ ان کی ادبی و سماجی اور سیاسی زندگی پر گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ مصنف نے ۱۹۳۶ء کو لکھے ایک خط کا ذکر یوں کیا ہے اقبال پروفیسر الیاس برنی کو لکھتے ہیں:

''دو سال سے اوپر ہو گئے جنوری کے مہینے میں عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا سویاں دہی کے ساتھ کھاتے ہی زکام ہوا۔ سید ادویہ پر زکام بند ہوا تو گلا بیٹھ گیا۔ یہ کیفیت دو سال سے جاری ہے بلند آواز سے بول نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے بالآخر بیرسٹری کا کام بھی چھوڑنا پڑا۔ انگریزی اور یونانی اطباء دونوں سے علاج کیا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔''

اس کے بعد جو نتیجہ نکالا وہ یوں ہے۔

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کی آواز تقریباً جنوری ۳۴ سے بیٹھ گئی تھی جو ان کے انتقال یعنی سوا چار سال تک بحال نہ ہو سکی۔ جس کا علامہ کی روزمرہ زندگی، سیاسی زندگی کے ساتھ معاشی اور اقتصادی حالات پر گہرا اثر پڑا۔

۱۔ علامہ نے جلسوں اور میٹنگوں میں قریب قریب تقریر کرنا چھوڑ دیا۔
۲۔ علامہ نے بیرسٹری کا کام بھی پہلے کم اور بعد میں ترک کر دیا۔
۳۔ علامہ نے قرآن پاک کی با آواز بلند تلاوت جو ہر صبح کیا کرتے چھوڑ دی۔
۴۔ علامہ نے سیاست اور انتخابات میں بھی شرکت کم کر دی۔
۵۔ آواز کے بیٹھ جانے کے بعد علامہ کی نفسیات بھی مجروح ہوئی اور عام طور پر علامہ غم زدہ نظر آنے لگے جس کا ذکر علامہ کے احباب اور طرفیان نے خاص طور پر کیا۔

اس بیماری سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کی زندگی کے آخری ایام کس کرب سے گذرے ہوں گے اور بہت سارے کام جو وہ کرنا چاہتے تھے نہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بیماریوں کی وجہ سے اقبال کا سکون چھن گیا۔ نیند نہ آنے کی بیماری بھی ہو گئی۔

بیماریوں کی تفصیلات کے بعد وسط میں ان معالجین کا بھی ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے ہر طرح سے نہ صرف پیشہ وارانہ بلکہ نہایت مخلصانہ بلکہ عقیدت مندانہ طور پر اقبال کا علاج کیا جس کی وجہ سے تھوڑی بہت راحت ہو جاتی لیکن کثرت امراض اور مہلک بیماریوں نے اقبال کو جکڑ سا لیا۔ ان ممتاز معالجین میں حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا۔ حکیم اجمل خان۔ ڈاکٹر عبدالباسط انصاری۔ ڈاکٹر رحمان۔ ڈاکٹر امیر چند۔ ڈاکٹر احمد بخش خان وغیرہ خاص تھے ان میں یونانی، انگریزی ہر طرح کے معالج تھے۔

ان بیماریوں کی وجہ سے ایک طرف ان کی صحت گرتی گئی تو دوسری طرف ان کے پروگرام منسوخ ہوتے گئے تلاوت سے محروم ہوئے۔ جلسے جلوس چھوٹے۔ خطبے نہ دے سکے۔ وکالت چھوٹی۔ مصنف نے بڑی دردمندی کے ساتھ ایک جگہ لکھا ہے:

''آخری علالت کے برسوں میں آواز سے مایوس ہو گئے اور پھر دمہ کے حملوں کے اسیر رہے۔ اب اقبال کی توجہ آواز سے زیادہ تنگی نفس پر تھی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

تف بر تو اے چرخ پیر! تو نے اس برصغیر کی اذانِ صبح گاہی کی آواز کو دھیما کر دیا جو ملت کو خواب گراں سے جگا رہی تھی۔''

چند اقتباسات اور ملاحظہ کیجیے۔

''برقی علاج کے سلسلے میں اقبال پہلی بار 37 دن بھوپال میں رہے۔ اس دوران انھوں نے ریاض منزل میں سات نظمیں لکھیں۔ ضرب کلیم میں موجود نظمیں سلطانی۔ تصوف۔ وحی۔ تقدیر۔ حکومت۔ تقدیر اور امید اس علاج کی روداد کا اندازہ کرتی رہیں گی۔ اس قیام کے دوران بھوپال کے نواب اقبال سے بہت متاثر ہوئے اور سر راس مسعود کی اس گزارش پر پانچ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا جس میں انھوں نے لکھا تھا۔ "دور حاضر کے سب سے بڑے مسلم زندہ شاعر سر محمد اقبال کے نام ہی سے آپ ضرور واقف ہوں گے ان کا نہ صرف ہماری قوم کی ذہنی و فکری زندگی میں بلند ترین مقام ہے بلکہ مغربی دنیا آج انھیں ادب وفلسفہ ہر دو کے میدان میں مسلمانان ہند کی ثقافت کا عظیم نمائندہ تسلیم کرتی ہیں۔ بدقسمتی سے گذشتہ بارہ ماہ سے وہ حلق کے ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہیں اور اس کی کوئی امید باقی نہیں کہ وہ آئندہ کبھی اپنی بیرسٹری کی پریکٹس جاری کر سکیں گے جو ان کی معاش کا واحد ذریعہ تھی۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''بھوپال میں برقی علاج کے دوسرے دور نے اقبال کی صحت پر اچھا اثر ڈالا۔ یوں تو وہ علاج کے مسائل میں مصروف تھے لیکن شیش محل میں انہوں نے قرآن کریم پر نوٹس لکھنے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ فکر اور استغراق میں ہمیشہ ڈوبے رہے۔ جب بھی موقع ملتا اور طبیعت میں آمد کا نزول ہوتا تو شعر بھی کہتے۔ چنانچہ شیش محل کے پرسکون ماحول میں اقبال نے پانچ نظمیں لکھیں جو اب ضرب کلیم کی زینت ہیں۔ صبح۔ مومن۔ ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام۔ نصیحت۔ اقوام شرق اور مسولینی وہ نظمیں ہیں جو اسی قیام کے دوران لکھی گئیں۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے اس مختصر قیام کے دوران کئی

"انیس سے اقبال تک"

ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور)

معاصر محققین اور ناقدین میں ڈاکٹر سید تقی عابدی اس بنا پر منفرد ہیں کہ ان کی تحقیقی مساعی اور تنقیدی کاوشیں ان کے پیشہ کی ممنون نہیں ہیں یعنی وہ نہ ایم اے اردو ہیں اور نہ ہی کسی کالج میں اردو کے پروفیسر۔ ان کے پیشہ کا ادب و نقد سے کسی طرح کا بھی تعلق نہیں بنتا۔ اسے یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر تو "بائی پاس آپریشن" کرتا ہے جبکہ شاعر یوں کیا ہوتا ہے:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نکلا

یا پھر بقول تقی

تیر سے تو دل میں بہت کام رفو کا نکلا

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا میں اس وجہ سے بھی قائل ہوں کہ کینیڈا میں رہائش کے باوجود انہوں نے اردو زبان و ادب سے ناطہ نہ توڑا۔ اکثر تارکین وطن شاعری سے محظوظ ہو کر یا خود شعر کہہ کر وطن سے ایک نوع کا جذباتی رشتہ استوار رکھتے ہیں بلکہ بعض تو ایسے جذباتی ہوتے ہیں کہ:

تجزیے میں ڈال کر تجزیہ دل چلے

ڈاکٹر تقی صاحب نے بھاری پتھر اٹھایا یعنی تحقیق و تنقید کو حرزِ جاں بنایا اور اس ضمن میں بھی مرثیہ کو خصوصی ترجیح دی۔ چنانچہ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے مدون کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں تحقیقی نوعیت کا کارآمد مواد فراہم کرتے ہوئے ایسی معلومات اور کوائف سامنے لائے جن سے ان دونوں عظیم شعرا کے بارے میں تنقید کا تناظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے اس ضمن میں "تجزیہ یادگار انیس" "مجتہد نظم مرزا دبیر" "سلک سلام دبیر" "مصحف فارسی دبیر" اور "مثنویات دبیر" جیسی کتابوں کا بطور خاص ذکر کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی سے میرا اولین تعارف برادرم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے توسط سے ہوا۔ انہوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے "تجزیہ یادگار انیس" کی تقریب رونمائی کا اہتمام لاہور میں کیا تو مجھے بھی موقع کی مناسبت سے مضمون تحریر کرنے کا حکم دیا۔ یہ کتاب ڈاکٹر سید تقی عابدی سے اولین تعارف کا ذریعہ بنی۔ میری خواہش ہے کہ میں جاری مضمون کے درمیان قارئین چہارسو کی خدمت میں وہ مختصر مضمون بھی پیش کروں۔

"ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں
بحرِ مواجِ فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں، ذرے کو انجم کر دوں
گنگ کو ماہرِ انداز تکلم کر دوں

درد سر ہوتا ہے، بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

جس طرح ہم زندگی کلیشوں کے سہارے بسر کر دیتے ہیں اس امر کا ادراک کیے بغیر کہ کلیشے بے رنگ و بو پھولوں جیسے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ادب و نقد میں بھی مشہور کلیشوں کا سکہ چلتا ہے اس امر کا تعین کیے بغیر کہ یہ کھوٹے سکے کس ٹکسال سے برآمد ہوئے۔ ادھر اُدھر کی مثالیں پیش کرنے سے احتراز کرتے ہوئے اور اپنے موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے صرف ایک کلیشے کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے۔ جس کی تردید میں حالی کے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے:

یہ کہہ دو کوئی بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا

مرثیہ اردو شاعری کی ایسی ہمہ جہت صنف ہے جس میں واقعات کا بیان Epic کا رنگ بھر دیتا ہے۔ فرد کی کشمکش، حق و باطل کی کشمکش ہے اسے ڈرامے کی سطح تک لے آتی ہے کردار نگاری افسانے کی تخلیقی فضا کے مماثل ہے۔ فطرت کی تصویر کشی محاکات کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے۔ اسلوب مثنوی کی یاد دلاتا ہے سوز و گداز اسے غزل نما بنا دیتا ہے تو المیہ کیتھارس کا موجب بنتا ہے اسی لیے مرثیہ سامعین سے آنسوؤں کا نذرانہ وصول کرتا ہے اور بجا کرتا ہے۔ بلاشبہ مرثیہ واحد ایسی صنف ہے جس میں بیشتر اصناف کا ذائقہ، رنگ اور خوشبو شامل ہے۔ ایسی ہمہ جہت صنف کے فنی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے میر انیس جیسے شاعر کی ضرورت تھی جنہوں نے صرف ایک مصرع میں اپنی شاعری کی اساس بننے والے عناصر کی نشان دہی کر دی۔ یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال! اگرچہ انیس یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں:

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ میں باندھوں

لیکن اس کے ساتھ بحیثیت شاعر کا احساس تعلّی سے باز بھی رکھتا ہے:

خاموش زباں، دعویٰ بے جا نہیں اچھا
ہو جس میں تکبر وہ سخن کیا نہیں اچھا
بس بس یہ غرور اور یہ دعویٰ نہیں اچھا
آپ اپنی ثنا واہ یہ شیوہ نہیں اچھا
کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

میر انیس نے درست کہا تھا۔ انہیں تعلّی کی ضرورت نہ تھی، وہ خالی برتن نہ تھے اس لیے عظمتِ فن کی گواہی زمانے نے دی۔ تنقید کی میزان میں تول کر تحقیق کے ہفت خواں طے کر کے اور پھر بھی یہ احساس باقی ۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا ہوا مولانا شبلی نعمانی کی "موازنہ انیس و دبیر" سے چلیں تو ڈاکٹر سید تقی عابدی کی "تجزیہ یادگار انیس" تک، اردو تحقیق و تنقید کی اہم ترین شخصیات نے

انیس کے شاعرانہ محاسن اجاگر کرنے میں اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اس لیے اقبالیات اور غالبیات کی مانند ادب "انیسیات" کی اصطلاح استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے۔

محققین کے بموجب اگرچہ میر انیس کی تاریخ پیدائش متنازعہ ہے لیکن اکثریت اسے تسلیم کرتی ہے کہ ۱۸۰۲ء میں فیض آباد کے محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے۔ گویا انیس کی پیدائش کو دو صدیاں بیت چکی ہیں اور اس مناسبت سے ۲۰۰۲ء میر انیس کا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔ سرکاری طور پر نہ سہی اہلِ ذوق کے لحاظ سے ہی، اہلِ علم، دانشوروں اور انیس شناسوں کا یہ اجتماع گویا سالِ انیس کی افتتاحی تقریب کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس موقع پر اگر یہ تجویز پیش کر دی جائے کہ اکادمی ادبیات پاکستان انیس کے کلام کے ایک ایڈیشن کا اجرا کر دے تو اسے بے محل نہ سمجھا جائے۔

یہ امر بھی خوش آئند ہے کہ سالِ انیس کا افتتاح کینیڈا میں مقیم ڈاکٹر سید تقی عابدی کی "تجزیۂ یادگارِ انیس" سے ہو رہا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر سید تقی عابدی میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن یہ کتاب انھیں محنت طلب، مشکل پسند بلکہ مشقت پسند محقق کے طور پر سامنے لاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انیس پر ناقدین کے مقالات جمع کر کے مرتب بن کر مصنف کی عزت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کتاب انیس کے اس معروف مرثیہ "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" کا ژرف نگاہی پر مبنی تحقیقی مطالعہ، تنقیدی تجزیہ اور شماریات پر مبنی تجزیاتی جائزہ ہے۔

مراثی انیس میں اس مرثیہ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ ناقدین کی اکثریت نے کسی نہ کسی لحاظ سے اس مرثیہ کے شاعرانہ محاسن اجاگر کیے ہیں۔ اسی طرح محقق مسعود حسن رضوی ادیب نے "شاہکارِ انیس" کے نام سے ۱۹۴۲ء میں اس مرثیہ کا دیدہ زیب مسعود ایڈیشن لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ لندن سے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ڈیوڈ میتھیوز نے اس کا انگریزی ترجمہ "The Battle of Karbala" کے نام سے شائع کیا جبکہ حسن علی خاں ناصر نے منظوم سندھی کے قالب میں اسے ڈھالا۔

سائن پیپر آرٹ پیپر پر دیدہ زیب انداز میں مطبوعہ پونے آٹھ سو صفحات کی یہ کتاب میر انیس کے احوال و آثار کے بارے میں محققین کے مستند حوالوں کی حامل ہے چنانچہ انیس اور خاندانِ انیس کے بارے میں ضروری معلومات اور کوائف حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا اصل کام ۔۔۔ ایسا کام جس پر ڈاکٹر صاحب نے یقیناً نصف شب کے چراغ جلائے ہوں گے ۔۔۔ اس مرثیہ کے ایک ایک بند کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ ایسا مطالعہ جو ظاہر ہے کہ شرح سے لے کر صنائع معنوی اور فصاحت و بلاغت سے وابستہ جملہ امور تک کا حامل ہے اور جس کے مطالعہ سے میر انیس کے اسلوب کی جمالیات کی متنوع جہات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ میر انیس نے اردو شعرا میں سب سے زیادہ تعداد میں الفاظ استعمال کیے اور اسے تسلیم بھی کیا جاتا رہا ہے لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جس محنت سے الفاظ شماری کی وہ حیرت زدہ کرنے کے ساتھ حالی کے دعوے کی شماریاتی تصدیق بھی کرا دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بموجب "میر انیس نے دو سو کے قریب مرثیے، سو سے زیادہ سلام، چھ سو کے قریب رباعیات" کہیں۔ مراثی کے ہزاروں بند اور ہزاروں الفاظ میر انیس کی پُرگوئی کی واضح دلیل ہیں۔

جس طرح ہر پھول کا جداگانہ رنگ اور جداگانہ بو ہوتی ہے اسی طرح ہر لفظ جداگانہ شخصیت کا حامل ہوتا ہے اس لیے ہر لفظ منفرد صوتی آہنگ اور نفسی تلازمات رکھتا ہے چنانچہ اسلوب کی جمالیات کا انحصار مناسب اور موزوں ترین الفاظ کے انتخاب پر ہوتا ہے، یا ہونا چاہیے، اس لیے شعروں کے انتخاب کی مانند الفاظ بھی رسوائی کا سبب بن سکتے ہیں۔ یہ تو ہوئی عام شاعری کی بات لیکن مرثیہ میں الفاظ اور ان کا انتخاب اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ یہ امام عالی مرتبت کی شہادت کے بیان کے لیے وقف ہے اس لیے جوش و غلو کے باوصف عقیدت و احترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔ اور یہی کام بطریقِ احسن میر انیس نے کیا۔

ڈاکٹر تقی ہمیں بتاتے ہیں کہ "۱۹۶ بند کے مرثیے میں کل الفاظ، جن میں تکرار شامل ہے، ان کی تعداد ۹۲۴۳ ہے۔ عربی الفاظ کی تعداد ۱۷۹۹، فارسی الفاظ کی تعداد ۱۹۶۸ اور اردو الفاظ کی تعداد ۵۴۷۶ ہے۔۔۔ اس مرثیے میں ۶۰ فیصد الفاظ اردو، بیس فیصد الفاظ فارسی اور انیس فی صد الفاظ عربی زبان کے ہیں۔" (ص: ۹۸)

اس لسانی تجزیے کے بعد اسما کا شماریاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے جس کے بموجب "اس ۱۹۶ بند کے مرثیہ میں امام حسینؑ کا نام، القاب اور کنیت وغیرہ ۱۴۳ سے زیادہ بار استعمال ہوئے ہیں۔ حسین ۱۳۱ بار اور شبیر صرف چار بار نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ چودہ سے زیادہ القاب اور کنایات سے امام حسینؑ کو خطاب کیا گیا ہے۔ حضرت محمدؐ کا نام، لقب یا کنیت ۲۹ بار نظر آتا ہے۔ حضرت زینب کا نام ۲۱ بار، حضرت فاطمہ کا ۱۷ بار، حضرت علی اکبر کا ۱۳ بار، حضرت عباس ۱۲ بار، حضرت سکینہ، حضرت بانو پانچ پانچ بار، حضرت جعفر طیار چار بار، حضرت علی اصغر تین بار، روح الامین تین بار، امام حسن، امام باقر، حضرت قاسم، حضرت یوسف دو دو بار، حضرت خلیل، حضرت سلیمان، حضرت یعقوب، حضرت داؤد کے علاوہ حضرت عقیل، حضرت مسلم، مالک اشتر، شہربانو، کلثوم، ام لیلیٰ اور فضہ کے نام ایک ایک بار اس مرثیہ میں لیے گئے ہیں۔" (ص: ۱۱۰)

"صرف اس ایک مرثیہ میں کل اضافات کے ۷۵۸ سے بھی زیادہ ہیں۔" (ص: ۱۸۳)

یہ مرعوب کن شماریاتی مطالعہ کمپیوٹر کی مدد سے ممکن ہوا یا دیدہ

دیری ہے ہم اس بحث میں نہیں پڑتے تاہم ڈاکٹر سید تقی عابدی کی لگن اور محنت سے یہ توقع بندھتی ہے کہ اسی انداز پر وہ میر انیس کے دیگر مراثی کا بھی تجزیاتی / شماریاتی مطالعہ کر ڈالیں گے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بھی "اسلوبیات انیس" میں میر انیس کے بعض مرثیوں کا اسلوبیاتی مطالعہ کر کے ان کے ذخیرہ الفاظ کے بارے میں دلچسپ نتائج پیش کیے ہیں۔

اس سے اساسی اہمیت کا یہ سوال جنم لیتا ہے کہ کیا شعر صرف لفظوں کا کھیل ہے؟ یہ درست کہ شعری تخلیقات کی اساس لفظوں پر استوار ہوتی ہے یہ نطق و تکلم اور تخلیق و فن بازیچۂ الفاظ ہی تو ہیں لیکن محض لفظ کے استعمال اور لفظ کے تخلیقی استعمال میں بہت فرق ہوتا ہے لفظ کے تخلیقی استعمال کا انحصار لفظ کی مزاج شناسی پر ہے لفظ کی مزاج شناسی ہی اسلوب کے جلال و جمال کے انداز متعین کرتی ہے اگرچہ اس ضمن میں ہر بڑے شاعر کا نام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے لیکن میر انیس کی کوئی بھی خاص حیثیت ہے لیکن کوئی جسے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شماریاتی مطالعہ مزید مستحکم بنا دیتا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ نے کلاسیک پر بحث کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ کسی بھی زبان / ادب / صنف میں کلاسیک کا درجہ حاصل کرنے والا شاعر اس زبان / ادب / صنف کے تمام تخلیقی امکانات کو یوں بروئے کار لاتا ہے کہ آنے والے شعراء کے لیے اس کے انداز و اسلوب میں اس سے بہتر بات کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اگر اس معیار پر میر انیس کو پرکھیں تو وہ "کم عیار" نہیں ثابت ہوتا۔ کم عیار کیا وہ تو ایلیٹ کے ساختہ کلاسیک کے معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا اور مرثیہ میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر لیتا ہے انیس نے مرثیہ میں اسلوب سازی سے جو جو تخلیقی جہتیں کیں ان کی بنا پر ساحری میں ممتاز ہونے کے ساتھ ساتھ انیس آج بھی اپنی مثال آپ ہے اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کی "تجزیہ یادگار انیس" دعویٰ میں دلیل کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔"

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے "علامہ اقبال کے طبی زاویے" کی صورت میں اقبالیات کی وادی میں قدم رکھا تو یہاں بھی اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اب "جہاں مرگ آید" کی صورت میں ایسا کارنامہ انجام دیا جسے بلامبالغہ اقبالیات میں اہم اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مستند حوالوں، مخطوط اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص ۲۰۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب "کتاب" سے بڑھ کر علامہ اقبال کی میڈیکل ہسٹری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ کام کوئی ماہر معالج ہی کر سکتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں مہنگی فیسوں والے ماہر ڈاکٹروں کی کمی نہیں جن کی مصروفیات کا یہ عالم ہے کہ وہ تین منٹوں سے پہلے کی ایک منٹ ملاقات کا خیال ہوتا ہے ان میں سے کسی کو اس قسم کی تحقیق کا خیال تک نہ آیا۔ خیال تو دور کی بات ان میں سے اکثریت کو اس کتاب کے مطالعہ کی فرصت بھی نہ ملی ہو گی۔

"جہاں مرگ آید" کا انداز میڈیکل جرنلز میں طبع ہونے والے تحقیقی مقالات جیسا ہے جس میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے علامہ کے پینتیس امراض کا دس اقسام میں جو گوشوارہ مدون کیا ہے اس کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ علامہ نے دنیا بھر کے امراض پال رکھے تھے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ اتنے امراض کے باوجود علامہ نے اتنی بھرپور اور فعال زندگی کیونکر بسر کی؟

علامہ اقبال نے اپنے بارے میں کہا تھا:

"بیا کہ مرد تن آسان تھا تن آسانوں کے کام آیا"

اس کتاب سے بھی اس کی توثیق ہو جاتی ہے یعنی علامہ اقبال کی روزمرہ کی زندگی تساہل پسندی کی طرف مائل تھی۔ (ص: ۳۱)

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس قدر امراض کی مندرجہ ذیل وجوہ بیان فرمائی ہیں:

(۱) علامہ اقبال نے کم از کم تیس پینتیس برس تک تمباکو نوشی کی۔

(۲) علامہ اقبال کی تساہل پسندی (SEDENTRY LIFE) جس میں ورزش وغیرہ کا بالکل دخل نہ تھا۔

(۳) مرغن اور پرچرب غذا کا استعمال مثلاً دیسی گھی وغیرہ۔

(۴) زیادہ نمک اور میٹھے کا مسلسل استعمال

(۵) اکسیر دل، معجونوں اور گٹھوں کا استعمال جو قلب و جگر کے لیے انتہائی مضر تھے۔ (ص: ۳۱)

علامہ اقبال کے امراض کی تشخیص میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ساٹھین اور دواؤں کے ضمن میں بھی مفصل معلومات فراہم کی ہیں۔

تمام امراض کے تجزیے اور تشخیص کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے والدین اور اولادوں کی اوسط عمر کا گوشوارہ مرتب کر کے یہ چونکا دینے والا نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علامہ اقبال نے کم و بیش "تیس برس کم عمر پائی" (ص: ۱۴۲)

"علامہ اقبال کی نسبتاً کم عمری کی وجہ بچپن سے کمزور طبیعت، تساہل پسندی، ورزش سے گریز، فکری اور STRESSFUL اعصاب شکار زدہ زندگی، تمباکو نوشی، بد پرہیزی، گٹھوں کا استعمال، ULTRA VIOLET RAY'S کا بے جا استعمال، نقرس کی دوائیں، گردے، دل اور پھیپھڑوں کی بیماریاں اور ان کا یونانی علاج جس میں DRUG EFFECTS کے مضر اثرات شامل ہو سکتے ہیں۔" (ص: ۱۴۳-۱۴۴)

آج جبکہ اقبالیات محض کلاس نوٹس قسم کے مضامین کی وجہ سے کلیشوں اور تکرار و تواتر کی پیدا کردہ یبوست کا شکار ہے تو ایسے میں "جہاں مرگ آید" تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوتی ہے اور یہ تازہ ہوا کا جھونکا ہماری جانب پہنچانے والے کینیڈا میں مقیم ڈاکٹر سید تقی عابدی ہیں جن کے لیے دل سے جتنی بھی دعائیں اور نیک تمنائیں کی جائیں کم ہیں۔

پیہم موج امکانی میں

پروفیسر صادق (دہلی بھارت)

بیسویں صدی میں اردو تحقیق نے جتنی ترقی کی وہ حیرت انگیز ہے اور قابلِ قدر و تحسین بھی کہ اس صدی میں ایک سے بڑھ کر ایک ایسے محقق سامنے آتے رہے جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے اس چمن کی آبیاری کی اور اسے قابلِ رشک بنا دیا۔ مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، امتیاز علی عرشی، مسعود حسین رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، نصیر الدین ہاشمی، محی الدین زور، مالک رام، مختار الدین احمد آرزو، گیان چند جین، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں اور تنویر احمد علوی وغیرہ کس کس کا نام لیا جائے کہ ان سب نے اپنی خداداد ذہانت و صلاحیت کی بنیاد پر اپنی اپنی افتادِ طبع اور دلچسپی کے مطابق اپنے اپنے میدانوں میں ناقابلِ فراموش کارنامے سرانجام دے کر تاریخِ ادبِ اردو کے کئی تاریک گوشے روشن کر دیے۔ لیکن یہی ہوا کہ پرانے نابغہ جتنی تیزی سے اٹھتے چلے جاتے ہیں ان کی خالی جگہیں پُر کرنے کے لیے اسی مناسبت سے نئے لوگ سامنے نہیں آ رہے ہیں۔ یوں تو برِصغیر کی کئی یونیورسٹیوں میں اہم تحقیقی کام ہوتے رہے ہیں نئے نئے موضوعات پر کئی اہم مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ تاہم رفتارِ تحقیق خاصی تیز ہونے کے باوجود قابلِ قدر معیاری کام کم ہی ہوئے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں طلباء اور اساتذہ کے ہاتھوں اس فن کی جو مٹی پلید ہوئی ہے اسے دیکھ کر خوشی کم اور افسوس زیادہ ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے محققین نے اتنے اہم اور یادگار کارنامے سرانجام دیے جنھیں دیکھ کر اہلِ ادب عش عش کرتے ہیں لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بیشتر اہم موضوعات کے تحقیقی امکانات کو بروئے کار لا چکے ہیں جس کے نتیجے میں بعد میں آنے والی نسل کے محققین کے لیے زیادہ کچھ دکھانے کو نہیں رہ گیا یا یوں کہیے کہ آگے کے مراحل دشوار تر ہو گئے۔ لیکن جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے کہ تحقیق میں کبھی حرفِ آخر نہیں ہوتا کہ حرفِ آخر سے آگے بھی کچھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی اس حرفِ آخر سے آگے کے تحقیق نگار ہیں جنھوں نے اپنے ذوق و جستجو کے بل بوتے پر گذشتہ چند برسوں میں یکے بعد دیگرے کئی کتابیں پیش کر کے تحقیق کے میدان میں اپنے لیے جگہ بنالی ہے۔ میر انیس، مرزا دبیر، انشاء اللہ خاں انشاء اور اقبال ان کی تحقیق و تنقید کے خصوصی محور رہے ہیں۔ "کائناتِ نجم" کی ترتیب و تدوین ان کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ علاوہ ازیں رباعیاتِ دبیر اور فانی بدایونی پر بھی وہ کام کر رہے ہیں۔

انشاء اللہ خاں انشاء کے رونا بچے کے اردو ترجمے کے ذریعے میرے استادِ محترم ڈاکٹر سید نعیم الدین نے چند نئے حقائق پیش کیے تھے۔ عابد پشاوری نے انشاء پر مزید تحقیق کر کے کئی مضامینِ نو کے انبار لگا دیے اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب انشاء پر مزید کام کی گنجائش نہیں رہی لیکن سید تقی عابدی کی کتاب چند نئے حقائق لے کر منظرِ عام پر آئی۔ اسی طرح میر انیس اور مرزا دبیر پر بھی اتنا کچھ لکھا جا چکا تھا کہ لگتا تھا کہ اب ان موضوعات پر تحقیق کے نئے دروازے نہیں کھلنے والے لیکن تقی عابدی نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ بالخصوص دبیر اور کلامِ دبیر سے متعلق ان کی پانچ چھ کتابیں پچھلے برس منظرِ عام پر آئیں تو تحقیق کے نئے افق روشن ہو گئے۔ ان میں دبیر سے متعلق تصانیف میں "مثنویاتِ دبیر" اور "ابواب المصائب" بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ مرزا دبیر کو عموماً مرثیہ نگاری تک محدود کر دیا گیا ہے اردو کے بیشتر اہم محققین ان مثنویوں کے وجود سے ناواقف رہے ہیں بس معدودے چند نے ہی ان کی دو تین مثنویوں کا ذکر کیا ہے باقی نے ان کی مثنویوں سے صرفِ نظر کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس معاملے میں اردو کا رنگین بھی مثنوی نگار دبیر کو نظر انداز کر گئے لیکن سید تقی عابدی نے اپنی مرتبہ کتاب "مثنویاتِ دبیر" میں ان کی چھوٹی بڑی آٹھ مثنویاں شائع کر کے دبیر کو اردو کے اہم مثنوی نگار شعراء کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جن میں دفترِ ماتم کی جلد ۱۵ سے ماخوذ ۲۲۱۱ اشعار پر مشتمل مثنوی "احسن القصص" کا مکمل متن مع لغات شامل ہے اور بخطِ دبیر ۵۱۸ اشعار پر مشتمل ایک بے عنوان نایاب مثنوی کا مکمل مخطوطہ بھی پیش ہے۔

اس مثنوی کی نشاندہی سب سے پہلے محمد زماں آزردہ نے کی تھی۔ تقی عابدی کے مطابق اس مثنوی کا پورا مخطوطہ آغا گوہر دبیر کے فرزند مرزا صادق مرحوم سے حاصل ہوا اور.... ہماری تحقیق اور دبیر مرحوم کے مستند کاغذات سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ مثنوی دبیر ہی کے خط سے لکھی گئی جس پر دبیر نے نظرِ ثانی بھی کی اور چند مصرعوں میں تبدیلی اور چند اشعار کو قلم زد بھی کر دیا ہے۔

اسی طرح مرزا دبیر کی ایک اہم کتاب "ابواب المصائب" ہے۔ یہ ان کی واحد نثری تصنیف ہے جو وقت اور حالات کی ستم ظریفی سے کچھ اس طرح نظر انداز ہوئی کہ اردو ادب کی تاریخوں اور نثری ادب پر قلم کی گئی اہم ترین کتابوں تک میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا جب کہ رجب علی بیگ سرور کے "فسانۂ عجائب" کے بعد یہ لکھنوی نثر کی دوسری اہم کڑی ہے جسے مذہبی کتاب سمجھ کر عرصہ دراز تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ افضل حسین ثابت، محمد زماں آزردہ، اکبر حیدری کشمیری، سید مظفر حسین فاروقی وغیرہ نے "ابواب المصائب" کا ذکر کیا ہے۔ ابواب المصائب چھ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں پانچ پانچ فصلوں کا التزام رکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں مرزا دبیر نے سورۂ یوسف کی تشریح کرتے ہوئے ان کے مصائب کا موازنہ حضرت حسین اور اہلِ بیت کے مصائب کے ساتھ کیا ہے۔ معروف ماہرِ دکنیات سیدہ جعفر کی مرتبہ کتاب "یوسف زلیخا" میں

باقی صفحہ نمبر [illegible] پر ملاحظہ فرمائیں

انشا فہمی کا ایک سنگِ میل

اشفاق حسین (کینیڈا)

یوں تو اردو کی نئی بستیوں خصوصاً شمالی امریکہ میں شعر و شاعری کے چراغ بہت ابتدا ہی سے جگمگا رہے ہیں لیکن نثر کے میدان میں ابھی بڑی گنجائش پائی جاتی ہے۔

سنجیدہ ادب تخلیق کرنے والے اپنے آپ کو صرف تخلیقی شعر تک ہی محدود نہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اردو کے مخصوص سماجی حالات کی روشنی میں شاعری کے پودے نے قبولیتِ عام کا درجہ حاصل کر لیا اور اس کی شاخوں پر بہت سے نئے بوٹے اور پھل پھول نکل آئے لیکن اس زبان کا دامن نثر کے سرمائے سے بھی ہمیشہ مالامال رہا ہے۔ صرف تخلیقی نثر ہی نہیں بلکہ تنقید و تحقیق کے کمالات بھی اس زبان میں پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی چمک دمک دکھلا رہے ہیں۔ البتہ شمالی امریکہ میں بیشتر لکھنے والے شاعری کے پودے کی آبیاری میں زیادہ مصروف نظر آتے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے ان میں سے بیشتر لکھنے والے نثر کی طرف بھی مائل ہوئے ہیں اور اب یہاں کے ادبی سرمائے میں نثری کاوشوں کے نئے بوٹے بھی نظر آنے لگے ہیں۔ یہ منظر بہت زیادہ امید افزا نہ ہوتے ہوئے بھی قابلِ توجہ ضرور ہے۔ اس منظر میں تخلیقی نثر کی کرشمہ کاریوں کو جن میں ناول، افسانہ، ڈراما وغیرہ شامل ہیں بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے البتہ ستم ظریفی کوشش کر کے دیکھا جائے تو تحقیق کا میدان بالکل صاف نظر آتا ہے۔ اس کمی کو کینیڈا میں مقیم اردو زبان و ادب کے بے مثال خدمت گزار ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے پورا کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان کا تعلق طب کی دنیا سے ہے مگر اردو کے تحقیقی سرمائے پر ان کی نظر بڑی گہری ہے۔ اس بات کا اندازہ ان کی تحقیقی تصانیف سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس میدان میں ان کی خدمات پاک و ہند کے کسی بھی محقق اور نقاد سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے تن تنہا اس میدان میں جو کام کیا ہے اس نے شمالی امریکہ کے تحقیقی منظرنامے کو خاصا معتبر بنا دیا ہے۔

زیرِ نظر تصنیف "شاعرِ شیریں بیاں انشاء اللہ خاں" بھی ایک ایسی یادگار تحقیقی کتاب ہے اور اس کے مطالعے کے بعد یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمالی امریکہ میں اردو کا تحقیقی سرمایہ اگرچہ تعداد میں کم ہے مگر معیار میں یقیناً کسی طرح بھی کم رتبہ نہیں ہے۔

کسی بھی مورخ یا محقق کے کام کو دو طرح سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کیا مصنف نے مرحلہ وار مکمل تحقیق کے بعد کوئی نتیجہ نکالا ہے اور اپنی رائے قائم کی یا یہ کہ اپنے مطالعے اور مشاہدے کے نتیجے میں پہلے سے قائم کی ہوئی کسی رائے کے اثبات میں دلیلیں پیش کی ہیں؟ انشاء اللہ خان انشا کے بارے میں ڈاکٹر تقی عابدی کا پیمانہ دوسری طرح کی شراب سے بھرا ہوا ہے۔ اسے انشا سے ان کی ایک عقیدتِ خاص کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کہیں کہیں ایک غیر جانبدار محقق پسِ پردہ چلا جاتا ہے اور ایک چاہنے والے اور مداح کا سراپا آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے مگر تحقیقی فضا کے طلبگاروں کے لئے یہ صورت کوئی بہت خوش کن صورت نہیں لیکن اس سے ہٹ کر سوچنے والوں کا خیال ہے کہ کسی بھی لکھنے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ جس کے بارے میں لکھ رہا ہو اس کی شخصیت کے طلسم سے اپنے آپ کو بالکل علیحدہ کر سکے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب بھی انشا کی شخصیت میں پائی جانے والی محبوبیت کے طلسم سے خود کو علیحدہ نہ کر سکے۔ یہ خصوصیت جہاں ایک طرف ان کی اپنی شخصیت کے شفاف ہونے کی دلیل ہے تو دوسری طرف خود انشا کی شخصیت کو بھی ابھارتی ہے۔ ایسے موقع پر وہ مصحفی کی زبان میں یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ:

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

اس پسندیدگی اور محبت بلکہ عقیدت کے باوجود ان کی تحقیق کہیں بھی اعتدال کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ وہ شروع سے آخر تک معروضی انداز میں انشاء کے فن، ان کی شخصیت، ان کے عہد اور ان کے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں اور نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنے پڑھنے والے کو اس راستے کی طرف لے جاتے ہیں جسے وہ تحقیقاتِ انشا کے سلسلے میں سیدھا اور سچا راستہ سمجھتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ایک صفحہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر وہ پڑھنے والے کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ جس طرح چڑیا اپنے بچوں کو اپنی چونچ سے دانہ کھلاتے ہیں بالکل اسی طرح عابدی صاحب انشا کے بارے میں ایک ایک معلومات ایک ایک جزئیات اور ایک ایک پہلو کو اپنے قاری کے ذہن میں اتارتے ہیں۔ اس پورے عمل میں آپ ان سے متفق نہ ہوں تب بھی ان کی صداقتِ رائے سے انکار نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے انشا کا مطالعہ بہت سلسلہ وار اور بڑی جامعیت سے کیا ہے۔ ان کا مرکزی نقطۂ نظر یہ ہے کہ انشا کی شاعری اور ان کے فن پر تنقیدی اور تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ انشا کی ہجو بیانی کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ انشا کا شمار اردو کے ان آٹھ دس شاعروں میں ہوتا ہے جو دو ڈھائی صدی سے اردو شاعری کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں لیکن ان تمام شاعروں میں انشا کے فن پر سب سے کم کام ہوا ہے۔ تذکرہ نگاروں، تنقید نگاروں اور محققوں نے انشا اور ان کے حریفوں کے ساتھ معرکہ آرائی پر دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے لیکن ان کے فن پر ایک دو گھسے پٹے جملے لکھ کر انشا پر ہی نہیں بلکہ تمام اردو شاعری پر ظلم کیا ہے۔ تذکرہ ہندی گویان میں مصحفی تو حریف ہی تھے وہ کیا کہتے؟ تذکرہ مجموعۂ نغز میں قدرت اللہ قاسم تو انشا کے چھپے دشمن ہی تھے وہ

بھی کیا لکھے؟ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ جن کا گلشن بے خار جو دراصل گلشن بے کار اس لئے ہے کہ اس میں چھ سو شاعروں میں سے صرف چھ شاعروں پر تبصرہ ہے۔ جن میں خود نواب موصوف اور ان کے چار ہم عصر غالب، مومن، آزردہ اور صہبائی اور دو شاعرات جن میں شیفتہ اور مومن کی محبوبائیں بھی شامل ہیں۔

ان چھ سطروں میں عابدی صاحب نے انشا کے فن اور شخصیت پر قلم اٹھانے والے تین بہت بڑے بتوں کو جتنی بے رحمی سے منہ کے بل گرایا ہے اس پر ان کی حق گوئی اور اظہار صداقت کی داد نہ دینا سراسر نا انصافی ہوگی۔ لیکن یہ معاملہ صرف جذباتی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ان کی محققانہ کاوشیں بولتی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے پورے دلائل کے ساتھ شیفتہ اور آزاد پر اپنی گرفت کی ہے۔ اس باب میں عابدی صاحب کا استدلال یہ ہے کہ "شیفتہ نے اپنے تذکرے میں ایک ایسا فتویٰ صادر کر دیا جو ڈیڑھ صدی گزرنے پر بھی ادب کی شریعت میں منسوخ نہ ہو سکا۔ بقول شیفتہ "انشا بر صنف سخن راہ طریق راسخ نگفتہ" یہ طریق سے مراد وقار کا طریقہ کار ہے۔ یعنی شیفتہ، انشا جیسے نابغہ روزگار تخلیق کار کو خود اپنے جیسا اکتسابی شاعر کہہ بیٹھے جو فکر کا فقیر اور وقار کا مرید ہو کر جاتا۔"

اسی طرح عابدی صاحب نے آزاد پر بھی کڑی گرفت کی ہے۔ محمد حسین آزاد تو آب حیات میں فراغ کے شاگرد دبتاب کے جملے کے سحر سے جاگ نہ سکے کہ "انشا اللہ خان کے فضل و کمال کو شاعری نے اور شاعری کو سعادت علی خان کی مصاحبت نے ڈبویا" بقول عابدی صاحب یہ جملہ غلط بیانی ہے اس لئے کہ انشا کوئی عالم گیر یا دشاہ یا مسعود و محمود نہ تھے بلکہ ان کا فضل و کمال ان کی شاعری ہی تھی اور اسی سے ان کی شہرت کی تخلیق بھی وجود میں آئی اور آج دو سو سال گزرنے کے بعد بھی انشا صرف شعر و ادب کی تخلیق سے ہمارے درمیان زندہ ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انشا جیسی شخصیت نابغہ روزگار تھی اور ایسی شخصیت نہ کسی کے بتائے ہوئے راستے پر آنکھ بند کر کے چلتی ہے اور نہ ہی کسی سے رہنمائی کی طالب ہوتی ہے۔ البتہ دوسرے ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھئے کہ انشا کے ادبی معرکے بہت مشہور ہیں ایک معرکہ ان کا میر قدرت اللہ قاسم سے ہوا اس معرکے کو اگر صحیح ایمان کی روشنی میں دیکھا جائے تو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اپنی راہ خود تلاش کرنے والا کون ہے اور کون دوسروں کی راہ پر چلتا ہے؟ انشا نے کسی مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس کی ردیف تھی "پانچوں" انشا کی ذہین اور طباع شخصیت نے ردیف کو نبھانے کا حق ادا کر دیا۔ چند اشعار جو عابدی صاحب نے نقل کئے ہیں انہیں میں دوبارہ نقل کرنا چاہتا ہوں تا کہ جنس اور غیر جنس کا فرق واضح ہو سکے۔

چشم و ادا و غمزہ شوخی و ناز پانچوں
دشمن ہیں میرے جی کے بندہ نواز پانچوں

آرام و صبر و طاقت ہوش و حیا کہاں پھر
بے دل کے ساتھ یہ بھی اس عشوہ ساز پانچوں

مت پوچھ کار انشا ہجر و وصال میں کچھ
صبر و تپش و وحشت عجز و نیاز پانچوں

کہتے ہیں کہ انشا کی اس قادر الکلامی پر انہیں بے حد داد ملی اور ان کے حریفوں کے منہ اتر گئے۔ چنانچہ اگلے مشاعرے میں قدرت اللہ قاسم نے اپنا زور ہنر دکھانے کے لیے "ساتوں" کی ردیف میں غزل کہی۔ ظاہر ہے کہ یہ چبے ہوئے نوالے کو دوبارہ چبایا تھا مگر اصل پھر اصل ہے انشا نے اپنی قادر الکلامی کے بل بوتے پر جواباً "آٹھوں" اور پھر یہی نہیں بلکہ "بیسوں" اور "تیسوں" جیسی مشکل ترین زمینوں میں غزلیں کہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو آدمی فطرتاً طباع اور ذہین ہوتا ہے وہ اپنا راستہ خود بناتا ہے۔

انشا کے ساتھ صورت حال کچھ ایسی ہوئی کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر بہت دور تک چلے گئے۔ اس طرح کچھ لوگوں کا خیال ہے اور شاید کسی حد تک میرے نزدیک صحیح بھی ہے کہ انشا میں جو اصلی جوہر تھے وہ پوری طرح سامنے نہ آ سکے۔ اس کے برخلاف تقی عابدی صاحب کا خیال ہے کہ ان کے جوہر سامنے تو آئے مگر ان کے ناقدین نے ان پر پردہ ڈال دیا اور چونکہ عابدی صاحب اپنی رائے پر کامل یقین رکھتے ہیں اس لئے انشا پر یہ تحقیقی مقالہ لکھ کر انہوں نے اپنی انشا پسندی اور حق پرستی کا کھلا ثبوت فراہم کر دیا ہے اس محنت، لگن اور محققانہ کام پر میں انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں۔

"ایلیڈ" اور "اوڈیسی" اہل یونان کے لئے بائبل کا درجہ رکھتی ہیں۔ قدیم ایتھنز میں ہر چار سال بعد ایک بڑا میلہ لگتا تھا جس میں بادشاہ وقت ان دونوں رزمیوں کو سٹیج کرواتے تھے۔ ہومر اس یونانی تہذیب کا ریکارڈ کیپر ہے جو ۳۲۰ قبل مسیح میں صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئی۔ "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" یونانی شاعری کے قدیم ترین نمونوں میں سے ہیں جن کے زمانہ تحریر کا تعین نہایت درجہ مشکل ہے۔

۔اقتباس۔
"ہومر کے لافانی رزمیے"
از
مرزا حامد بیگ

"عزت وہی عزت ہے"

سلمان اطہر جاوید (حیدرآباد دکن)

علمی و ادبی تحقیق کے سلسلے میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی مثال اگر کسی سے دی جا سکتی ہے تو وہ صرف ڈاکٹر سید تقی عابدی ہی ہیں۔ برصغیر سے دور، بہت دور، اردو کی نئی بستیوں میں شعر و ادب کے جو چند چراغ روشن ہیں ان میں ڈاکٹر سید تقی عابدی ایک اہم اور امتیازی نام ہے۔ انہوں نے ایسے موضوعات پر جن پر بہت کم لکھا گیا ہے توجہ دی اور غیر معمولی تحقیق کے بعد تدوین و تالیف کر کے کئی کتابیں منظر عام پر لائیں جو شاید بہت کم سے ممکن ہوتا۔ شعر و ادب کے تعلق سے ان کے عزم و ہمت، جذبہ و شوق، لگن اور اخلاص کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے تحقیق کے دشوار گزار اور مراحل اور صبر طلب مقامات کو بھی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ طے کر لیا۔ سید تقی عابدی کی تحقیق و تدوین و تالیف کی فہرست نہایت طویل ہے صرف چند کے نام ہیں۔ مثلاً بادشاہ خاں مثنا، اظہار الحق، مجتہد نظم مرزا دبیر، سلک سلام دبیر، تجزیہ یادگار انیس، مصحف فارسی دبیر، مثنویات دبیر، کائنات نجم، در دریائے نجف، ناشر ماتم، نقش لکھنوی اور چہرگ آئینہ وغیرہ۔ اور اب انہوں نے کلام دبیر کے سلسلے میں "رباعیات دبیر" پیش کی ہے ممکن ہے مستقبل میں دبیر کی اور رباعیات کا بھی پتہ چلے لیکن رباعیات دبیر کا یہ مجموعہ اپنی مثال آپ ہے۔ دبیر کے پہلے سوانح نگار صفدر علی ہیں۔ انہوں نے سوانح "خمس النجی" میں اور مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں رباعیات کی تعداد نہیں بتائی۔ "حیات دبیر" کے مصنف ثابت لکھنوی نے تقریباً سوا دو سو رباعیات شائع کیں۔ نیر لکھنوی نے بھی 197 لکھیں۔ فرمان لکھنوی نے اپنی تصنیف "اردو رباعی" میں دبیر کی رباعیوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ بتائی۔ سلام سندیلوی نے دبیر کی رباعیات کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب بتائی۔ نفیس فاطمہ نے "دبیر سے کچھ رباعیاں بھی یادگار ہیں" لکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب اندازے ہیں۔ البتہ محمد زماں آزردہ نے "دفتر ماتم" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "دفتر ماتم" کی بیسویں جلد میں 1332 رباعیات ہیں۔ سید تقی عابدی کے مرتبہ "رباعیات دبیر" میں 1323 رباعیات ہیں۔ تقی عابدی نے دبیر کی رباعیات پر اظہار خیال کرنے سے قبل اپنے مقدمہ میں "فن رباعی گوئی" اور اردو (بلکہ عربی اور فارسی) میں رباعی گوئی پر نہایت جامعیت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ سید عقیل الغروی کا "پیش لفظ" بھی معلومات آفریں ہے۔ صنف رباعی کو عربوں کی ایجاد قرار دینے سے سید سلیمان ندوی اور امداد امام اثر سے اختلاف کرتے ہوئے انہوں نے محمود شیرانی کے خیال سے اتفاق کیا ہے کہ "رباعی کسی شخص کی ایجاد کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ ارتقا یافتہ شکل ہے قدیم چار بیتی کی جو کہ بحر ہزج مربع اخرم و اخرب میں لکھی جاتی تھی۔ ان نظموں میں صدر و ابتداء میں اخرب و مکفوف، اخرب و مقبوض کا اختلاف جائز سمجھا جاتا تھا جو چار بیتی کے ہر مصرعہ میں کار فرما ہے۔ جس کی بنا پر پہلے مصرع کے شروع میں مفعول کے مقابلے میں دوسرے مصرع کے شروع میں مفاعل یا مفاعیل آ جاتا ہے۔ کہ بحر ہزج عربی میں مربع الارکان مستعمل ہے جب عربی عروض فارسی اختیار کی گئی تو ضروری ہے کہ ابتداء میں اشعار بحر ہزج کے مربع لکھے جاتے چنانچہ رباعی بھی مربع میں لکھی گئی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے مقدمہ میں رباعی کو ایرانیوں کی ایجاد قرار دیا ہے اور اس خصوص میں کوئی (۹) مستند حوالے دیے ہیں اور بعض روایتوں کا سہارا لیتے ہوئے پہلی رباعی کی نشان دہی کی ہے۔ انہوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہندی میں چوپائی، سنسکرت میں چار چرن، پشتو میں چار بیتہ اور انگریزی میں کواٹرن رباعی سے ملتی جلتی چیز ہے۔ سید تقی عابدی نے نہایت گہرائی اور گیرائی سے تحقیق سے کام لے کر اپنے مقدمے کو وقیع اور اہمیت کا حامل بنا دیا ہے۔ اردو میں رباعی کے تعلق سے تو اس مقدمہ کی اہمیت اور فزوں ہو جاتی ہے۔ اردو میں رباعی پر یہ ایک جامع تحریر ہے۔ انہوں نے تاجدار گولکنڈہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو رباعی کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تسلیم شدہ امر ہے۔ اور پھر وجہی، سراج، ولی، میر، سودا، میر حسن وغیرہ کی رباعیات کا تفصیلی جائزہ ہے۔ ذوق، داغ، شاہ، جرأت، مومن، منیر شکوہ آبادی، فراق سے لے کر مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی رباعیوں کی تعداد درج کر دی ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ اردو میں سب سے زیادہ رباعیات شاہ تمکین دہلوی نے لکھی ہیں جن کی تعداد 1900 ہے لیکن تقی عابدی کیفیت کے اعتبار سے دبیر کی رباعیات کو افضل قرار دیتے ہیں۔ ان کے بموجب شاہ تمکین کی رباعیات دبیر کی رباعیات کے سامنے کیفیت میں بہت پائیں ہیں۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ دبیر کی رباعیات کی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں اوروں نے تو کیا خود دبیر کے گھرانے والوں نے بھی توجہ نہیں دی۔ دبیر کی رباعیات کے تعلق سے سید تقی عابدی لکھتے ہیں: دبیر کی رباعیات میں آسان اور عام فہم تشبیہات، مکمل استعاراتی نظام، کنایات اور مجاز مرسل کی چاشنی نظر آتی ہے۔ علم بدیع کی تقریباً تمام معنوی اور لفظی صنعتیں ان کے پاس موجود ہیں"۔ چنانچہ تقی عابدی نے صنعت سیاق الاعداد، صنعت تاریخ گوئی، صنعت اعداد، ایہام، صنعت مذہب کلامی اور دیگر صنعتوں کے حوالے سے رباعیات دبیر کا جائزہ لیا ہے اور وہ بھی اس رائے سے متفق ہیں کہ اگر دبیر کی رباعیوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا گیا تو انہیں اردو ادب کا سب سے بڑا رباعی گو تسلیم کرنا پڑے گا۔ انیس بھی اس میدان میں ان کے حریف ثابت نہ ہو سکیں گے۔ دبیر کی استادی اور ان کی قدرت کلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے علامہ عقیل نے بھی اپنے اس موقف کا اظہار کیا ہے کہ دبیر نے رباعی کے نہایت محدود عروضی چوکھٹے میں خوب خوب زور طبیعت صرف کیا۔ ان

کے یہاں زبان کی پختگی، مصرعوں کی برجستگی، آہنگ، عروض کا توازن مضامین کا
تنوع اور طرح طرح کا تخیل قابل دید ہے۔ قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ڈاکٹر سید تقی
عابدی نے نہ صرف رباعیات دبیر کی تحقیق، تدوین اور تہذیب کی بلکہ انہیں
مختلف مضامین جیسے حمدیہ، نعتیہ، حقیقی، صوفی، اخلاقی، مسلکی، اعتقادی اور رثائی
میں تقسیم کر کے مشکل الفاظ کے معنی بھی دیئے ہیں اور کہیں کہیں ان کی تشریح بھی
کردی ہے۔ یہاں تک کہ رباعیات کی جدول دیتے ہوئے لکھا ہے: "دبیر اردو کا
وہ تنہا عظیم شاعر ہے جس نے اپنی رباعیات میں اتنے مضامین برتے ہیں کہ راقم
نے ان مضامین سے جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے ایک تجزیہ وار جدول بنایا ہے
تاکہ آسانی کے ساتھ دبیر کے مضامین کی بوقلمونی کا احساس ہو سکے"۔ یہ جدول
اس زاویے سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ فوراً یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس مضمون
کے تحت رباعیات کی تعداد کتنی ہے۔ رباعیات کے اس مجموعہ کا ایک نادر پہلو یہ
بھی ہے کہ سید تقی عابدی نے مرزا دبیر کا زندگی نامہ بھی شامل کر دیا ہے۔ دبیر کے
حالات زندگی ۔۔۔ تفصیل سے مل جاتے ہیں اور ان کی شخصیت اور شاعری پر
یونیورسٹیوں اور ان سے باہر جو کام ہوا ہے ان سے بھی دبیر کی زندگی تفصیل سے
سامنے آتی ہے لیکن تقی عابدی نے انفرادیت کا ثبوت دیتے ہوئے دبیر کے
حالات زندگی اور ان کی شخصیت اور فن کے کئی گوشوں کو منور کیا ہے۔ ان کے تخلص
کے تعین اور ان کے پہلے قطعہ کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ دبیر کا پہلا قطعہ جو
انھوں نے میر ضمیر کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوتے وقت سنایا تھا یہ ہے:

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

نیز ان کی تاریخ و مقام پیدائش، ان کے جد اعلیٰ شیرازی، ان کی
شاعرانہ عظمت، ان کی ذو بحرین اور ذو قافیتین مثنوی، دبیر کی شریک حیات جو
انشاء اللہ خان انشاء کی حقیقی نواسی تھیں، اولاد، اساتذہ، ان کی تصویر، آواز، لباس،
نظام الاوقات، آداب محفل، حافظہ اور ان کے اخلاق و کردار۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی
نے دبیر کے اخلاق و کردار کے بارے میں محمد حسین آزاد کے حوالے سے لکھا ہے
کہ دبیر کی سلامت روی، پرہیزگاری، مسافر نوازی اور سخاوت نے صنف کمال کو
زیادہ تر رونق دی تھی" اور شاد عظیم آبادی کے حوالے سے راقم طراز ہیں۔ "دوسروں
کی امداد کرنا، حاجت مندوں کی حاجت کو پورا کرنا وہ عبادت تصور کرتے تھے۔ تقی
عابدی نے رحم و مروت، سخاوت، مہمان نوازی، زکوٰۃ و خیرات کے تعلق سے بھی
دبیر کے کئی واقعات درج کئے ہیں۔ اسی طرح ان کی متانت، عدالت، قناعت،
احترام اور دل جوئی کے خصوص میں بھی بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان
کی ادبی زندگی ان کے پہلے اور آخری مرثیے، اپنے استاد میر ضمیر سے رنجش اور پھر
صفائی، ان کے پڑھنے کے انداز اور ان کے طریقۂ تصنیف کے بارے میں بھی
روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے "حیات دبیر" کے مولف ثابت لکھنوی
کے بیان کردہ مرزا دبیر کی ایجادات شامل کتاب کرتے ہوئے انیس پر دبیر کی
برتری کا پہلو نکال لیا ہے۔ یہ اوراق خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل
ہیں۔ ایسے اور دبیر ہے کس زمانے میں نہیں رہے آج بھی ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی
عابدی نے اپنے مقدمہ میں دبیر کی شاعرانہ عظمت پر مہر لگادی ہے لیکن وہ نہ ایسے
ہیں اور نہ دبیر ہے۔ انہوں نے از حد معروضیت کے ساتھ دبیر کی رباعی گوئی پر قلم
اٹھایا۔ قبل ازیں انہوں نے تجزیہ نگار انیس جیسی ظاہری و معنوی طور پر گراں قدر
کتاب شائع کی ہے جس سے ہمارے دو عظیم المرتبت شاعروں کے بارے میں
ان کی معروضی فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں دبیر کی یہ تین رباعیات

آدم نے شرف خیر بشر سے پایا
رشتہ ایماں کا اس گہر سے پایا
دو میم محمدؐ سے جہاں روشن ہے
مضمون یہ دل شمس و قمر سے پایا

جو قصر کرے حرص کو قیصر وہ ہے
تکیہ ہے جسے حق پہ تونگر وہ ہے
آئینہ سکندر نے بنایا تو کیا؟
دل جس کا ہے آئینہ سکندر وہ ہے

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بیکار تشخص ہے تصنع بے سود
عزت وہی عزت ہے جو تو دیتا ہے

☆

"دیکھنا فقط یہ ہوتا ہے کہ اللہ چاہتا کیا ہے۔ باقی سب تفصیل
ہے۔ افراد اور اقوام نہیں، فیصلے تاریخی قوتیں صادر کرتی
ہیں۔ جو لوگ راز کی یہ بات نہیں جانتے وہ خاک جانتے
ہیں خاک۔"

(آئن سٹائن)

”دلبستی بستی، پربت پربت“

قمر علی عباسی (بوسٹن سے)

ایک عظیم الشان مکان کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی مسکراتے باہر آئے

”آپ کا انتظار بہت دیر سے تھا۔“ وہ بولے

”ہم علامہ اقبال کے معتقد ہیں۔ دیر سے آتے ہیں۔“

”ٹھیک کہا۔ اقبال دیر سے آتا ہے“

”آج کے اقبال کا دیر سے آنا، راستہ بھول جانا تھا۔“

”صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“ تقی عابدی نے کہا۔

بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ دو سیڑھیوں کے بعد سنگ مرمر کا فرش، سامنے اوپر جاتا زینہ، سیدھے ہاتھ پر ڈرائنگ روم، بائیں طرف کو ریڈور۔

ہم کشادہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ تقی عابدی کی بیگم کیتی آ گئیں۔ یہ ایرانی ہیں۔ اردو سمجھتی اور بولتی ہیں۔

انہوں نے فارسی میں کچھ کہا اور تقی عابدی بولے

”آئیے ناشتے پر گفتگو ہوگی۔“

”آپ نے ناشتہ نہیں کیا۔ اس وقت تو گیارہ بجے ہیں۔“

”آج چھٹی ہے۔ پھر آپ کا انتظار تھا۔“

بائیں طرف باورچی خانہ، برابر ڈائننگ ٹیبل۔ ایک کرسی پر ہم اور دوسری پر تقی عابدی بیٹھ گئے۔ کیتی ایک ڈش لائیں، ”بیٹھیے، چکھیے۔ بسم اللہ کیجیے۔“ وہ بولیں۔ ڈش کا ڈھکن اٹھایا۔ ”آپ کے لیے نہاری ہے“

”ارے آپ کو کیسے معلوم ہوا ہم نہاری شوق سے کھاتے ہیں۔“

”انسان کراچی، لاہور میں رہا ہو اور اس ڈش سے رغبت نہ ہو یہ ممکن نہیں۔“ تقی عابدی نے کہا۔ پھر چمچے سے دو بوٹیاں پھر شوربا پلیٹ میں ڈالا۔ اس میں نہاری والی کوئی چیز نظر نہ آئی۔

”یہ کرسکی نانیں ہیں ایران کی خاص ڈش۔۔۔ نیم برادھنیہ ہری مرچیں ڈال کر نوش کریں۔“ تقی عابدی نے سلیقے سے ایک ڈش سامنے کردی۔

”نانیں۔۔۔؟“ ہم نے حیرانی سے اپنی پلیٹ کو دیکھا۔

”یہ ہم پہلی بار کھائیں گے۔“

”اور مایوس نہیں ہوں گے۔“ تقی عابدی نے جملہ پورا کیا۔

کیتی ایک ڈش میں پنگل لے آئیں یہ گول روٹی کی طرح ہوتے ہیں۔

”ایرانی روٹی“ عابدی بولے۔

”ہم اسے امریکی سمجھے تھے۔ کئی دن سے گھر سے نکلے ہوئے ہیں کیا خبر ایران پر امریکہ نے دھاوا بول دیا ہو۔ اور اب ان کی روٹی بھی ایرانی ہوگئی ہو۔“

پنگل اور کرسکی نانیں دونوں کا اشتراک پہلی بار چکھا۔ نیم برا دھنیہ اور مرچوں نے لطف دیا۔ ”یہ لذیذ ہے۔ ہم ناشتے اور کھانے کے درمیان برنچ سمجھ کر کھا رہے ہیں۔“

یہ سننا تھا کہ تقی عابدی نے چمچے سے دو نانیں اور ہماری پلیٹ میں رکھ دیں۔

”اتنی نانیں نہ کھلائیں۔ اب ایسا نہ ہو ذرا دیر بعد ہم منمنانے لگیں۔“

کیتی یہ ڈش اکثر پکاتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم وہی زبان بول رہے ہوتے۔“ تقی عابدی ہنسنے لگے۔

”ہم نے سنا ہے مغل بادشاہ شہزادیوں کو بلبل کی زبان کھلاتے تھے، ان کے لہجے میں شیرینی آجائے۔“ ہم نے کہا۔

”وہ بلبل اور شہزادیوں کا نسل تھا۔ ہم ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ اس لیے اطمینان سے کھائیں جو زبان بولتے آئے ہیں وہی بولتے جائیں گے۔“ تقی عابدی نے ڈھارس بندھائی۔

زبان اچھی ہو تو پسند کی جاتی ہے۔ تقی عابدی نے اصرار کر کے اتنی کھلا دیں کہ ہماری زبان بند ہوگئی۔ پیٹ بھر گیا لیکن کیتی کا تکلف نہ گیا۔

”اور کھائیں۔۔۔ اور لیں۔۔۔ یہ لیجیے۔“

عابدی نے فارسی میں شاید سمجھایا۔ اس لیے وہ چائے لینے چلی گئیں۔

ہم عابدی کے ساتھ ہو کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ جہاں ٹیلی ویژن پر کوئی پروگرام دکھایا جا رہا تھا۔ عابدی نے بند کیا۔ اسی وقت پلیٹوں میں آم آ گئے۔

”پاکستان کا چونسا۔۔۔ یہاں۔۔۔ کیسے۔۔۔؟“ ہم حیران تھے۔

”جناب ٹورانٹو میں باقاعدہ ہفتے میں دو بار آتا ہے“

”ہم نے ایک قاش اٹھا کر سونگھی چکھی واقعی یہ چونسا تھا۔

”آپ نے بڑا ظلم کیا۔ پہلے بتایا ہوتا، اس کے لیے بھی جگہ رکھتے۔ نہاری سے پہلے آم ہماری کمزوری ہے“

”اس میں ہم بھی شامل ہیں۔“ تقی بولے۔ ”شروع کیجیے۔ صحت مند انسان ہیں۔“

”آپ ڈاکٹر ہیں۔ ایک کاغذ پر لکھ دیں تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔“

”آم کھانے سے انسان صحت مند رہتا ہے۔ غالب کی مثال سامنے ہے ہر بے احتیاطی کے باوجود 73 سال زندہ رہے۔ آم کھانے کی وجہ سے۔“

تقی نے کہا۔

''اتنی عمر کافی ہے۔'' ہم نے آم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

آم کی قاشیں کھلانے کے لیے تقی عابدی کو اصرار نہیں کرنا پڑا۔ جب تک چائے آئی پلیٹیں خالی ہو گئیں۔

''اور۔۔۔'' وہ بولے

''بادہ عدد۔۔۔ ساتھ لے جائیں گے۔'' ہم نے کہا۔

''انہوں نے آواز دے کر کسی سے فارسی میں کچھ کہا۔

ہم منع کرتے رہے لیکن وہ آم کی دو پلیٹیں لے آئیں۔ چائے کی مہک اچھی اور ذائقہ پسندیدہ تھا۔ بخاری اور آم پر بھاری تھی۔

ہم تقی عابدی کی لائبریری دیکھنے کے مشتاق تھے۔ جس کی ایک عالم میں دھوم ہے۔ اس لئے جلدی چائے ختم کی۔ ایک طرف سفید سیڑھی گھومتی نیچے جا رہی تھی۔ اس سے گھومتے آخری سرے پر قدم رکھا تو ایک ہال دکھائی دیا۔ سو ڈیڑھ سو افراد کی محفل آسانی سے ہو سکتی تھی۔

دائیں طرف راستہ تھا۔ دونوں سمت چار بیڈ روم جو ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ تھے۔ مہمان خانہ ہے۔ اہم اور ممتاز دانشور یہاں ٹھہرتے ہیں۔ آخری کمرہ تقی عابدی کے استعمال میں ہے یہاں انٹرنیٹ، فیکس، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن سب ہی کچھ ہے۔ دنیا سے منسلک رہتے ہیں۔ تقی عابدی کا زیادہ وقت یہاں صرف ہوتا ہے۔ مسودے کی جانچ، کتابوں کا مطالعہ اور تنقیدی مضامین کا لکھنا اس کمرے میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد بڑا کمرہ جو اردو ادب کا بیش قیمت خزانہ ہے یہاں صدیاں سانس روکے کھڑی ہیں۔ وقت تھم گیا ہے۔ ہاتھ سے لکھے ہوئے قیمتی مخطوطے رکھے ہیں۔ یہ انمول ہیں۔ انہیں حاصل کرنے کے لیے تقی عابدی نے وقت کا سرمایہ اور اپنے ان گنت دن لگائے ہیں۔ اس لائبریری میں 1440 مخطوطے ہیں جس میں زیادہ تعداد مرثیوں کی ہے۔ جس میں فارسی اردو دونوں شامل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کاغذات کی تعداد 8 سے 9 لاکھ ہے۔

ہم زمانے میں ماضی میں اترنے لگے۔ یہ لکھنو ہے میر انیس کا زمانہ ہے یہ دلی ہے میر کا دور ہے یہ الہ آباد ہے اکبر الہ آبادی کا شہر ہے

تقی عابدی محبت سے نادر پرانی تحریریں دکھا رہے تھے۔ کاغذ کا رنگ اڑ گیا ہے کہیں کتابت دھندلی پڑ گئی ہے۔ تاریخ پڑھی نہیں جاتی۔ نام مٹا ہوا ہے لیکن مرثیے کے بند غزل کے شعر موجود ہیں۔

یہ مخطوطات صاف شفاف پلاسٹک کی تھیلیوں میں محفوظ ہیں ان پر تاریخ اور وقت لکھا ہے۔ اس زمانے میں یہ سسٹم تھا جس سے آج فائدہ ہوا اور دور کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب سے محبت کرنے والے بہت ہیں لیکن اس حد تک دیوانے کم ہوں گے۔ یہ تحریریں تقی عابدی کے دل کے ٹکڑے، جگر کے گوشے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ مرثیے لکھے غزلیں تحریر کیں شاید وہ بھی اتنی چاہت نہ کر سکے ہوں۔ وہ کب واقف تھے کہ برسوں بعد ایک شخص بستی بستی پربت پربت ان تحریروں کو تلاش کرے گا۔ شاید یہ رضائے الٰہی ہے کہ اس کے پیاروں کے لیے لکھے لفظ محفوظ رہیں اور تقی عابدی لائبریری میں جمع ہو جائیں۔ دنیا میں کسی شخص کی ذاتی لائبریری میں اتنی تعداد میں مخطوطات نہ ہوں گے۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ والوں کو ان کا نام ایک ریکارڈ کی صورت میں محفوظ کرنا چاہیے۔

ہمارے سامنے 1200ھ 226 سال پرانا مرثیہ تھا۔ یہ ایک طوائف ملکہ جان کی ملکیت ہے۔ شاعر نے مرثیہ لکھا اور ملکہ کے نام کر دیا۔ ملکہ کو زمین کی چادر ملی لیکن مرثیے پر لکھا نام صاحبانِ مرثیہ کے طفیل زندہ رہ گیا۔ 225 سال پرانا مرثیہ میر خلیق کا تحریر کردہ ہے جب کہ نخشب نے سنا تیغ لڑائی ہو گی۔ میر انیس کے والد محترم تھے۔ اللہ نے ان کے خاندان کو مرثیے لکھنے کا فن عطا کیا تھا۔

نول کشور نے لکھنو سے 1880 میں میر تقی میر کا دیوان شائع کیا۔ اس کی ایک جلد پروفیسر آغا حیدر حسن کے پاس تھی۔ وہ مطالعہ کرتے پسندیدہ اشعار پر سرخ نشان لگاتے۔ وہ ہمارے سامنے تھا۔ اور موسموں نے اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔

مرزا انیس کے بھائی انس کے شاگرد فضل رسول فضل تھے۔ ان کے مرثیے دیکھے۔

بیگمی کی شاعرہ روپ کماری مسلمان ہو گئی۔ اس نے جو مرثیے لکھے وہ ہمارے سامنے تھے۔ وقت نے اسے بھی فانی کر دیا۔ تقی عابدی کی لائبریری میں آرام سے ہے۔ یہ اس کا دیوان شائع کر رہے ہیں۔ اس کا انتساب سید محمد حیدر رضوی کے نام کیا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔ 2004ء میں خالق دینا ہال کراچی پاکستان میں مرثیہ پر گفتگو کی ایک محفل تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صدارت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے تقریر کی۔ تقریب کے اختتام پر ایک صاحب ان کے پاس آئے۔

''میں آپ کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔ کہاں ٹھہرے ہیں؟''

تقی عابدی نے ہوٹل کا نام بتا دیا۔ وہ صاحب چلے گئے۔

شام کو عابدی کو واپس آنا تھا۔ یہ تیار ہو کر نیچے اترے تو وہ صاحب ہاتھ میں بستہ لیے کھڑے تھے۔ ''یہ آپ کے لیے'' وہ بولے۔

انہوں نے کھول کر دیکھا۔ اس میں 138 اردو مرثیوں کے مخطوط تھے۔ تقی عابدی کا خزانہ ابل گیا۔ خوشی سے دل دھڑکنے لگا۔ ان صاحب کو الگ لے جا کر پوچھا۔

''کیا نذرانہ پیش کروں؟''

"یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔ آپ سے بہتر کون اس کا حق دار ہو گا۔" یہ سید محمد حمید رضوی تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کیا کرتے۔۔۔ بس آنکھوں میں شکرانے کے ستارے لے آئے۔ کتابوں کی الماریوں کے درمیان شاعر، ادیب، فلاسفہ اطمینان سے آرام کر رہے تھے۔

"ان کاغذات کو موسموں کے احتساب اور وقت کی دیمک سے کیسے محفوظ کریں گے؟" ہم نے پوچھا۔

"کوڈاک کمپنی ایک مشین ایجاد کر رہی ہے جس کے نلکی میں کاغذ ڈالا جائے تو اس پر مخصوص پلاسٹک کی تہہ چڑھ جائے گی یوں سمجھیں پلاسٹک کوٹنگ ہوگی۔ پھر وقت اس پر اثر انداز نہیں ہوگا۔"

"یہ کب تک آ جائے گی؟"

"دو سال میں۔ میں نے آرڈر دے دیا ہے۔ اس کی قیمت 5 ہزار ڈالر ہوگی۔"

تقی عابدی دنیا کے ممتاز پیتھالوجسٹ میں شمار ہوتے ہیں۔ انسانوں کے ساتھ کاغذوں کی حفاظت بھی جانتے ہیں۔

دیوار پر علامہ اقبال کی ایک قلمی تصویر لگی تھی ایک واقعہ اس کا بھی ہے۔ اسے مرحوم حیدرآبادی نے 1941ء میں بنایا تھا۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد دکن نے اس کی نمائش کی تھی۔ اس کا ذکر ڈاکٹر صفدر قادری کی کتاب میں ہے جو حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ دوسری کتابوں میں بھی اس کی تفصیل ہے۔ تصویر کی عمر 64 سال ہوگی۔ ہم نے دیدار کیا۔

اردو کی پہلی صاحب دیوان خاتون شاعرہ ماہ لقا چندا بائی ہیں۔ یہ غالب سے چند سال پہلے شاعری کرتی تھیں۔ حیدرآباد کی نامی گرامی طوائف تھیں۔ ان کی قبر حیدرآباد دکن کے مولا علی ناڈن میں موجود ہے۔ وہ کہتی ہیں:

تم منہ لگا کے غیروں کو مغرور مت کرو
لگ چلنا اپنے ویسے سے دستور مت کرو

چندا بائی کا دیوان سو سال پہلے شائع ہوا۔ اس کی ایک کاپی تقی عابدی کے پاس دیکھ کر حیرت ہوئی۔

اس شاعرہ نے اپنے نام ماہ لقا اور چندا بائی دونوں سے فائدہ اٹھایا۔ اشعار میں اس کا استعمال کر کے مصرعوں کا حسن بڑھایا۔ اس لائبریری کے مخطوطات دیکھنا بڑے اعزاز کی بات ہے۔

تقی عابدی علامہ اقبال کے مداح ہیں۔ ان دنوں شکوہ جواب شکوہ کی اشاعت کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ہمیں کتابت کا نمونہ دکھایا۔ لاہور کے ایک نامی گرامی کاتب نے اسے لکھا ہے۔ ہر صفحے پر ایک بند۔ انہوں نے نہیں بتایا لیکن ہمیں معلوم ہوا کاتب نے سب کے ایک ہزار روپے لیے۔ یہ کل 65 بند ہیں۔ اتنی رقم علامہ اقبال کو مل جاتی تو وہ کم از کم شکوہ نہیں لکھتے۔

مخطوطات جمع کرنے میں بھی انہیں سخت کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑا۔ تقی عابدی کو خبر ملی لکھنؤ کے علاقے فیض آباد کے ایک گاؤں میں ایک صاحب کے پاس نادر مخطوط ہیں۔

بغیر دیر کیے اس سمت روانہ ہو گئے۔ فصل کٹ چکی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ کھیتوں سے کچی پگڈنڈی سے گزرتے بے حال ہو گئے۔ پیاس اور گرمی کی شدت کا اندازہ اس دن ہوا۔

گاؤں آ گیا۔۔۔ ایک شکستہ گلی میں پہنچے۔ اس کے کونے پر ایک پرانا مکان تھا۔ وقت اس پر سے بڑی بے دردی سے گزرا تھا۔ یہی منزل مراد تھی۔ مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بزرگ نے باہر جھانکا پھر دروازہ بند کر لیا۔

تقی عابدی مکان کے برابر پتھر پر بیٹھ کر سانس درست کرنے لگے۔ منزل پر پہنچ کر ناکام نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ذرا دیر بعد دوبارہ دروازے پر دستک دی۔ اس بار دروازہ کھلا بلکہ آواز آئی "اندر تشریف لائیے۔"

یہ کامیابی کی آواز تھی۔ تقی عابدی تیزی سے اندر پہنچے۔ ہلکا اندھیرا اور ٹھنڈک کا احساس۔ سامنے ایک بزرگ کھڑے تھے۔ انہوں نے تخت کی طرف اشارہ کیا۔

"تشریف رکھیے۔" یہ بیٹھ گئے۔

"فرمائیے؟"

"سنا ہے آپ کے پاس کچھ مرثیوں کے مخطوط ہیں۔" تقی عابدی نے کہا۔

"جی۔۔۔ فرمائیے۔۔۔ پھر۔۔۔؟" بزرگ نے پوچھا۔

"میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں، بہت دور سے آیا ہوں۔" عابدی بولے۔

سنجیدہ بالوں والے بزرگ نے ایک لمحے کو سوچا پھر اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے ایک میلے کچیلے کپڑے کا بستہ لائے۔ سامان بیٹھ کر احتیاط سے کھولا۔ تقی عابدی نے دیکھا۔ گدڑی میں لعل۔ ہمت کر کے کہا۔

"میں ایک لائبریری بنا رہا ہوں۔ میرے پاس سینکڑوں مخطوط ہیں۔ کیا آپ مجھے یہ دے سکتے ہیں؟"

بزرگ نے فوراً بستہ بند کر لیا۔

"میرے پاس یہ زیادہ محفوظ رہیں گے۔ آپ جو کہیں وہ نذرانہ پیش کروں؟" تقی عابدی نے ہمت نہیں ہاری۔

بزرگ خاموش رہے۔

"میں نے ان کاغذات کی حفاظت کا بہت اچھا انتظام کیا ہے۔" عابدی بولے۔

"کیا پیش کریں گے؟" بزرگ بولے۔

باقی: صفحہ نمبر ۲۴ پر ملاحظہ فرمائیں

حسن ساحل پہ ہے دریا میں ہے طوفان میں ہے
حسن حکمت میں ہے دانش میں ہے برہان میں ہے
حسن تعلیم میں ایقان میں ایمان میں ہے
حسن توریت میں انجیل میں قرآن میں ہے
حسن صحرا میں بیابان و گلستان میں ہے
حسن بے جان میں حیوان میں انسان میں ہے

لیکن ہر حسن مجازی ہے بجز حسنِ خدا
کاش مل جائے ہمیں حسنِ حقیقی کا پتہ
جس کے دم سے ہے زمانے میں حسینوں کی بقا
جس کی دولت سے محبت کا ہے بازار کھلا
جس طرح شمع کے شعلے سے نہیں نور جدا
جس طرح عشق کے جلوے سے نہیں طور جدا
اس طرح حسن سے ہوتا نہیں انسان جدا
ایسے انسان کا رہتا ہے نگہبان خدا۔

سن کے آواز مری آئی یہ ہاتف کی ندا
اب قتیؔ مانگ فقط حسنِ حقیقی کی دعا
حسنِ کامل کی اگر تجھ پہ عنایت ہوگی
حسنِ مطلق کو سمجھنے کی ہدایت ہوگی

○○
○

حادثے کب کہاں نہیں ہوتے
کچھ نہاں کچھ عیاں نہیں ہوتے

ہم شکایت پرست نہیں ورنہ
شکر کے دن کہاں نہیں ہوتے

جو کریں دشمنوں کو شرمندہ
دوست ایسے کہاں نہیں ہوتے

یہ نگاہوں نے کہہ دیا ورنہ
کچھ مطالب بیاں نہیں ہوتے

رات بھر راستوں پہ رہتے ہیں
جگنوؤں کے مکاں نہیں ہوتے

کاغذی پھول لاکھ رنگیں ہوں
شاملِ گلستان نہیں ہوتے

آزمالو یہاں محبت کو
عرش پہ امتحاں نہیں ہوتے

روٹھ کر کس طرف کو جاؤ گے
دل سے اچھے مکاں نہیں ہوتے

بچپنا ان سے چھوٹتا ہی نہیں
وہ کبھی بھی جواں نہیں ہوتے

جو بدل جاتے ہیں زمانے سے
وہ امامِ زماں نہیں ہوتے

ٹھوس پتھر کے کوہساروں میں
کبھی آتش فشاں نہیں ہوتے

راستہ کون سا ہے جس پہ قتیؔ
رہزنوں کے مکاں نہیں ہوتے

○

چراغِ عشق

(ڈاکٹر سید تقی عابدی کے کلام سے مختصر انتخاب)

صفوت علی صفوت

(نیوارک)

جستجو

چراغِ عشق کو محفل میں ہم سجانے لگے
ہو رشکِ آسماں ایسی زمیں بنانے لگے

دیا جلا کے اندھیروں کو ڈھونڈنے نکلے
قدم قدم پہ اجالے نظر میں آنے لگے

پڑی جو روشنی غم کی دلِ شکستہ پہ
مری شکست کے سائے بھی جگمگانے لگے

نگاہِ حسن کو پھولوں کے رس میں حل کر کے
وہ نشہ پھر مرے احساس کا بڑھانے لگے

تمام خار گلستاں کے بن گئے شعلے
وہ اپنے ہاتھ سے گلشن کو جب سجانے لگے

عجیب درد کی دنیا میں جی رہیں ہیں لوگ
کہ زخم کھانے لگے اور مسکرانے لگے

گئے تھے قصرِ حکومت میں کس تفاخر سے
پر اقتدار کے زینوں پہ ڈگمگانے لگے

فلک کی طرح گھٹایا کبھی بڑھایا ہے
وہ چاند کی طرح اب ہم کو آزمانے لگے

جلا کے میرا نشیمن کہا یہ بجلی نے
چمن میں روشنی کچھ کم تھی ہم بڑھانے لگے

تمام عمر بھی سجدے میں سر رہے کم ہے
ہیں تیرہ بخت جو سجدے سے سر اٹھانے لگے

بنا کے مرکزِ سجدہ مرے نشیمن کو
مرے ہی گیت فرشتے بھی گنگنانے لگے

اڑے جو پرزے مرے گھر کے آسماں کی طرف
صدا یہ آئی کہ تنکے تو اب ٹھکانے لگے

نظر نے جب سے تراشا ہے بت کو پتھر میں
ہر ایک سنگ میں ہم بت کدہ سجانے لگے

جوان رات کے پہلو میں جاگ کر شاعر
سحر پہ بسترِ کمخواب کو بچھانے لگے

پیمبرانہ یہ باتیں بتا رہے ہیں تقی
کہ تم بھی قصرِ مشیت میں آنے جانے لگے

کس کو صدا کروں کہ کوئی ہمنوا نہیں
کس موڑ پر کھڑا ہوں مجھے خود پتہ نہیں

اتنا گرایا مجھ کو غمِ روزگار نے
میں آسمان کے بھی برابر رہا نہیں

آباد شہر شہرِ خموشاں لگا مجھے
اپنوں نے آج تک مجھے اپنا کہا نہیں

وہ آنسوؤں میں مجھ کو بہا کر چلے گئے
سیلاب میری آنکھ کا لیکن رُکا نہیں

ہم جس کو ساری عمر صدا دیتے رہ گئے
وہ کہہ رہا تھا اُس نے تو کچھ بھی سنا نہیں

نورِ نظر ہیں مرے یہی آنسوؤں کے تار
آنکھوں سے اُس کا نقش جدا تو ہوا نہیں

جس دن وہ مسکرا کے نظر کو جھکا دیا
اُس دن سے میرا ہاتھ دعا کو اٹھا نہیں

احباب آ گئے ہیں تقی دفن کے لیے
کس نے کہا کہ دوست ترے باوفا نہیں

○

شب و روز اور دم بہ دم دیکھتے ہیں
اُنہیں پھر بھی ہم کتنا کم دیکھتے ہیں

عجم میں بھی اب لوگ کم دیکھتے ہیں
تقی جن غزالوں کا رَم دیکھتے ہیں

نظر بت تراشوں کی جن کو ملی ہے
چٹانوں کے اندر صنم دیکھتے ہیں

غضب ہے گُلوں کی بہار آفرینی
ترے رخ پہ کتنے اِرم دیکھتے ہیں

ہے شیشے پہ اُن کی نگاہیں بھی لیکن
نہیں دیکھتے وہ، جو ہم دیکھتے ہیں

خُم و پیچِ عالم کو بھی دیکھ لیں گے
ابھی زلفِ جاناں کے خم دیکھتے ہیں

عجب دَور ہے یہ کہ لفظوں کے اندر
ادیبوں کے ٹوٹے قلم دیکھتے ہیں

نہیں دیکھ سکتے جسے چاند تارے
وہ منظر اندھیرے میں ہم دیکھتے ہیں

چھڑا ذکر جب بھی کسی گُل پری کا
تقی صرف سوئے عجم دیکھتے ہیں

فریادِ مسجد اقصیٰ

بیت اقدس ہوں، فلسطین کی دستار ہوں میں
دستِ مسلم میں چمکتی ہوئی تلوار ہوں میں
زیرِ آفاق مہکتا ہوا گلزار ہوں میں
اجنبی قوم میں ہیہات گرفتار ہوں میں

آج ہر سمت مسلمان سے بیزاری ہے
دینِ اسلام مٹانے کی مہم جاری ہے

میں نے عیسیٰ کو اسی خاک پہ مشہور کیا
اپنے کہسار کو موسیٰ کے لیے طور کیا
جب بھی فرعون یہاں آیا اسے دور کیا
جو بھی نمرود کہ شداد بنا چور کیا

شام روشن تھی مری بانگِ اذاں کے دم سے
صبح تاریک ہے اب میری فغاں کے غم سے

پیٹ پر باندھ کے پتھر جو لڑا کرتے تھے
زیرِ خنجر بھی جو قرآن پڑھا کرتے تھے
لا الہ کہہ کے جو طوفاں پہ چڑھا کرتے تھے
جن کے سائے سے بھی کفار ڈرا کرتے تھے

آج کیوں خون میں وہ جوش وفا باقی نہیں
کیوں وہ پیمانہ نہیں، بادہ نہیں، ساقی نہیں

برق تھی جس سے ہراساں وہ نشیمن نہ رہا
عشقِ توحید سے باندھا ہوا بندھن نہ رہا
ملتِ بیضا میں وہ من نہ رہا فن نہ رہا
علم و دانش سے مہکتا ہوا گلشن نہ رہا

سب لٹا کر بھی تکبر کا نشہ طاری ہے
تفرقہ آج مسلمان کی بیماری ہے

اپنی ارزش سے ہو واقف کہ مسلمان ہو تم
جس پہ خالق بھی کرے فخر وہ انسان ہو تم
وارثِ عصر ہو تم، صاحبِ ایمان ہو تم
جو پہاڑوں سے نہ رک پائے وہ طوفان ہو تم

تم کو رکھ کر بھی مرے ہاتھ میں زنجیر رہے
دستِ کفار میں کب تک میری تقدیر رہے

تم نہ تازی ہو نہ عجمی ہو نہ عربی ہو تم
تم نہ شامی ہو نہ مصری ہو نہ ترکی ہو تم
تم نہ ترکی ہو نہ شرقی ہو نہ غربی ہو تم
تم مہاجر ہو نہ سندھی ہو نہ ہندی ہو تم

شہرِ لاہور ہو تم، بلدۂ طہران ہو تم
عالمِ قدس تمہارا ہے مسلمان ہو تم

میں تمہاری ہوں مگر تم کو مرا پاس نہیں
قید زنداں میں ہوں لیکن تمہیں احساس نہیں
تم مجھے کر سکو آزاد مجھے آس نہیں
کیونکہ تم میں کوئی حیدرؓ نہیں عباسؓ نہیں

باغباں کانٹے بچھاتا ہے یہاں راہوں میں
کچھ مسلماں ہیں یہودی کے ہوا خواہوں میں

کیوں بھلا درہم و دینار سے نیلام ہوں میں
کیا سمجھ رکھا ہے گردش میں کوئی جام ہوں میں
عظمتِ دین ہوں معراج کا پیغام ہوں میں
مسجدِ اقصیٰ ہوں، اسلام کا انعام ہوں میں

دہن بستہ ہوں فقطؔ تم مری فریاد کرو
بیت اقدس ہوں، مسلماں مجھے آزاد کرو

اگر پہلو میں تیرے ہم نہ ہوں گے
تو دل کے فاصلے پھر کم نہ ہوں گے

جو آنسو پھول کی آنکھوں سے نکلے
"شریکِ گریۂ شبنم نہ ہوں گے"

یہ کیسا احترام دوستی ہے
"تری محفل میں بس اک ہم نہ ہوں گے"

چراغوں کو بجھا کر کیا کرو گے
دلوں کے داغ تو مدھم نہ ہوں گے

کبھی سوچا نہ تھا ایسا بھی ہوگا
جدا ہو کر کبھی باہم نہ ہوں گے

تمہارا شہر چھوڑے جا رہے ہیں
مگر چرچے ہمارے کم نہ ہوں گے

اگر خط میں نہ ہوگا سوزِ الفت
تو کاغذ آنسوؤں سے نم نہ ہوں گے

ہزاروں تہمتیں مجھ پر لگا دو
مرے احباب لیکن کم نہ ہوں گے

ستارے ہمسفر بھی ہو گئے تو
مرے ہمدم، مرے محرم نہ ہوں گے

اگرچہ آئینہ پر گرد ہوگی
مگر جلوے ترے مدھم نہ ہوں گے

وہ جاتے ہیں فقط اُس انجمن میں
جہاں وہ جانتے ہیں ہم نہ ہوں گے

کئی ویران گھر ہیں بستیوں میں
ہے کوئی دل کہ جس میں غم نہ ہوں گے

بغیر اُن کے تقی کا فیصلہ ہے
کوئی محفل ہو اُس میں ہم نہ ہوں گے

ساحل پہ کھڑے ہو کے تماشا نہیں کرتے
ہم ڈوبتی کشتی کا نظارا نہیں کرتے

طوفاں سے لڑا دیتے ہیں جو اپنا سفینہ
ساحل کو کبھی اپنا کنارا نہیں کرتے

تم دھوپ کے صحرا میں کسے ڈھونڈ رہے ہو
یہ جھاڑ ہیں کانٹوں کے جو سایا نہیں کرتے

کھیلے ہیں عجب طرح سے ہم عشق کی بازی
یوں جیتنے والے کبھی ہارا نہیں کرتے

اب پاس مرے کچھ بھی نہیں ہے جو لٹا دوں
ہم دوستی اے دوست دوبارا نہیں کرتے

پھولوں کو لٹاتے ہیں جو شیشے کے بدن پر
پتھر وہ کبھی شیشے پہ مارا نہیں کرتے

خوشبو ہے تری یاد کی ہر وقت مرے ساتھ
ہم پھول کی خوشبو پہ گزارا نہیں کرتے

ہر گوشۂ دل میں تری تصویر لگی ہے
ہم نقش کوئی اور اتارا نہیں کرتے

آنکھوں کے اشارے سے بلا سکتے ہیں جو بھی
وہ نام کبھی لے کے پکارا نہیں کرتے

جو لوگ تقی حُسن کی عظمت کے ہیں قائل
وہ حُسن کو پردوں میں گوارا نہیں کرتے

شاعر

ہے شاعری ہی مرا ساز اور مرا پرچم
ہے شاعری ہی مرا زخم اورمرا مرہم

مرے خیال سے رنگیں نوا ہیں لوح وقلم
سنوارے میں نے عروسِ سخن کی زلف کے خم

ہوا ہے میرے تخیل سے شاعری کا جنم
تراشتا ہے کوئی بت تراش جیسے صنم

نہیں ہے جس میں محبت نہ ہوگا نوروالم
وہ شاعری نہیں تقدیس شاعری کی قسم

اگر ہے چشمِ بصیرت تو دیکھ لے ہمدم
کہ عرش پہ نظر آتے ہیں شاعروں کے قدم

شکستہ خواب کی تعبیر ڈھن رہاہوں میں
فضامیں بکھرے ہوئے گیت چن رہاہوں میں

ادب کی خلعتِ زرباف بن رہاہوں میں
حریم غیب کی آواز سن رہا ہوں میں

سحر کی طرح اندھیروں کو پی کے آیا ہوں
قلم سے چاک گریباں کو سی کے آیا ہوں

میں آسمان سے تارے زمیں پہ لاتا ہوں
فضا تو کیا ہے خلاؤں میں گیت گاتا ہوں

چمن میں غم زدہ غنچوں کو میں ہنساتا ہوں
زمیں کو گمشدہ فردوس میں بناتا ہوں

کلی کو بادۂ شبنم پلا دیا میں نے
لہو سے کانٹے کاچہرا سجا دیا میں نے

صدائے بانگِ درا سے کبھی جگاتا ہوں
چمن کو آتشِ گل سے کبھی جلاتاہوں

خیال کو پرِ جبریل دے دیا میں نے
قلم میں رنگِ گلستاں کو بھر لیا میں نے

جومنزلوں کو ملائے وہ رہ گزار ہوں میں
چمن سرشت ہوں صحرا کا برگ وبار ہوں میں

صدائے کلک میں روداد زندگانی ہوں
میں کائنات کی اک ان کہی کہانی ہوں

○○
○

حسنِ مطلق

حسن کہتے ہیں کسے
حسن کہاں رہتا ہے
حسن کیوں عشق کے پہلو میں جواں رہتا ہے
حسن کا راستہ کیوں سب سے جدا ہوتا ہے
حسن کیوں حسن پرستوں کا خدا ہوتا ہے

حسن سے دیکھو تو ہر چیز حسیں ہوتی ہے
حسن سے ہٹ کے ہر اک چیز اثر کھوتی ہے

حسن احساس میں رہتا ہے جوانی میں نہیں
نشہ ہے خون میں، انگور کے پانی میں نہیں
درد الفاظ میں ہوتا ہے، کہانی میں نہیں
ہم ہی چلتے یہاں وقت روانی میں نہیں

حسن جب جھیل میں پلتا ہے کنول بنتا ہے
حسن جب شعر میں ڈھلتا ہے غزل بنتا ہے
حسنِ مزدور، زمیندار کا چھل بنتا ہے
حسنِ ممتاز، کبھی تاج محل بنتا ہے
حسن ہے چاندنی اور حسن کے جنگل کا ہرن
حسن ہے راگنی اور حسن ہے سورج کی کرن
حسن کی لہر میں رہتی ہے پرندوں کی تھکن
حسن ہے چودھویں کا چاند کہیں چاند گرہن

حسن جب آنکھ میں بس جائے تو بینائی ہے
حسن جب لے میں سما جائے تو شہنائی ہے
حسنِ یوسف کی خریدار زولیخائی ہے
حسن بازار میں بک جائے تو ہر جائی ہے

ساری مخلوق خدا حسن کی تھی شیدائی
ظرف جتنا تھا بس اتنی ہی یہ دولت پائی
مفت میں حسن کی دولت جو کبھی ہاتھ آئی
تو ہر اک ذات کہاں اُس کا بھرم رکھ پائی

ہم نے دن رات یہ دولت کو لٹاتے دیکھا
حسن کو بیچ کے عیبوں کو کماتے دیکھا

حسن صورت میں ہے، سیرت میں ہے، گفتار میں ہے
حسن افکار میں اطوار میں رفتار میں ہے
حسن آداب میں اخلاق میں کردار میں ہے
حسن تحریر میں تقریر میں اشعار میں ہے
حسن مٹی میں ہے آتش میں ہے انوار میں ہے
حسن یاروں میں ہے اپنوں میں ہے اغیار میں ہے
حسن پھولوں میں کبھی ہے تو کہیں خار میں ہے
حسن شکوہ میں کبھی ہے تو کبھی پیار میں ہے
حسن ہے جیت میں اور حسن کبھی ہار میں ہے

حسن تصویر میں تنویر میں تقدیر میں ہے
حسن تعریف میں تحلیل میں تفسیر میں ہے
حسن بچوں میں جوانوں میں کہیں پیر میں ہے
لبِ شیریں، رخِ لیلیٰ میں، کفِ ہیر میں ہے
حسن الفاظ میں آواز میں اور ساز میں ہے
حسن معشوق کے انداز میں اور ناز میں ہے
حسن ظاہر میں ہے باطن میں ہے اور راز میں ہے
حسن طبلے میں ہے ٹھمری میں ہے اور جاز میں ہے

اردو رسم الخط

"دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"

ڈاکٹر سید تقی عابدی

اگرچہ اردو رسم الخط کا مسئلہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے کھڑا کیا گیا ہے لیکن گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں اس بحث میں جذباتیت کو بڑا دخل ہو چکا ہے جس کی وجہ سے مسئلہ سلجھنے کے بجائے الجھتا جا رہا ہے۔ آج سے تقریباً پینتیس سال قبل پروفیسر گوپی چند نارنگ نے دہلی کے رسالے "جامعہ" مطبوعہ مارچ ۱۹۷۲ء میں اپنے مضمون "اردو رسم الخط" میں صحیح کہا تھا کہ "زبان کی طرح رسم الخط بھی عوامی چیز ہے اور ہر شخص کو اس پر اظہار خیال کا حق پہنچتا ہے اس لیے اس مسئلے پر لکھنے والوں میں عالم اور عامی بھی شامل ہیں۔ لیکن زیادہ تر تحریریں جذباتیت سے مغلوب ہو کر لکھی گئی ہیں جن کا مقصد اتنا روشنی پھیلانا نہیں جتنا گرمی بڑھانا ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو رسم الخط کے مسئلہ پر معروضی علمی انداز سے نظر ڈالی جائے اور تبدیلی کا مشورہ دینے والوں کے محرکات کا پتہ چلایا جائے نیز موجودہ رسم الخط کو زندہ رکھنے کے تہذیبی اور لسانیاتی پہلوؤں پر غور کیا جائے۔ پنڈت آنند نرائن ملا نے اپنے خطبہ صدارت جے پور اردو کانفرنس میں کہا تھا: "تقسیم ہند کی وجہ سے اکثریت کے دلوں میں جو غبار آ گیا ہے وہ کسی طرح مٹنے کا نام نہیں لیتا اور پاکستان کے خلاف جو غصہ ہے وہ غریب اردو پر اتارا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کو اس ملک کی زبان ماننے سے انکار ہے۔"

اردو رسم الخط کے مسائل پر غور کرنے کے لیے اس کا لسانیاتی پہلو اور اس کا اردو زبان سے رشتہ دیکھنا پڑے گا۔ کسی بھی زبان کا رسم الخط اس زبان کی آوازوں کو علامتوں سے ظاہر کرتا ہے اس لیے وہ زبان کا تابع ہوتا ہے لیکن اغلب زبانوں میں وہ اس زبان کی شناخت بن جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کسی بھی رسم الخط میں دوسری زبانوں کی آوازوں کو بڑی حد تک پیش کیا جا سکتا ہے لیکن صرف ایک زبان کا رسم الخط اسی زبان کی صوتیات کو پوری طرح سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے چنانچہ اردو کا رسم الخط اردو کے لیے مخصوص ہے اور اسی لیے یہی اردو کا چہرہ یا اردو زبان کے جسم پر اس کی چمڑی کی طرح ہے جس کے تبدیل کرنے میں جسم کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ چونکہ اردو کا رسم الخط صدیوں کے تجربات اور استعمال کے بعد اس مقام پر پہنچا ہے کہ اس کی ماہیت اور ساخت اردو زبان کی صوتیات سے گھل مل گئی ہے اسی لیے اب اس کی کھال نوچ کر اس پر دوسری کھال چڑھانا ممکن نہیں اس عمل سے اردو زبان کی شناخت اور انفرادیت ختم ہو سکتی ہے۔

بھارت میں بعض سیاست دان اور مغربی دنیا کے بعض اردو ہندی کے ادیب جو اردو کے رسم الخط کو دیوناگری یا رومن رسم الخط میں تبدیل کرنے کے خواہاں ہیں ان کی وجوہات زیادہ تر کم علمی، غلط فہمی، مفاد پرستی اور ذہنی تیرگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کے نظریات کے تحت

۱۔ اردو رسم الخط ایک غیر ملکی عربی/فارسی رسم الخط ہے۔ یہ اسلامی رسم الخط ہے جس کا بھارت بھومی سے تعلق نہیں۔

۲۔ اردو میں مستعمل فارسی عربی و ترکی کے الفاظ، اصطلاحات اور تلمیحات وغیرہ کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے نہیں بلکہ یہ سب عرب و عجم کی پیداوار ہیں۔

۳۔ اردو رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے سے بھارت میں قومی یکجہتی بڑھ سکتی ہے۔

۴۔ رسم الخط کی تبدیلی سے اردو کے لسانی ذخائر دیوناگری میں آسانی سے منتقل ہو سکتے ہیں۔

۵۔ چونکہ اردو ہندی ایک ہی زبان ہے بلکہ اردو ہندی کی "شیلی" ہے اس لیے دو رسم الخط کی ضرورت نہیں۔

۶۔ ترکی اور ازبکستان کے تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ زبان ترکی اور ازبک کا رسم الخط رومن اور روسی کرنے سے زبان ختم نہیں ہوئی بلکہ زبان کی ترقی ہوئی۔

۷۔ ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں اردو کو زندہ رکھنے کے لیے رسم الخط کی قربانی ضروری ہے۔

۸۔ اردو رسم الخط مشکل ہے اس میں کئی حروف ایک ہی آواز کے لیے ہیں جن سے رسم الخط کی تدریس اور تکنیکی ترقی میں رکاوٹ پیش آتی ہے اس لیے اس رسم الخط کو بدلنا چاہیے۔

۹۔ جدید ترسیلی ٹیکنالوجی جس میں انٹرنیٹ سائبر سسٹم وغیرہ ہیں اس میں اردو آسانی کے ساتھ رومن حروف میں لکھی جا سکتی ہے۔

اوپر بیان کیے گئے نظریات پر تفصیلی گفتگو درکار ہے لیکن ہم اس مضمون کی نوعیت سے اختصاراً چند نکات پر روشنی ڈالیں گے۔

یہ بھی زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ اردو کے رسم الخط کو عربی/فارسی کا رسم الخط بتا کر اسے خصوصاً بھارت میں خارجی یا غیر ملکی رسم الخط بتایا جاتا ہے۔ یہاں کچھ ادب دوست جنہیں ہمیشہ ادبیات کو اصلاحیات میں تبدیل کرنے کا جنون رہتا ہے اس رسم الخط کو قرآن مجید کے رسم الخط سے بھی تعبیر کرتے ہیں جس کا نتیجہ شدید رد عمل کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو کا رسم الخط سامی خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو عربی فارسی سے ہوتا اور صدیوں کے تجربات اور استعمال کی منازل سے گزر کر اب خاص اردو رسم الخط ہو گیا ہے کوئی عرب یا ایرانی نہ اس کو صحیح طریقے سے پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی لکھ سکتا ہے مزید اس کو عربی یا ایرانی رسم الخط نہیں کہہ سکتا۔ اس میں موجود حروف تہجی اعراب اور علامتیں کچھ

ساری الاصل ہیں اور کچھ خاص ہندوستانی جن کی آمیزش نے اسے خاص اردو پن
دیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو زبان اور لسانیات میں اردو رسم الخط کی
صوتیات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''اسے عربی فارسی رسم الخط کہنا
غلط ہے اور کیں اس کو اردو رسم الخط کہنے پر اصرار کرنا چاہیے۔ جس طرح اردو
ایک آزاد اور مستقل زبان ہے اسی طرح اردو رسم الخط بھی ایک آزاد اور مستقل رسم الخط
ہے۔''

پروفیسر فتح محمد ملک اپنی مرتب کردہ کتاب ''اردو زبان اور رسم الخط''
کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔ ''اردو زبان کو ابتدا ہی میں عربی و فارسی رسم الخط کی
نعمت میسر آ گئی۔ ساتھ ہی ساتھ برصغیر کے ہر خطے کی زبان میں بالکل قدرتی طور
پر عربی/فارسی الفاظ شامل ہوتے چلے گئے۔ صدیوں یہ لسانی عمل جاری رہا تب
جا کر کہیں اردو زبان اسلامی کلچر کی علامت بن کر ابھری۔۔۔۔ جب مسلمانوں
سے سیاسی اقتدار چھین کر انگریز برصغیر پر قابض ہو بیٹھے تو ہندو احیائیت کے
علمبرداروں نے انگریزوں کی سرپرستی میں ہند اسلامی کلچر کی اسلامی شناخت کو
مٹانے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ اردو زبان کے عربی رسم الخط کے ساتھ ساتھ اردو میں
شامل عربی فارسی الفاظ مسلمانوں کے خلاف منافرت کی اس مہم کا اولین نشانہ
بنے۔ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے منشی للو لال جی نے ۱۸۰۳ء میں ''پریم ساگر''
کی صورت میں اردو پر پہلا پتھر پھینکا۔''

جناب عزیز احمد ''اردو زبان کا عروج اور تحفظ'' میں لکھتے ہیں۔ اردو
کا رسم الخط اس کا اپنا منفرد رسم الخط ہے اور دنیا کے حسین ترین رسم الخطوں میں
سے ایک ہے۔ یہ ایک طویل تاریخی عمل سے وجود میں آیا ہے۔ ہم اسے صدیوں
سے اسی شکل میں برتتے اور قبول کرتے آئے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں۔ ہمارا
رسم الخط ہمارے تحفظ ہماری شائستگی اور ہمارے لسانی و ادبی علمی اور ثقافتی سرمائے
کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ جس طرح اردو کا ماخذ اس کے اپنے علاقے کے عوام
ہیں اسی طرح اردو کا رسم الخط بھی اپنے علاقے کی تاریخ کے بطن سے فطری انداز
میں صورت پذیر ہوا ہے اور فروغ و ارتقاء کے عمل سے گزرا ہے۔

۱۹۶۰ء کے لگ بھگ جب اردو کے مشہور ادیب خواجہ احمد عباس
نے ہندی کے رسالے ''دھرم یگ'' میں ایک مضمون شائع کیا جس میں اردو
والوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا رسم الخط دیوناگری کر لیں تو اس کے جواب میں
پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون ''اردو رسم الخط۔ ایک تاریخی بحث'' کے
عنوان میں لکھا۔ ''یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ جو لوگ اردو رسم الخط کو
تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں وہ اردو اصوات تو کجا اردو اعراب سے پورے
طور پر واقف نہیں ہوں گے۔ رسم الخط کی بات کرتے ہوئے سب سے زیادہ زور
اس بات پر دیا جاتا ہے کہ ہندی اور اردو ایک زبان ہے۔ یہ بات جتنی صحیح ہے اتنی
غلط بھی ہے یعنی بنیاد کے اعتبار سے بے شک ہندی اور اردو دونوں زبانیں
ایک ہیں لیکن اپنے ارتقاء کے دوران بوجوہ یہ زبانیں ایک دوسرے سے الگ
ہو گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں زبانیں شورسینی پراکرت کی جانشین ہیں اور دلی
کے گرد و نواح کی کھڑی بولی پر قائم ہیں۔ اردو اور ہندی کو اب دو علیحدہ لیکن
آزاد اور مستقل زبانیں سمجھنا چاہیے۔ بنیاد کو ایک تسلیم کرنے سے یہ قطعاً لازم نہیں
آتا کہ دونوں کا رسم الخط ایک ہو۔ اگر یہ بات ضروری ہوتی تو آج اڑیا، بنگالی اور
آسامی زبانوں کا رسم الخط ایک ہی ہوتا کیوں کہ یہ تینوں ماگدھی پراکرت کی
جانشین ہیں لیکن اس کے باوصف ان کا رسم الخط ایک دوسرے سے مختلف ہے
یہی ہندی اور اردو کا معاملہ ہے دونوں آریائی زبانیں ہیں لیکن اپنے ارتقائی سفر
میں یہ دونوں زبانیں اتنی آگے بڑھ چکی ہیں کہ اب ان کے لیے ایک ہی رسم الخط
کا تجویز کرنا دونوں کے حق میں مضر ہوگا۔

پروفیسر گیان چند جین کی متنازعہ کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو
ادب'' کے پیش لفظ میں پروفیسر محمد حسین لکھتے ہیں۔ ''سچائی یہ ہے کہ ہندوستان
میں دو نہیں تین زبانیں مروج ہیں۔ ایک ہندوستانی ہے جو عام بول چال کی
زبان ہے اور تقریباً ملک کے ہر حصے میں ہے دوسری ہندی اور تیسری اردو۔
''پروفیسر واستو ماہر لسانیات نے جو اردو اور ہندی کے درمیان سات بنیادی
اختلافات کی نشان دہی کی ہے یعنی رسم الخط، ش خ ذ ض ع غ وغیرہ کے تلفظ،
نشان اضافت، قافیہ وردیف، اصناف سخن رباعی غزل مرثیہ وغیرہ، کمیات
وغیرہ مگر یہ بھی حتمی نہیں ہیں ان کے علاوہ بہت کچھ مشترک ہے۔

پروفیسر محمد حسین لکھتے ہیں۔ ''ایک بات واضح ہے کہ زبان کا لازمی
رشتہ رسم الخط سے نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں یہی خوش فہمی عام ہے۔''
راقم پروفیسر صاحب کے جواب میں یہ ضرور کہے گا کہ زبان کا لازمی رشتہ رسم الخط
کے ساتھ نہ سہی مگر زبان کا رسم الخط کے ساتھ رشتہ لازمی ہے اور پھر دنیا بھر میں
اردو ہندی جیسی دو زبانیں نہیں جن کا رسم الخط ایک کر دینے سے دوسرے کے
وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے۔

پروفیسر گیان چند جین نے اپنی اس متنازعہ کتاب میں بھی اپنے
سابقہ مضامین کے خیالات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''دراصل اردو اور
ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں۔'' ''اردو ادب اور ہندی ادب دو آزاد
ادب ہیں لیکن اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں ہیں۔'' ''محض الفاظ سے زبان
کا تعین نہیں ہوتا۔ رسم الخط کا فرق بھی اسی طرح ایک زبان کے دو حصے نہیں کر سکتا۔''

اس کتاب کے مقدمہ میں جناب کمال احمد صدیقی صاحب نے
لکھا ''جہاں تک گیان چند جین کے بنیادی نظریے کا سوال ہے کہ اردو ہندی
ایک زبان ہیں مجھے اس سے اتفاق ہے۔'' یہاں اس بات کا ذکر بھی بیجا نہیں کہ
پروفیسر گیان چند جین اردو ہندی کو ایک زبان مانتے ہوئے بھی اردو رسم الخط کی
حفاظت پر زور دیتے ہیں۔ ''مجھے اردو زبان اس کے اپنے رسم الخط اور اس کے

ذخیرہ الفاظ کے ساتھ پسند ہے میں اسے اردو خط کے علاوہ کسی اور لپی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ہمارے جو اہل ہندی چاہتے ہیں اگر اردو دیوناگری لپی میں لکھی جائے اور اس کا شبد بھنڈار بدل دیا جائے تو وہ اردو کہاں رہے گی۔ میں ہندوستان کے اردو والوں سے صرف اتنا کہوں گا کہ وہ اپنا رسم الخط بدلنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں۔ اگر انہوں نے اس سلسلے میں کوئی کمزوری دکھائی تو اردو ہندی کے اسالیب میں بہہ کر ختم ہو جائے گی۔ ہندوستان کے آئین میں اقلیتوں کی زبان اور رسم الخط کے تحفظ کی گارنٹی دی گئی ہے“

افسوس اس بات کا ہے کہ ہم اردو والوں نے اردو ہندی ایک زبان کہنے کا الزام صرف اہل ہندی پر رکھا جب کہ حقائق سے پتا چلتا ہے کہ اردو کے عظیم مشاہیر بھی اسی بالا شکیر سے ہمنوا تھے۔

بھارت میں اردو رسم الخط کو دیوناگری سے اور مغرب میں رومن رسم الخط سے بدلنے کے حامیوں میں خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، راہی معصوم رضا، ڈاکٹر ملک راج آنند، ہاشم علی اختر کے علاوہ کئی اردو اور ہندی کے ادیبوں کے نام ملتے ہیں۔ یہ افراد بھی اردو کی بقا کی حفاظت کے لیے اردو رسم الخط کی قربانی جائز سمجھتے تھے۔ اگرچہ ان افراد کی تعداد کم تھی اور اب بھی اس ذہنیت کے لوگوں کی تعداد کم ہے لیکن ان کے نظریات کے مطابق بھارت اور مغربی دنیا میں اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے اور اردو بولنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے یعنی اردو اب کانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے اور آنکھوں کی زبان نہیں رہی چنانچہ رسم الخط کو تبدیل کر کے اسے زندہ رکھا جائے۔

ان افراد سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ اردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر ہم کہیں ”مجھے پانی دو“ تو یہ ہندی ہے اردو ہے یا ہندوستانی اس کا فیصلہ کیسے ہو اور اگر ہم پانی کو دیوناگری میں لکھیں تو اسے کیسے اردو کہہ سکیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہمیں دیوناگری یا رومن رسم الخط میں اردو لکھنا اور پڑھنا سیکھنا ہے تو پھر اردو رسم الخط جو خود اردو کا عمدہ رسم الخط ہے اسے ہی کیوں نہ سیکھا اور سکھایا جائے۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ ہر زبان کا اپنا ادبی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہوتا ہے جو تحریری شکل میں محفوظ رہتا ہے اور اسی بنیاد پر اس زبان کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے اگر ہم اپنا رسم الخط بدل دیں تو کیا یہ سارے ادبی خزانے بے معنی اور بے قیمت نہ ہوں گے۔ کیا اردو زبان میں لکھی گئی صدیوں کی پرانی اردو رسم الخط کی کتابیں جو کتب خانوں میں بے مصرف پڑی ہوئی ہیں ہمارے لیے فکر و مطالعہ سے شکل نہیں بن سکتی ہیں؟

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ہماری زبان کے مضمون ”اردو کا المیہ“ مطبوعہ جون ۱۹۷۱ء میں لکھا۔ چونکہ ہندی اور اردو ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں اس لیے اس میں ترجمے کا پردہ کم سے کم حائل رہتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور ”ادب اور نظریہ“ کے مضمون میں لکھتے ہیں۔ ”اردو کی بنیاد کھڑی بولی پر رکھی گئی ہے اس اعتبار سے اس میں اور ہندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہندی اور اردو کا مستقل جداگانہ زبانیں نہیں ہیں۔“

پروفیسر احتشام حسین صاحب ”ہندوستانی لسانیات کا خاکہ“ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ ”حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے اردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں۔ اگرچہ اردو اور ہندی لسانیاتی مفہوم میں دو زبانیں نہیں ہیں لیکن عملی حیثیت سے اس وقت تک انہیں دو الگ الگ زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے“

پروفیسر فتح محمد ملک اردو زبان اور رسم الخط میں لکھتے ہیں۔ ”لگ بھگ نصف صدی پیشتر امریکی سی آئی اے کی تائید و حمایت سے اقتدار میں آنے والے فوجی آمر فیلڈ مارشل ایوب خان نے جب اردو کو رومن رسم الخط اپنا کر ”ترقی“ کرنے کا فرمان جاری کیا تھا تب ہمارے سرکردہ ادیبوں اور دانشوروں نے یہ فرمان ماننے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔۔ آج ہمارے یہاں ایک مرتبہ پھر بڑی خاموشی اور کمال عیاری کے ساتھ ہمارا الیکٹرانک میڈیا اردو کو رومن رسم الخط میں پیش کرنے میں مصروف ہے ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اشتہارات میں رومن رسم الخط کے ذریعہ ہماری قومی زبان کا حلیہ بگاڑنے میں منہمک ہیں۔ کراچی کے ماہنامہ ”اردو“ نے اپنے مئی ۲۰۰۸ء کے شمارے میں خبر دی ہے کہ کراچی سے رومن رسم الخط میں اردو کے ایک روزنامہ کا اجرا عمل میں آ گیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس اخبار کا بھی وہی حشر ہو گا جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً رومن رسم الخط میں لکھے گئے اردو کتابچوں کا ہوتا چلا آیا ہے۔ رومن اردو کی ترویج کی یہ مساعی اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ ہماری اور ہماری قومی زبان کی منفرد تہذیبی اور لسانی شناخت کو مٹانے کے درپے قوتیں آج بھی سرگرم کار ہیں۔

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ جنہوں نے پروفیسر گیان چند جین کے جواب میں کتاب ”ایک زبان جو مسترد کی گئی“ لکھی اپنے مضمون ”ہندی امپیریلزم اور اردو“ میں لکھتے ہیں۔ ”یہ ہندی امپیریلزم ہی تو تھا کہ شمالی ہندوستان میں ۴۸ علاقائی بولیوں کو ہندی نے اپنے قلمرو میں شامل کر رکھا ہے جس سے ان بولیوں کی انفرادیت ختم ہو گئی ہے اور ہندی بولنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا ہے اس امر کا ذکر یہاں بے جا نہ ہو گا کہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندی بولنے والوں کا فیصد گھٹ کر ۲۷ رہ جاتا ہے۔ جین صاحب بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندی والوں نے امپیریلزم کے بل پر متعدد دوسری زبانوں اور بولیوں کو اپنی قلمرو میں ملا لیا۔ آئین ہند کے آٹھویں شیڈول میں مندرج ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں کے ساتھ اردو کا بھی اندراج ملتا ہے۔ جین صاحب اپنے ایک لسانی مضمون ”اردو ہندی یا ہندوستانی“ مطبوعہ ہندوستانی زبان اکتوبر ۱۹۷۳ء میں لکھتے ہیں ”ہندوستان کے آئین میں اردو ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے درج کرنا سیاسی مصلحت ہے لسانی حقیقت نہیں۔“

اردو اور ہندی بول چال کی سطح پر بلاشبہ ایک زبانیں ہیں۔ اس سے کسی ماہر لسانیات کو انکار نہ ہوگا لیکن ادبی، علمی، تہذیبی اور ٹیکنیکل سطحوں پر بلاشبہ یہ دو مختلف زبانیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اور ہندی کو ایک زبانیں قرار نہیں دیا جا سکتا۔

پروفیسر بیگ مزید لکھتے ہیں اردو بھی جو ایک خودمختار ترقی یافتہ اور معیاری زبان ہے ہندی امپیریلزم سے نہ بچ سکی۔ اہل ہندی نے اردو کی ادبی اور لسانی تاریخ سے سینہ زوری پر چشم پوشی کرتے ہوئے محض اپنی تنگ نظری اور لسانی تعصب کی بنا پر اور ہندی کی بالادستی کو وسیع تر کرنے کی غرض سے اس زبان کو ہندی کی ایک "شیلی" قرار دے دیا۔ "شیلی" کا مطلب ہوتا ہے کسی زبان کا محض ایک اسلوب یا اسٹائل۔ کسی آزاد مستقل اور ترقی یافتہ زبان کو کسی دوسری زبان کی شیلی کہنا اس کے وجود کی نفی کرنا ہے اس کی لسانی انفرادیت کو ختم کر دینا ہے اور اس کے تمام تر ادبی اور لسانی سرمایے پر شب خون مارنا ہے۔ اہل ہندی نے اردو کو ہندی کی شیلی قرار دے کر یہی سب کچھ کیا ہے۔ اردو کو ہندی کی شیلی کہنے کی بدعت انیسویں صدی کے نصف دوم میں شروع ہوئی جب کھڑی بولی ہندی کے ایک حامی ایودھیا پرساد کھتری نے کھڑی بولی ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہ مانتے ہوئے اردو کو ہندی کی "شیلی" قرار دے دیا۔ کھتری کہتے تھے کہ اردو اور ہندی میں فرق صرف "لپی" رسم الخط کا ہے۔ کھتری اہل اردو کو یہ مشورہ بھی دیتے تھے کہ وہ فارسی رسم الخط کو چھوڑ کر دیوناگری رسم الخط اختیار کر لیں۔ ادھر مسلم لیگ نے اسے خطرے کی گھنٹی جان کر ۱۹۱۷ء کے کلکتہ کے اجلاس اور ۱۹۱۹ء کے امرتسر کے اجلاس میں اردو زبان اور فارسی حروف تہجی کے تحفظ کی ضرورت پر زور دیا جس کا نتیجہ ۱۹۳۷ء کی قرارداد میں دفعہ (۱۱) اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت قرار دیا۔

ڈاکٹر ظہیر فاروقی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔ اگر اردو کی گیان چند جین کے لیے واقعی کوئی قدر تھی تو کیا انہوں نے اپنے بچوں کو اردو پڑھائی۔ راقم نے کئی بار شہر لاس انجلس میں گیان چند جین کے بیٹے اور بہو اور خاندان کے افراد سے ملاقات کی وہ سب سلیس اور شگفتہ اردو میں بات کرتے ہیں مجھے یہ علم نہیں کہ وہ اردو پڑھ اور لکھ بھی سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر فاروقی کا سوال اہم ہے لیکن اس سوال کو صرف گیان چند کی فیملی تک محدود رکھنا صحیح نہیں۔ برصغیر میں بھارت اور پاکستان کے نیا ہزار افراد جو اپنے کو اردو کا سپاہی کہتے اور کہلواتے ہیں ان کے گھروں میں بھی اب اردو صرف کانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے اکثر خاندان کے جوان اردو رسم الخط سے بے بہرہ ہیں۔ اردو رسم الخط ایک زندہ اور توانا رسم الخط ہے جو نہ صرف اردو زبان و ادب کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھنے کی ضمانت کرتا ہے بلکہ دوسری بولیوں کو زندہ رکھنے اور ان کو ادب کے زمرے میں ترقی دینے کے لیے مددگار ثابت ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد صغیر خان کے مطابق قدیم زبان پہاڑی جس کا تعلق بھی ہند آریائی خاندان کی زبانوں سے ہے جو آج بھی کروڑوں لوگوں کی زبان ہے اور جسے ماہرین لسانیات نے مشرقی پہاڑی یا نیپالی، وسطی پہاڑی اور مغربی پہاڑی یا لنڈا کہا ہے اور جو ریاست جموں کشمیر کے علاقوں، نیپال اور دیرہ دون، شملہ وغیرہ میں رائج ہے اور جس کے لیے ماضی بعید میں اور بعض مقامات پر آج بھی "لنڈا" "شاردا یا ٹاکری رسم الخط استعمال ہوتا رہا ہے تو اب اسے زندہ اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت دینے کے لیے شاہ مکھی یا نستعلیق رسم الخط ہی استعمال ہو رہا ہے چنانچہ جب اردو رسم الخط میں اتنی گنجائش ہے کہ دوسری قدیم بولیوں کو بھی اس میں لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے تو پھر کیسے اردو کا سر اس کے کاندھوں پر بار ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ آج سے تقریباً سو سال قبل اردو ترقی بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور آج اردو تحفظ بورڈ کی ضرورت لاحق ہے اردو زبان صرف بول چال یا کانوں کی زبان بنتی جا رہی ہے ایسے موقع پر اردو رسم الخط کے مسائل اردو لکھنا پڑھنا اور اردو کی بنیادی تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ آج سے چند برس پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ رسم الخط کا مسئلہ پاکستان کا ادبی، ملکی، لسانی، سیاسی اور مذہبی مسئلہ اس لیے بھی نہیں ہے کہ وہاں مقامی زبانوں اور بولیوں کو بھی اردو رسم الخط میں لکھا جاتا ہے لیکن یہ بات بھی ذہن نشین کرنی چاہیے کہ دنیا کے کسی حصے میں بھی جو مسئلہ اردو کی بقا کے لیے اٹھتا ہے وہ خود بخود پاکستان کے ادیبوں دانشوروں اور اردو پرستاروں کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پریذیڈنٹ ایوب خان کے زمانے سے آج تک رومن رسم الخط کی تبلیغ اور تشہیر شدت سے جاری ہے جس کا نتیجہ آج خود پاکستان کے معاشرے اور سائبر انٹرنیٹ سسٹم پر دیکھا جا سکتا ہے جس کا ذکر پروفیسر فتح محمد ملک نے بھی اپنی مرتبہ کتاب میں کیا ہے۔ اردو پرستاروں کو چاہیے کہ جذباتیت کے بدلے محنت اور یکسوئی سے اس مسئلہ کو حل کریں۔ اگر اردو والے اردو کے رسم الخط کو اپنے بچوں کو سکھاتے رہیں تو دنیا کی کوئی قوت ان سے رسم الخط کو چھین نہیں سکتی۔ یہ سچ ہے کہ حکومت کی سرپرستی اور ہمدردی زبان کے فروغ میں مددگار ہے لیکن یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب اردو والے خود اردو کے ساتھ اس کی بنیادی تعلیم، اس کو روزی روٹی اور روزگار سے جوڑنے اور اس کے رسم الخط وغیرہ کو جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے عام کرنے میں پیش پیش رہیں۔

اردو رسم الخط اردو کی آن بان اور شان ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کی پہچان بھی ہے۔ اس کا رشتہ اردو ادب سے جسم اور جلد کا رشتہ ہے اس میں صدیوں کی ادبی، علمی، تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی اقدار کی نمائش ہے اس کی مدد سے ہم مڈل ایسٹ اور ایشیاء کے کئی ملکوں سے لسانی رشتے قائم کر سکتے ہیں وہ یہ دوسری زبانوں کی نسبت مختصر نویسی کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ غیر ملکی یا کسی خاص مذہب کی میراث نہیں بلکہ ایک مستقل زبان جو برصغیر کے بطن سے پیدا ہوئی اور اسی سرزمین پر پلی بڑھی ہوئی اور آج اسی کا سرمایہ ایک گھنے درخت کے مانند ہندو پاک

سرحد کے دونوں جانب ہے اور اس کی ٹھنڈی ہوائیں دنیا کے گوشے گوشے میں نسیمِ سحر کی طرح دلوں کو شاد کرتی ہیں۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے اپنی کتاب "اردو زبان اور اس کا رسم الخط" کے دوسرے حصے میں رسم الخط پر عمدہ گفتگو کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ دیوناگری اور رومن رسم الخط میں اردو سے زیادہ دشواریاں اور نقائص ہیں۔ اردو کا رسم الخط بدلنے سے جو مضر اثرات اور منفی نتائج ہوں گے اس کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

۱۔ رسم الخط بدلنے سے زبان کی ہیئت بدل جاتی ہے
۲۔ عربی اور فارسی سے رابطہ جو زبان کی نشوونما کے لیے ہے ختم ہو جائے گا۔
۳۔ زبان کا حال اور ماضی سے رشتہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے لفظوں کی پہچان باقی نہ رہے گی۔
۴۔ ہزاروں کتابیں جو اس رسم الخط میں چھپ چکی ہیں ضائع ہو جائیں گی۔
۵۔ حرفوں کی تبدیلی سے حساب جمل کا وجود نہ رہے گا۔
۶۔ شاعروں اور ادیبوں نے جو لفظی صنعتوں میں کمال دکھایا ہے وہ نظر نہ آ سکے گا۔

چنانچہ اردو کا وجود رسم الخط اسی طرح سے برقرار رہنا چاہیے۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ رومن اردو نو Roman urdu? No میں لکھتے ہیں:

Script is to language what spirit is to body. Without its own, innate script, a language is merely a dead body a spiritless mass of assembled limbs. Is that what we want urdu to become by discarding the arabic script and taking on the roman one.

ہم اس گفتگو کے آخر میں صرف یہی کہیں گے اگر اردو والے رسم الخط کی حفاظت اور اس کے استعمال کی عادت کر لیں اور اس گراں قدر امانت کو اپنی نئی نسل کو منتقل کریں تو دنیا کی کوئی طاقت ان سے ان کی زبان کا رسم الخط چھین نہیں سکتی۔ ہمیں دوسروں پر الزام دھرنے سے قبل اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے کہ اس جرم میں حقیقی مجرم کون ہے۔ ہم نے اس گفتگو میں سطروں سے زیادہ بین السطور باتیں کہی ہیں اور بہت سی باتیں بقول آرزو انصاری:

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اور اسی لیے

میں میکدہ کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

۔بقیہ پیہم سوچ امکانی۔

بھی "محبوب المصائب" کا قدرے تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

دبیریات ہی کے سلسلے کی ایک اور اہم کتاب "رباعیات دبیر" ہے جس پر تقی عابدی ان دنوں کام کر رہے ہیں۔ یہ کتاب مرزا دبیر کی ۱۴۰۰ سے زائد رباعیات پر مشتمل ہے جن کے یکجا ہونے اور کتابی صورت میں منظر عام پر آنے کے بعد یقیناً مرزا دبیر کو ایک اہم ترین رباعی گو شاعر کی حیثیت سے بھی دیکھا جا سکے گا۔ سید تقی عابدی کی ان کتابوں کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں مرزا دبیر کو ایک بڑے مرثیہ گو شاعر کے علاوہ ایک اہم مثنوی نگار، ایک اہم نثر نگار اور ایک اہم رباعی گو شاعر کی حیثیت سے بھی وہ مرتبہ حاصل ہونے کی توقع ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

"پیہم سوچ کا کالی میں، اگلا پانو بے پانی میں" کے مصداق سید تقی عابدی کی مرتبہ تازہ ترین کتاب "کائنات نجم" ہے جس میں انہوں نے بڑی محنت، لگن اور خلوص کے ساتھ نجم آفندی کے تقریباً تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے علاوہ ان کا زندگی نامہ، ان کی غزلوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، ان کی نعت گوئی، منقبت نگاری اور نجم کے سلاموں کی آفاقی قدریں" جیسے موضوعات پر اپنے تفصیلی مضامین کے ساتھ ساتھ نجم آفندی کی حیات، شخصیت اور فنی شاعری پر لکھے ہوئے دیگر قلمکاروں کے مضامین بھی شامل کیے ہیں۔

"کائنات نجم" میں نجم آفندی کے تین مرثیے (فتح مبین، معراج فکر اور ایک غیر مطبوعہ مرثیہ) شامل ہیں۔ ان میں سب سے طویل مرثیہ "معراج فکر" ہے جو رضا کار بکڈپو اور پھر سرفراز پریس سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا تھا اس کا مقدمہ ممتاز ترقی پسند نقاد سید احتشام حسین نے لکھا ہے۔ "کائنات نجم" میں نجم آفندی کے نثری رشحات قلم بھی شامل ہیں۔ ان میں فضل اللہ حسین اور ہندوستان کا سجدہ اور لمعات المذہب خاصے کی چیز ہیں کیا نام محمد احسن فاروقی کے اس قول سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے کہ نثر میں جو کچھ بھی وہ چھوڑ گئے ہیں وہ آگے آنے والوں کیلئے مشعل راہ ہے۔

سید تقی عابدی نے اس کتاب میں شامل اپنے ایک مضمون میں نجم آفندی کی شاعری سے کئی مثالیں پیش کر کے انہیں سرمایہ داری جبر کے خلاف احتجاج کی پہلی آواز قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق نجم آفندی نے اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز سے قبل کسانوں مزدوروں اور سماج کے دبے کچلے فرد کے بنیادی مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کیا تھا لیکن ترقی پسند ناقدین انہیں مسلسل نظر انداز کرتے رہے ہیں۔

امید ہے کہ سید تقی عابدی کی یہ کتاب نجم آفندی کے تعین قدر میں اہم کردار ادا کرے گی اور انہیں نہ صرف عزائی ادب میں بلکہ بیسویں صدی کے اہم رباعی گو اور قطعات نگار شعرا کی صف میں بھی ان کا صحیح مقام و منصب دلانے میں معاون ثابت ہوگی۔

پیمبرانہ گفتگو

انوار شریف

(لاہور)

"پُرعزم تقی عابدی"

کچھ عرصے سے رثائی ادب کو اردو ادب میں ایک طرح سے فراموش کیا ہوا ہے مگر نوجوان اور پُرعزم تقی عابدی صاحب نے اپنی جولانیٔ طبع کو بروئے کار لاتے ہوئے رثائی ادب کے بانیوں، جاں نثاروں اور معماروں کی نسبت جس قدر جستجو، اشتیاق اور تحرک کام میں لا کر نئے نئے گوشے اور نکات دریافت کیے ہیں اس کے باعث یہ فراموش شدہ صنفِ ادب ایک بار پھر سے زندہ اور توانا ہو گئی ہے۔

صبا اکبرآبادی (●)

"دلیل کی دنیا"

ادب کی دنیا دعوے کی نہیں دلیل کی دنیا ہے۔ یہاں نام نہیں کام چلتا ہے اگرچہ خالی نام کا سکہ چلانے والوں کی بھی کمی نہیں لیکن یہ نام اتنا قائم رہ نہیں سکتا۔ البتہ ادب کی آبرو ان لوگوں سے ہے جو خلوصِ نیت اور لگن سے اپنے کام میں مگن رہتے ہیں اور دردمندی و انکسار سے گلشنِ ادب کی آبیاری کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں میں انھوں نے جو ترقی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن بقول ان کے مریض وہ ادب کے ہیں۔ ادھر دس پندرہ برسوں میں انھوں نے ایک کے بعد ایک جو مطبوعات پیش کی ہیں وہ کسی کے لیے بھی باعثِ رشک ہو سکتی ہیں۔ رثائی ادب، غالبیات، اقبالیات، غالبیات، فراقیات، کیسے کیسے میدان دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے سر کیے ہیں۔ لڑنے سے پہلے سوچتے ہوئے تیزی رفتار دیکھ کر وہ خطیب بھی ایسے ہیں کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں اور مشاعرے بھی لوٹتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ان پر "چہار سو" کا نمبر آ رہا ہے۔ دعا گو ہوں کہ خدا انھیں چشمِ زخم سے محفوظ رکھے اور وہ اسی طرح اپنے کام میں مگن رہیں۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی بھارت)

"درازیٔ عمر"

ہمیں اپنی شناخت کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت کو لازمی طور پر زندہ رکھنا ہوگا۔ اردو زبان بڑی ثروت مند اور علمی، ادبی خزانوں سے مالا مال زبان ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم میر، غالب، داغ کی سربلندی کے ساتھ اپنے جوہرِ نایاب جو اردو زبان و ادب کی سربلندی و سرفرازی کے لیے ہمہ تن مصروف ہیں کی عزت افزائی سے قطعی غفلت نہ برتیں۔ میرے لیے یہ امر بہت ہی خوشی اور اطمینان کا باعث ہے کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے تن تنہا اپنی زبان، ادب اور فراموش کردہ اہلِ قلم کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ لائقِ احترام بھی ہیں اور اعتبار کی حامل بھی۔ میں اردو زبان و ادب سے وابستہ احباب سے استدعا کروں گا کہ آپ اپنے درمیان موجود اس جوہرِ نایاب کی جس قدر بھی عزت افزائی کر سکتے ہیں کیجیے اور جو احباب کچھ نہیں کر سکتے اُن کو چاہیے کہ وہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی درازیٔ عمر کے لئے دستِ دعا ضرور دراز کریں۔

ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی (حیدرآباد دکن)

"تناور درخت"

ڈاکٹر سید تقی عابدی سچے عاشقِ اردو اور پکے مرثیہ شناس دانشور محقق اور نقاد ہیں۔ اُن کا اشتیاق اور لگن دیکھ کر اُن پر پیار بھی آتا ہے اور رشک کرنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ آج کے دور میں اپنے کام سے اس قدر لگاؤ مشکل ہی دیکھنے میں آتا ہے اس لئے ہم تقی عابدی صاحب کا دم غنیمت جانتے ہیں کہ انھوں نے دیارِ غیر میں جس اخلاص سے اردو ادب کا پودا لگایا ہے اور جس شگفتگی سے اس کی آبیاری کر رہے ہیں ایک نہ ایک دن یہ نرم و نازک پودا ضرور تناور درخت کا روپ اختیار کرے گا۔

(احمد ندیم قاسمی) (●)

"حق بہ حق دار"

رثائی ادب کے خدمت گزاروں میں اس وقت ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام سرِفہرست ہے۔ وہ اس سلسلے میں کئی کتابیں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کر چکے ہیں اور ابھی کئی کتابیں تیاری کے مراحل میں ہیں۔ ان کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ یہ ہے کہ وہ مرزا دبیر کا تمام کلام نظم و نثر مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ "سلکِ سلامِ دبیر" (سلاموں کا کلیات) ۲۔ "طالعِ مہر" (بے نقط کلام) ۳۔ "مجتہد نظم مرزا دبیر" ۴۔ "مثنویاتِ دبیر" ۵۔ "ابواب المصائب" ۶۔ "مصحفِ فارسی"

یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس وقت وہ مرزا دبیر کی جملہ رباعیوں کی جمع آوری کے کام میں مصروف ہیں جس میں ہر رباعی کا تنقیدی تجزیہ بھی ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا۔ اس کے بعد ان شاء اللہ مرزا دبیر کا کلیات مراثی آئے گا۔ مرزا دبیر کا بیشتر کلام "دفترِ ماتم" کی جلدوں میں شائع ہوا تھا لیکن یہ جلدیں بہت کم یاب اور بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ تقی عابدی صاحب نے ان جلدوں میں شامل کلام کے علاوہ مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ کلام اور دوسری جگہوں سے

شائع ہونے والا کام بھی یکجا کرلیا ہے۔ اس طرح ان کے ہاتھوں مرزا صاحب کا حق ادا ہو رہا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ تقی عابدی صاحب کے ہاتھوں مرزا صاحب کے بقیہ آثار بھی اسی طرح مرتب ہو کر آجائیں۔ یہ اردو ادب، ثقافت اور مرزا دبیر کی بڑی خدمت ہوگی۔

نیر مسعود (لکھنؤ بھارت)

"فراقِ یار"

ڈاکٹر سید تقی عابدی ماہر طبیب کے ساتھ علم و ادب کے مشاق محقق، نقاد، شاعر، ادیب اور دانشور تو ہیں ہی ساتھ ساتھ تہذیبی رکھ رکھاؤ اور شائستگی کے حوالے سے ایسے شخص انسان ہیں کہ ان کی صحبت میں گذرا ہوا ایک ایک پل اور ایک ایک لمحہ فراقِ یار کی مانند مسامِ جاں میں ڈیک کر کچھ اس طرح بیٹھ جاتا ہے کہ آپ کوشش کے باوجود اس کو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں کر سکتے۔ ایک بار جو شخص آپ کے دولت کدہ کا دیدار کرتا ہے بار بار اس کے دل میں بیگم ڈاکٹر سید تقی عابدی کے علاوہ اُن کے ذخیرہ علمی اور انگریزی، ایرانی و ہندوستانی طرز تواضع سے رو برو ہونے کی خواہش کچھ اس طرح کلبلاتی ہے۔ ایک بار نہیں دوسری، تیسری یا چوتھی، پانچویں بار بھی آپ بیگم تقی اور تقی عابدی کے دولت کدے پر مہمان بنیں آپ کو لطف پہلی بار کا ہی محسوس ہوگا اور آپ بہر بار یہ کہتے لوٹیں گے۔ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

سید ضمیر جعفری (●)

"احسانِ عظیم"

دبیر کی شہرت اور رثائی ادب میں اُن کی عظمت و سربلندی ان کے مرثیوں کی وجہ سے ہے لیکن ادبی حلقہ میں یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے مثنویاں بھی کہی ہیں۔ ادب کے محققین ان کو تلاش کر کے منظرِ عام پر لائے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا احسانِ عظیم ہے کہ انھوں نے دبیر کے کارناموں کو صوری و معنوی اعتبار سے ادبی دنیا کے سامنے اجاگر کیا۔ مراثی کے ساتھ کلامِ دبیر کے چوتھی جلد جو مثنویاتِ دبیر کے نام سے موسوم ہے اعلیٰ تحقیق، تدوین و ترتیب کا نتیجہ ہے۔ محقق اس شاہکار کے لیے تحسین و آفرین کا مستحق ہے۔ مثنویاتِ دبیر میں مرتب نے ابتداء میں مثنوی کی تعریف اور تاریخ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور مثنوی کی بحروں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے دبیر کی سب سے طویل مثنوی "احسن القصص" کا ادبی تجزیہ کرنے کے لیے علامہ شبلی نعمانی کے ان بیانوں کو اساس بنایا ہے جن پر کسی مثنوی کے معیار کو پرکھا جاتا ہے۔ مرتب نے ۱۸ صفحات پر مشتمل ایک مضمون سپردِ قلم کیا ہے جس میں احسن القصص کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ اس مثنوی میں چہاردہ معصومین علیہم السلام کے حالات ولادت و فضائل و معجزات کو نظم کیا گیا۔ مرتب نے اصل مطبوعہ مثنوی کے سرورق کا عکس بھی اپنی کتاب میں مثنوی کے شروع میں شامل کیا ہے جس سے اس کی استنادی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی (مرو بہ بھارت)

"گفتگو عوام سے"

مغربی ملکوں میں بھی بڑی تعداد میں غزل گو شعراء کی ہے جو اپنی روایت کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ نہ صرف انداز بیان میں بلکہ موضوعات کے اعتبار سے بھی وہ جگر صاحب کے اسلوب و افکار سے آگے نہیں بڑھے جب کہ ہندوستان میں یگانہ اور فراق اور پاکستان میں فیض اور ناصر کاظمی روایت میں جدت کے امکانات کا سراغ دے چکے ہیں اور نظم کے حوالے سے اردو شاعری راشد، میراجی، فیض اور اختر الایمان کے اجتہادات تک آ گئی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شمار مغرب میں آباد ان شعراء میں ہوتا ہے جو ان دونوں رویوں پر نظر رکھتے ہیں مگر شاعری میں غزل کی پاسداری اور نظم میں میر انیس اور جوش کے اسالیب کی طرفداری کے سبب میر کے اس شعر پر عمل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اس طرزِ روش کی ذمہ داری ان سے زیادہ ان کی تربیت اور ان کے علم پر آتی ہے وہ بیک وقت ڈاکٹر بھی ہیں اور محقق بھی، عروض داں بھی ہیں اور شاعر بھی۔

حمایت علی شاعر (کراچی)

"مرحلۂ شوق"

تقی عابدی کا نام اردو دنیا کے لیے نیا نہیں ہے۔ موصوف کا پیشہ ڈاکٹری اور دلچسپی اردو ادب سے ہے۔ شعر بھی کہتے ہیں اور رہائش کینیڈا میں ہے۔ ہندوستان آکر یہاں بھی تنقید اور تحقیق کا کام کرنے والوں کے شوق کو تیز کرتے رہتے ہیں۔ موصوف کا خاص میدان رثائی ادب ہے۔ دو سال پہلے آپ ہندوستان تشریف لائے ساتھ میں اپنی مرتب کی ہوئی کتاب یادگارِ انیس بھی لائے جسے دیکھ کر سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ تقی عابدی صاحب کے اعزاز میں جگہ جگہ انیس پر سیمینار ہوئے انھوں نے لوگوں کو انیس پر مزید کام کرنے پر اکسایا۔ ماہرینِ انیس سے رابطہ قائم کیا۔ ہم سمجھے موصوف 'انیسیے' ہیں۔ مگر ابھی حال میں شاہد علی کیشنر دیا تحفے سے تین ضخیم کتابیں موصول ہوئیں جو تقی عابدی نے بہت عرق ریزی اور عالمانہ انداز میں مرتب کی ہیں۔ اور بہت محنت اور خوبصورتی سے شائع ہوئی ہیں۔

۱۔ مثنویاتِ دبیر　　۲۔ ابواب المصائب　　۳۔ مصحفِ فارسی

ان کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ موصوف کا شمار انیس کے ان مداحوں میں نہیں ہے جو اپنے پیروں کو اڑاتے ہیں ہندوستان میں بھی دبیر پر کچھ کام ہو رہا

ہے اور ماہرین دبیر یہاں بھی موجود ہیں۔ مگر مذکورہ بالا تینوں کتابوں میں جو
معلومات دبیر کی سوانح اور شاعری و نثر کے بارے میں فراہم ہوتی ہیں اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری اب تک کی تحقیق میں کس قدر کمی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ
تینوں کتابیں اردو اور فارسی ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ہم مشکور ہیں تقی
عابدی صاحب کے کہ وہ دیارِ غیر میں بھی رہ کر اپنی زبان و ادب کو نہیں بھولے۔
اور گاہے گاہے ہندوستان آ کر ہم لوگوں کو بتاتے رہتے ہیں کہ تحقیق ایسی ہوتی
ہے۔ خدا کرے کہ مرحلۂ شوق طے نہ ہو اور وہ اسی طرح بے مثال علمی کارنامے
انجام دیتے رہیں۔

پروفیسر صغرا مہدی (نئی دہلی)

"مبارک باد"

مرثیے کے محقق اعظم مسعود رضا رضوی ادیب نے ۱۹۴۳ء میں
شاہکار انیس کے نام سے انیس کا جو مرثیہ پوری اردو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا
آج تقریباً ۶۰ سال بعد اسی مرثیے کو ڈاکٹر تقی عابدی نے فنی و لسانی تشریحات
کے ساتھ ایک ایسے نئے زاویے سے اجاگر کیا ہے کہ اہل تحقیق حیران ہیں۔ یہ
حیرانی انیس کی شعری عظمت کی تہہ در تہہ پرتوں پر بھی ہے۔ اور ڈاکٹر تقی عابدی کی فنی
و تحقیقی بصیرتوں پر بھی! ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اس حیران کن ادبی خدمت نے
انیس پر لکھنے پڑھنے سوچنے اور سمجھنے کے کئی دریچے کھول دیے ہیں۔ ہر دریچہ
ایک نئے منظر کا اظہار ہے اور یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ ابھی انیس کی
دریافت کے مراحل بہت باقی ہیں۔ میں نے ٹورنٹو میں ڈاکٹر تقی عابدی کا کتب
خانہ دیکھا ہے۔ میں ان کے گھر رہا ہوں اس کتب خانے میں ڈاکٹر اکبر حیدری اور
ڈاکٹر انیس اشفاق کے ساتھ میں نے کئی دن گزارے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند
نارنگ کا بھی یہی کہنا تھا کہ انیس و دبیر اور اردو مرثیے کے متعلق اس کتب خانے
میں انتہائی گراں قدر نوادرات ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی جیسے مرثیہ شناس اور علم
دوست شخصیت کے پاکستان آنے پر ان کی کتاب کی رسم اجرا اور انیس پر گفتگو کا
جو اہتمام اقبال کاظمی صاحب نے کیا ہے اس پر وہ ہم سب کی مبارکباد کے مستحق
ہیں۔

ڈاکٹر ہلال نقوی (کراچی)

"عاشقِ اردو"

میرے لیے یہ بے حد خوشی کا موقع ہے کہ میں ایک ایسی شخصیت کی
ادبی تخلیق سے آپ کو متعارف کرا رہا ہوں جو رہتے تو کناڈا میں ہیں مگر ان کا دل
ہر پل ہندوستان کے لیے دھڑکتا ہے۔ ان کے سلسلے میں اقبال کا یہ شعر پوری طور
پر صادق آتا ہے

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو ہمیں وہیں پر دل ہو جہاں ہمارا

یہ شعر ڈاکٹر سید تقی عابدی کے لیے صد فی صد صحیح ہے۔ کناڈا میں
رہتے ہوئے انھوں نے نہ تو حیدرآباد کو بھلایا اور نہ ہی ہندوستانی تہذیب اور
ادب کو۔ خاص طور سے آپ اردو ادب سے جڑے ہیں۔ ریسرچ کا وہ کام جسے
کئی لوگ مل کر پورا نہیں کر سکتے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اکیلے پورا کیا ہے۔ میر
انیس اور مرزا دبیر پر ان کی بلند پایہ کتابیں اور اب تک چودہ تحقیقی کتابوں سمیت
تیس سے اوپر کتب تحریر فرما چکے ہیں اور ابھی تک یہ سلسلہ لا انتہائی جاری
و ساری ہے۔ میرے پاس بجز دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ڈاکٹر تقی عابدی
صاحب جیسے عاشقِ اردو کی نذر کرنے کو کچھ بھی نہیں۔

پروفیسر جنگ پانڈے (الٰہ آباد، بھارت)

"نذرانۂ دل"

اردو اور فارسی ادب کی تنقید میں ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کا جو
مقام متعین ہو چکا ہے اس سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ انیس و اقبال اور امیر خسرو پر
ان کے مقالوں کی دل آویزی اور افادیت مسلم ہے۔ یہ سب ان کی دماغی کاوش
کا نتیجہ ہے۔ ادبیات کی بارگاہ میں ان کی سالہا سال کی تحقیق نہایت مستند اور
خیال افروز ہے۔ ہم اس کے معترف ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالے فارسی و اردو
ادب میں نہایت محترم مقام رکھتے ہیں۔ بارگاہ ادب میں ان کی تحریریں "نذرانۂ
دماغ" کہلائیں گی۔ یہ بیش قیمت تنقیدی سرمایہ ہے۔ ہم کئی سال کی کوشش
کے بعد عابدی صاحب نے اپنی تمام ادبی تحقیقات سے بلند ایک اور تحفہ نذرانہ
پیش کیا ہے جو ذہنی کاوش سے کہیں برتر ارفع و اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عقیدت و
ارادت کے مقدس حرم سے برآمد ہوا ہے۔ یعنی حمد، نعت اور منقبت پر مشتمل
اشعار جو آج آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کی قلبی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ گرے
کے الفاظ میں ان جواہر پاروں کو جو دل کی عمیق تہوں سے ظہور فروز ہوتے ہیں۔

Full many a gem of the purest ray serene.
The dark unfathomed caves of ocean bear.

کہا جائے تو بالکل درست ہے۔ ان منظومات کو خاکسار راقم
"نذرانۂ دل" کہتا ہے مگر اس پاکیزہ تصنیف کا صحیح نام "جوشِ مودت" ہے
کیونکہ اس میں الفت و عقیدت کا جذبہ پورے جوش و جلال و جمال کے ساتھ
موجزن ہے۔ یقین ہے کہ صاحبِ ذوق قاری اس احساسِ مودت میں میرے
ہمنوا ہوں گے۔

سید اظہر حسین زیدی (لاہور)

"حیاتِ نو"

مرزا سلامت علی دبیر پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی دقیق نظر کتب
روایاتِ دبیر، ابواب المصائب اور مصحف فارسی کی حسین طباعت تو اپنی مثال آپ
ہے ہی نفسِ مضمون کے حوالے سے بھی ان کتب کو بے نظیر و بے مثال گردانا گیا

ہے۔ڈاکٹر سید تقی عابدی پیشے کے اعتبار سے طبیب ہیں۔اُن کی پرخلوص جستجو وسیع مطالعہ اور دقیقہ رسی نے انھیں اردو ادب کے چند بڑے علما سورحققین اور ناقدین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ڈاکٹر صاحب کا ایجوزم، ملائم اور شگفتہ ہونے کے ساتھ بالتفانہ اسلوب کا حامل ہوا کرتا ہے اس لئے وہ اپنے بعض پیش روؤں سے اختلاف کرتے ہوئے بھی بیان کی سادگی اور متن کی اشاعت کو ہر لحہ پیش نظر رکھتے ہیں۔آپ نے دبیر کے متفرق متون کو یکجا کرکے اس مجموعہ کا نام مصحف فارسی تجویز کیا جو سلسلۂ دبیر کی گمشدہ کڑی ہر طرح موزوں اور مفید ہے۔بلاشبہ ایسا دروایاب کلام کا اس آب وتاب سے جابجا بیجا دبیر شائع ہوا اسے حیات نو عطا کرتا ہے

مرزا کوکب قدر (کول کنڈا بھارت)

''عہد ساز شخصیت''

ڈاکٹر سید تقی عابدی ایک عہد ساز شخصیت کے مالک ایسے انسان ہیں جنھیں قدرت نے تخلیق، تحقیق، تنقید اور تفہیم کے اعلیٰ جوہر کے علاوہ وفاداری شرط استواری کا جوہر اس قدر فیاضی سے عطا فرمایا ہے کہ جس کام میں بھی ہاتھ لگاتے ہیں مکمل جزئیات کے ساتھ پورا کرتے اور اس کی نسبت ہر طرح کی تنقید کو خندہ پیشانی سے نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ اس کی روشنی میں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

خالد حسین (•)

''انیس شناسی''

ڈاکٹر سید تقی عابدی ہمارے عصر کے نامور ریسرچ سکالر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔آپ کی شہرت کی خاص پہچان انیس شناسی گردانی جاتی ہے حالانکہ آپ نے مرزا دبیر پر بھی بہت کام کیا ہے اور بہت سے نئے نکات سامنے لائے ہیں جن سے اختلاف کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔انیس ودبیر کے علاوہ آپ نے انشا اللہ خان انشا، نجم آفندی اور علامہ اقبال پر بھی دقیق تحقیقی سے کام کیا ہے جسے نہ صرف نظر کرنا تقی عابدی سے نہیں بلکہ اردو ادب سے ناانصافی شمار ہوگی۔

انتظار حسین (لاہور)

''امکان''

تقی عابدی کچھ نہ بھی کرتے تو اُدبا و شعرا کی خدمت کے عوض بہت کچھ حاصل کرسکتے تھے مگر انھوں نے نہ صرف کچھ کرنے کی دل میں ٹھانی بلکہ بہت کچھ کر بھی گذرے اور آئندہ بھی ان سے بہت کچھ سرزد ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

احمد فراز (•)

''مصور کتاب''

ابھی ہمارے ذہن سے ڈاکٹر سید تقی عابدی، مقیم کناڈا کی مصور کتاب ''تجزیۂ یادگار انیس'' کا خمار نہ اترا تھا کہ موصوف نے میر انیس کے معاصر مرزا سلامت علی دبیر کے تئیں اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی جملہ اصناف سخن پر روشنی ڈالتے ہوئے ''مثنویات دبیر'' جو ۳۲۸ صفحات پر محیط ہے شائقین دبیر کے لیے پیش کردی۔اسی طرح ''ابواب المصائب'' کے عنوان سے انھوں نے مع مقدمہ و حواشی ۱۵۰ صفحات قلم بند کئے۔ یہ بھی ان کا ایک ادبی کارنامہ ہے۔یہی نہیں بلکہ انھوں نے اتنے کم وقت میں مرزا دبیر کے فارسی کلام کو جو اب تک غیر مطبوعہ تھا طویل مقدمہ کے ساتھ ۲۷۲ صفحات پر مشتمل شائع کیا ۔اس کے صفحہ ۲۷۲ پر خود مرزا دبیر کے دست مبارک سے مرقوم رباعی کا عکس بھی ہے جو ناظرین کے لیے غیر متوقع ہے۔اتنے کم عرصہ میں موصوف کے یہ ادبی کارنامے اہل نظر کے لیے باعث تحیر ہیں۔اس کے پیش نظر ہم امید کرتے ہیں کہ موصوف جس طرح رثائی ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ وہ مرزا دبیر صاحب کے مراثی کی ان جلدوں کو جو عرصہ ہوا منشی نولکشور (لکھنو) نے طبع کی تھیں اپنے پیش قیمت مقدمہ کے ساتھ شائع فرمائیں گے۔

ڈاکٹر سید سکندر آغا (لکھنو بھارت)

''دیدہ ریزی''

سید تقی عابدی صاحب ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک اور کینیڈا میں رہے جس کی وجہ سے ان کا ذہنی افق بہت وسیع ہوگیا۔انھوں نے سائنس اور طبی علم میں مہارت حاصل کی۔انھیں دنیا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔وہ تیس درجن سے زیادہ مطبوعات کے مصنف یا مولف ہیں جن میں سے پانچ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہیں۔اس کے علاوہ حال ہی میں ان کی ایک اور کتاب ''علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص ''چوں مرگ آید'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔چوں کہ پیشے کے اعتبار سے سید تقی عابدی صاحب ایک نامور ڈاکٹر ہیں، اس لیے انھوں نے جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں علامہ اقبال کی تمام بیماریوں کا جائزہ لیا ہے۔سب سے پہلے انھوں نے علامہ کی بیماریوں کی تفصیل بیان کی ہے اور پھر مختلف ابواب قائم کرکے علامہ کی مختلف بیماریوں کا ذکر کیا ہے اور ہر بیماری کے بارے میں ماہر ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی رائے بھی دی ہے۔ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ علامہ پر طبی، ایلوپیتھی، سرجری، ریڈیو تھراپی جیسے طریقہ علاج کا کیا اثر ہوا۔ انھوں نے بتایا ہے کہ علامہ اقبال بیماریوں کی تشخیص اور علاج میں ان کے معالجوں سے کیا کیا کوتاہیاں ہوئیں۔انھوں نے علامہ کی خوراک اور پرہیز کا بھی ذکر کیا ہے۔عابدی صاحب نے ان طبی اور ایلوپیتھک دواؤں کے ناموں کی فہرست بھی دی ہے جن کا ذکر علامہ نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔غرض ''چوں مرگ آید'' ایک مختصر مگر انتہائی جامع کتاب ہے اور اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ تقی عابدی صاحب نے یہ کام بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کیا ہے۔اب ای

انداز کا کام غالب پر کیا ہے جس کے بعد غالب شناسوں میں بھی وہ نمایاں حیثیت کے حامل ہو گئے ہیں۔

خلیق انجم (دہلی بھارت)

"قابلِ رشک"

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام دنیائے اردو میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا ان کا یہ مقام ان کی انتھک محنت، لگاتار کوشش، گہری لگن اور ایک باعزم بے دریغ اور مسلسل جذبۂ عمل کا صلہ ہے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی دھن اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمہ وقت سرگردانی نے انھیں اب بلند ممتاز اور نمایاں درجہ عطا کیا ہے۔ تحقیق و تنقید کے بڑے اہم قلمکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو زبان کے معتبر اور کہنہ مشقوں ہندوستان اور پاکستان سے دور رہ کر بھی جو اجر اور اعتبار انہوں نے کمایا ہے وہ لائقِ تحسین ہی نہیں قابلِ رشک اور قابلِ تقلید بھی ہے۔

باقر زیدی (نیویارک)

"سکول آف تھاٹ"

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے مختصر ترین عرصے میں جس قدر بھی تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے وہ انتہائی اعلیٰ درجہ کا کام ہے آپ نے اب تک جن عہد ساز شعرا پر تحقیقی کام کیا ہے ان میں میر انیس، مرزا دبیر، انشا اللہ خان انشا، نجم آفندی، فریدؔ لکھنوی اور علامہ اقبال نمایاں ہیں۔ آپ نے تمام بلند آہنگ سخنوروں کی نسبت پہلے سے موجود تصورات کو بھی نئے زاویوں سے جانچا پرکھا اور ٹھوس رائے قائم کی ہے بلکہ نئے نئے زاویوں کو مدلل طریقے پر زیر بحث لا کر بہت سے فرسودہ اور عارضی تصورات کی نفی بھی کی ہے میر انیس اور مرزا دبیر پر تو آپ کی تحقیق آنے والے ایام میں ایک سکول آف تھاٹ کے طور پر طالبان ادب کو رہنمائی مہیا کیا کرے گی۔

ظفر حیدری (سری نگر کشمیر)

"ادبی شہ پارہ"

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے گو کہ ایک مشکل اور دقیق موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن جوں جوں کتاب کا مطالعہ کرتے جائیں یہ مشکل اور دقیق موضوع ایک دلچسپ کہانی کا روپ دھار لیتا ہے۔ مصنف نے مستند کتابوں اور خطوط کے حوالوں سے کتاب کو اس طرح ترتیب دیا کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ علامہ کی صحبت میں موجود ہو۔ مصنف نے جہاں کتاب میں علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص کا ذکر کیا ہے اور تفصیلات بیان کیں اور اپنی آرا کا اظہار کیا وہاں اقبال کی نجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بھی ذکر کیا ہے۔ علامہ کے مقربین، معاصرین اور ساتھیوں کے تذکرے علامہ کی علمی و ادبی سرگرمیاں ان کی پیشہ ورانہ سرگرمیاں ان کی سیاسی سرگرمیاں ان کے سفر کے واقعات مقامی و بین الاقوامی دوستوں سے ملاقاتوں کے تذکرے مطالعہ کے دوران سامنے آتے ہیں۔ مصنف نے علامہ اقبال کے بارے میں ایک اہم پہلو یہ بھی اجاگر کیا کہ انہوں نے شراب نوشی کبھی نہیں کی۔ علامہ دیندار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ روحانی اعتقادات کے قائل تھے مصنف کی تحریر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ عاشقِ رسولؐ تھے اور محبِ اہلِ بیت تھے۔ جوں جوں کتاب کا مطالعہ کرتے جائیں یہ مشکل اور موضوع دلچسپ کہانی کا روپ دھار لیتا ہے اور قاری اپنے آپ کو علامہ کی صحبت میں موجود پاتا ہے نہ صرف یہ بلکہ قاری پر وہی کیفیات طاری ہوتی ہیں جو اس وقت موجود علامہ اقبال کی صحبت میں موجود لوگوں پر ہوتی رہی۔ خصوصاً اقبال کی زندگی کے آخری لمحات، علامہ اقبال کی آخری رات یا ان کے جلوسِ جنازہ کا ذکر پڑھتے ہوئے بعض اوقات قاری کو اپنے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مصنف نے علامہ کی بیماریوں ان کے علاج اور تشخیص پر اپنی رائے ضرور لکھی لیکن دیگر معاملات میں حوالہ جات کو من و عن لکھ دیا ہے اس طرح کہ نہ صرف وہ ایک تاریخی دستاویز بلکہ ایک ادبی شہ پارہ بن جاتی ہے۔

افضل خان نیر (نیویارک امریکہ)

"سنگِ میل"

ڈاکٹر سید تقی عابدی کینیڈا کے ان معدودے چند اہلِ قلم میں شمار کئے جاتے ہیں جنہیں کینیڈا، امریکہ، انگلستان، بھارت اور پاکستان کے سنجیدہ اردو داں ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وہ اعلیٰ پائے کے کثیر التصانیف محقق، شاعر، نثار، مبصر اور نقاد ہیں۔ یہی نہیں، ان کی انتظامی صلاحیتیں اور پیشہ ورانہ مہارت بھی مثالی ہے۔ اردو اور بالخصوص رثائی ادب کی ترویج اور فروغ کے سلسلے میں ان کی خدمات کا ایک وسیع سلسلہ ہے انہوں نے اپنے چند احباب کے تعاون سے عالمی پیمانے پر ایسے سیمینار اور کانفرنسوں (انیس و دبیر، اقبال) کے انعقاد کا بندوبست کیا جو برصغیر سے باہر اردو کی ہمہ گیری کو استحکام بخشنے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ولی عالم شاہین (کینیڈا)

"شاہکارِ انیس"

انیس پر تو کام بہت ہوا ہے یعنی اقبال اور غالب کے بعد سب سے زیادہ اور صنفِ مرثیہ پر غزل سے بھی زیادہ لیکن موازنہ کے بعد کوئی بڑا کام نہیں ہوا۔ ڈاکٹر عابدی نے غیر معمولی اور محنت اور سلیقے سے کام کیا ہے۔ شاہکار انیس کے تجزیے میں ہر بند کے لفظوں کی کیفیت، صنائع و بدائع کی تفصیل اور دوسرے جملہ لوازم نے کتاب کو انیس شناسی کا بہت اہم ذریعہ بنا دیا ہے اور نہایت اہم ماخذ بھی۔ اس کتاب سے انیس کی زبان اور استعمال الفاظ پر کام کرنے والوں کو بھی غیر معمولی مدد ملے گی۔ آپ کی اس کتاب کی سب سے

زیادہ داد تو والد مرحوم ہی دیتے۔ ان کی نیابت میں آپ کو میں داد دیتا ہوں حالانکہ چہ نسبت خاک را بعالم پاک۔ آپ کے مضامین وغیرہ پڑھتا رہتا ہوں اور ان سے بے حد متاثر ہوں لیکن تجزیہ نگار انیس آپ کا کارنامہ ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ ایسے اور بھی کارنامے انجام دیں۔

ڈاکٹر نیر مسعود (لکھنو)

"فرہاد صفت محقق"

فی زمانہ تحقیق وتنقید کا ایک انداز یہ ہے کہ اکابرین نقد ونظر کی آراء تلاش کی جائیں انہیں ایک جگہ نقل کر کے فریضہ تحقیق ادا کیا جائے۔ دوسرا انداز یہ ہے کہ تحقیق وجستجو سے حاصل کردہ آراء سامنے رکھ کر کثرت آراء سے اتفاق کر کے اپنی رائے جلی حروف میں لکھ کر خود کو صاحب الرائے محقق ثابت کیا جائے لیکن بیسویں صدی میں ایک فرہاد صفت محقق ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیس کے صرف ایک مرثیے میں 2156 محاسن اور صنعتوں کی نشاندہی کر کے عالمانہ تنقید کے لیے راستے متعین کر دیے ہیں۔ مرحبا ڈاکٹر تقی عابدی آپ کی اس تحقیق کے بعد اکیسویں صدی میں میر انیس پر جو کام ہوگا وہ روایتی تنقید کی بجائے معنوی کام ہوگا۔

سید عاشور کاظمی (لندن)

"کلاسیکی رنگ"

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی شاعری کا صحیح لطف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو انہیں ذاتی طور پر جانتے ہیں اور ان سے تعلق خاطر رکھتے ہیں کہ وہ شاعروں کے اس کلاسیکی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود بھی اپنی شاعری جیسے ہوتے ہیں۔ تقی عابدی ایک پڑھے لکھے، مہذب، علم دوست، ادب شناس، خوش نما اور خوش گفتار انسان ہیں۔ ان کا حیدرآبادی لب، الفاظ کا مخصوص چناؤ اور استعمال، رکھ رکھاؤ اور چھلکتا ہوا خلوص، ایسی خوبیاں ہیں جو ان کی شاعری میں بھی اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ وہ طبیعتاً اور مزاجاً روایت پسند ہیں چنانچہ ان کے شعری مضامین ہوں یا تراکیب اور ذخیرہ الفاظ---ان سے متعلق ہر چیز پر کلاسیکی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

امجد اسلام امجد (لاہور)

"قلبی تعلق"

تقی عابدی کا مرثیے سے ایک قلبی تعلق رہا ہے اور اس قلبی تعلق کا سبب ظاہر ہے کہ واقعہ کربلا اور آل بیت سے محبت ہے مگر تقی عابدی کا شمار ان لوگوں میں ہرگز نہیں ہے جو مرثیے اپنے کانوں سے سنتے ہیں اور آنکھوں سے بہا دیتے ہیں۔ تقی عابدی نے مرثیوں کو سنا، مرثیوں کو پڑھا اور مرثیوں کی فکر اس کی سماعت سے دل اور دماغ تک کا سفر کرتی چلی گئی وہ مرثیوں پر رویا ضرور مگر اس کو معلوم تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے اور اس کا ذہن محسوسات کا تجزیہ بھی کرتا رہا اور اس نے یقین کر لیا کہ واقعہ کربلا ایک عالمی سانحہ ہے اس عالمی سانحہ پر میر انیس نے جو کچھ لکھا اس سے تقی عابدی بڑا متاثر تھا اور اسی تاثر نے تقی عابدی کو مرثیہ نگاری اور میر انیس کا مطالعہ کرنے پر اکسایا۔ تقی عابدی کے ہاں میر انیس کا گہرا مطالعہ موجود ہے مگر اس مطالعہ کی حقیقت کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ مجتبیٰ حسین کی اس بات پر غور کر لیا جائے۔ مجتبیٰ حسین نے لکھا کہ میر انیس پر لکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ آدھے انیس ہوں اور واقعہ کربلا کو سمجھنے کے لیے پورا انیس ہونا ضروری ہے۔ تقی عابدی نے میر انیس کے مرثیوں میں اترنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس موقع پر کراروی کا یہ قول بھی نذر قارئین کر رہا ہوں کہ اہل بیت کی محبت کے بغیر انیس کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ تقی عابدی ان تمام راستوں سے گزرا ہے اور اس نے ان تمام راستوں سے وہ تمام پھول چن لئے ہیں جو ایک نگار انیس کی تخلیق کے لیے ضروری تھے۔ یہی پھول گلدستہ بنانے میں کام آئے ہیں۔

واصف حسین واصف (نیوجرسی)

"کلیدی معلومات"

شمالی امریکہ میں آج تک نقاد و ترویج اردو صرف زبانی جمع خرچ تک محدود رہی ہے۔ بہت ہوا تو کچھ اہل ذوق نے ہندو پاکستان سے چند خوش گو شعرا کو جمع کیا اور کسی انجمن کے تحت ایک مشاعرہ کی طرح ڈال دی۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں سنجیدہ مضامین بار نہیں پاتے اور گفتگو اور فکر

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دو گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

قسم کی شاعری سے آگے نہیں بڑھتی۔

ایسے ماحول میں ایک طویل عرصے سے ڈاکٹر تقی عابدی نے بڑی جرأت اور مشقت سے کام لیکر ٹھوس ادبی خدمت کا بیڑا اٹھایا اور مسلسل تحقیقی اور فکر طلب مضامین لکھ کر اہل ذوق کے لیے تسکین کے اسباب مہیا کیے۔ ان کی تحریروں کو پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جو بھی کام کرتے بہت دیانت اور ذمہ داری سے کرتے ہیں۔ اس کا زندہ ثبوت ان کی تحریریں ہیں۔ ہندو پاکستان کے معروف ادیب حضرت ضمیر جعفری نے عابدی صاحب کی خدمات دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ عابدی صاحب "تنہا رکے کے ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں" اس امر سے سب اہل علم بخوبی واقف ہیں کہ علم عروض و علم بیان اردو نظم و نثر کے حوالے سے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر اس سے پہلے بہت سے کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ تاہم عابدی صاحب نے اس مشکل موضوع پر یہ کتاب تالیف کر کے کم سے کم شمالی امریکہ میں ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے اور ایک قابل تقلید روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ کتاب میں ابتدائی دور کی شاعری سے جدید شاعری کے نمائندہ رجحانات پر عابدی

صاحب نے کلیدی معلومات فراہم کی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شمالی امریکہ کے تارکین وطن ادبا اور اہل ذوق طبقہ اس مفید و سود مند کتاب سے بھرپور استفادہ کریگا اور شمالی امریکہ میں اردو کے ایام جاہلیت میں عابدی صاحب کے اس پیپر لنکا کو بہت ستائش کی نظروں سے دیکھا جائیگا۔

عروج اختر زیدی (ٹورنٹو، کینیڈا)

''عرفانی زاویے''

ڈاکٹر تقی عابدی کا اندازِ فکر و عمل ایسا ہے کہ اگر علامہ اقبال سے دشتِ جنوں میں ملاقات ہو جائے تو ''اقبال کے عرفانی زاویے'' جیسی عارفانہ تصنیف شائع ہو جاتی ہے اور اگر اسی دھن میں اقبال کے دوسرے پہلو میں جا بیٹھیں تو ''شکوہ، جواب شکوہ کا تجزیہ'' پیش کر دیتے ہیں۔ ''اقبال کے عرفانی زاویوں'' میں شامل مضامین کے چند عنوانات ملاحظہ فرمائیں: ''اقبال کی دعا''، ''علامہ اقبال فنا فی الرسولؐ''، علامہ اقبال اور نیابت رسولؐ''، ''علامہ اقبال کی نعتیہ شاعری''، ''اقبال کا تصورِ زمان و مکان''۔ ان عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ادب کے بازار میں کس جنس کے خریدار ہیں۔ اسی طرح جب اللہ خان انشا پر کتاب لکھی تو اسے کسی موجودہ دور کی مشہور ادبی شخصیت سے منسوب کرنے کی بجائے اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ملا لقا بائی کے نام کیا اور ساتھ ہی اس محترمہ کی عظمت کا ایک عجیب و غریب تعارف کروایا کہ اس محترمہ نے شاہی خطاب کے دوران 500 روپے کی بے طلب ہنڈی بھجوا کر ان کا دل مول لے لیا اور انشا خود اپنا تعارف کرواتے ہیں (شعر میں بوتراب اور خاک کی نسبت غور طلب ہے)

بندہ بوتراب ہے انشا
شک نہیں اس کی خاکساری میں

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کو جتنا بھی قریب سے دیکھیں ان کی ذات میں دو جذبے سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک پنجتن پاک اور دوسرے اردو زبان۔ پنجتن پاک اور آل اطہار علیہم السلام سے تو انہیں عشق ہے اور اردو زبان سے وہ اس عشق کے اظہار کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے پیار کرتے ہیں۔ آپ کی تصانیف ''رموز شاعری'' اور ''عروض فن'' اردو زبان سے آپ کی والہانہ محبت کی ہی دلیل ہیں۔ اپنی زبان دانی کو اظہار عشق کا ذریعہ بنانے کا بہترین مظاہرہ انہوں نے اپنی تالیف 'تجزیہ یادگار انیس' میں کیا ہے۔ میر انیس کے ایک مشہور ترین مرثیے کو اپنے ممدوح کے عقیدت مندانہ طواف کا پیمانہ بنا کر ڈاکٹر صاحب اس مرثیے کے بند بند کے حسن کو چوم چوم چلے گئے اور ایک کتاب مرتب ہوتی چلی گئی۔ اس کے علاوہ مرثیہ پر اعتراضات کے جوابات تجزیے کی مکمل جدول جس میں مرثیہ کے 2129 محاسن اور صنعتوں کی تعداد درج ہے۔ عربی ترجمے کا نمونہ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کا کیا ہوا مکمل انگریزی ترجمہ ایسے لگتا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب نے انیس کے مرثیے کو اپنی لیب میں خوردبین کے نیچے رکھا ہوا ہو۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اگر کوئی ان کا ذرہ برابر بھی مددگار ہوا ہوگا تو اس کی جزا امام سے وہ روزِ محشر ضرور عطا کریں گے۔

سید افتخار حیدر (ٹورنٹو، کینیڈا)

''بیش قیمت گہر''

میرے نزدیک ڈاکٹر تقی عابدی کا شمار گنتی کے اُن چند لوگوں میں ہوتا ہے جن کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور جو کہا جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کاوشوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی تمام تر توانائیوں کو اردو ادب کے کسی ایک گوشے کی جانب مرکوز نہیں کیا بلکہ وہ اردو کے گیسوئے پریشان کو سنوارنے کے قائل ہیں۔ نظم ہو یا نثر، مرثیہ ہو یا منقبت، حمد و نعت کا میدان ہو یا تغزل کا شہر، اردو تحقیق کی بات ہو یا مقالہ نگاری کا تذکرہ..... ڈاکٹر صاحب کی خدمات اور تخلیقات پرستارانِ اردو سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آپ کی تصانیف کو پڑھ کر قاری کو اندازہ ہو جائے گا کہ آپ نے اردو کے علاوہ فارسی طرز شاعری پر کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس بحر بیکراں سے کتنے بیش قیمت گہر حاصل کئے ہیں جن سے آئندہ نسلیں مستفید ہوں گی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد (نیوارک)

''عمیق محقق''

ڈاکٹر تقی عابدی پیشے کے اعتبار سے تو میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن انہوں نے میر انیس پر اتنا کام کیا ہے کہ وہ کم از کم ایک پی ایچ ڈی کے بھی مستحق ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو زبان کی خدمت میں جتنا وقت صرف کیا ہے اور جس لگن سے کام کیا ہے اتنا تو انہوں نے اپنے اصل پیشے کے لیے بھی نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی کا فطری رجحان ادبی ہے۔ بیس پچیس سال سے انکا شوق اردو فارسی ادب سے رہا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی کئی درجن تصانیف منظر عام آ چکی ہیں اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''تجزیہ یادگار انیس'' ہے جس کی تیاری میں پانچ سال کا وقت صرف ہوا اور جو ساڑھے سات سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر نیر مسعود کا کہنا ہے کہ اس کتاب سے دھیرے دھیرے کئی دہائیوں کے بعد لوگ آشنا ہوں گے۔ تجزیہ یادگار انیس میں ڈاکٹر تقی عابدی نے مغربی طرز اور مشرقی رجحانات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس تحقیق میں انہوں نے میر انیس کے ایک مرثیے کے ہر شعر کو حرف بحرف شاعر کے افکار و تخیل کا جائزہ لیا ہے اور اس طرح حرف نگاری اور شاعر کے دماغ کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ اس طرح کی عمیق تحقیق کی اردو میں مثال نہیں ملتی ہے۔

ثروت اقبال (لندن)

''سینئر سپر''

ڈاکٹر سید تقی عابدی کام کرنے والے، کام دینے والے اور کام لینے والے بھر

جہت سینز پر شخص ہیں۔ پھر جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اُن کی شخصیت کام کرنے میں بھی اور کام لینے میں اور کام دینے میں بھی اس قدر پر کشش ہے کہ وہ ہر طرف ڈٹ کر نکلتے اور سامنے آتے ہیں۔ میرا مطلب اُن کے سینز پر رہنے سے بھی ہے کہ کیا مجال جو وہ کبھی جھکتے ہوں یا تھکن کبھی ان کے آس پاس بھی پھٹکی ہو۔ مگر ابھی وہ اتنے معروف نہیں ہوئے تھے کہ مجھے اُن کی کتاب پر دیباچہ کے طور پر کچھ لکھنے کا موقع ملا۔ مجھے خوشی یہ ہے کہ میں نے اپنے لکھنے میں اُن کے مستقبل کو ایک طرح سے گرفت میں لے لیا تھا یعنی میں نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ شخص بہت کام کرنے والا ثابت ہوگا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا کہ ان حضرت نے کس طرح اور کیسے کیسے بڑے اہلِ قلم پر کام کیا؟ اور کتنا کام کیا ہے۔

میر انیس کی طرف متوجہ ہوئے تو اُن کا ایک معروف مرثیہ ”جب قطع کی مسافت آفتاب نے“ ایسے شاندار انداز میں شائع کیا کہ لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اس ”یادگار مرثیہ“ کے 197 بند ہیں جن کو تقی عابدی نے نہایت عمدہ چکنے کاغذ پر مع تصویر ایک ہزار صفحوں سے زیادہ پر چھاپا ہے۔ اور پھر یہی نہیں کہ اس مرثیہ کے ہر بند کے سامنے یہ بتایا کہ اس بند میں کل کتنے الفاظ ہیں ان میں سے کتنے اردو کے ہیں کتنے فارسی اور کتنے عربی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ اس میں کون کون سے صنائع معنوی ہیں کون کون سی صنائع لفظی اور کیا کیا محاسن علم بیان ہیں۔ بظاہر یہ بات معمولی نظر آتی ہے لیکن آئندہ کام کرنے والوں کے لیے تقی عابدی نے اپنے انداز کا خوب کام کر دکھایا ہے۔ لیکن انیس کے اس ”یادگار مرثیہ“ کی خوبی یہاں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ تقی عابدی نے اس مرثیہ کا وہ عربی ترجمہ بھی اس کے ساتھ شائع کیا ہے جو کبھی مولانا علی نقی صاحب نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان حضرت نے اس مرثیہ کا وہ انگریزی ترجمہ بھی ساتھ رکھا ہے جو انگلستان کے ڈیوڈ میتھیوز نے ”بیٹل آف کربلا“ کے نام سے کیا تھا۔ ان ترجموں سے اردو زبان کی طاقت اور وسعت ابلاغ کا پتا چلتا ہے۔

ہاں میں نے جو تقی عابدی صاحب کے بارے میں یہ کہا ہے کہ وہ کام کرنے میں سینز پر آدمی ہیں اس سے میری مراد یہ بھی ہے کہ تقی عابدی صاحب جب کام کرنے پر آتے ہیں تو اس کام کے راستے کی تمام مشکلات کو سر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب وہ کام سامنے آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ کام ہر طرح سے آراستہ پیراستہ ہو کر سامنے آیا ہے۔ عابدی صاحب اپنے ہر کام کی سطح کو اتنا اٹھاتے اور سنوارتے ہیں کہ پھر وہ کام ہر آئندہ کام کرنے والے کو طرح طرح سے ترغیب دیتا ہے کہ وہ کمر بستہ ہو اور اس کام کو آگے بڑھائے۔ اسی بات کو تنقیدی زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ تقی عابدی صاحب آئندہ ادبی کام کرنے والوں کے لئے اتنا اثاثہ مہیا کر رہے ہیں کہ وہ مدتوں تک کام کو آگے بڑھانے میں کوئی کمی محسوس نہیں کریں گے۔

پروفیسر مشکور حسین یاد (لاہور)

ظلِ جلیل

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب طرز نگار اور درد مند دل رکھنے والے ایک بے مثال انسان ہیں۔ آپ نے مغرب کی سرزمین پر رہ کر بھی علم و ادب کی ایسی شمع روشن کی ہے جس سے ہمارے قلوب و اذہان منور ہو رہے ہیں۔ آپ ایک ہمہ جہت نگار، محقق، ادیب اور شاعر ہیں۔ جدید اور قدیم ادب پر ڈاکٹر صاحب کی بہت گہری نگاہ ہے۔ انہوں نے جہاں ایک طرف تنقید کو نیا زاویہ عطا کرنے کی سعی بلیغ کی ہے وہاں دوسری جانب تحقیقی کمالات بھی بے پناہ کئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رثائی ادب کے مسیحا کے طور پر جانے جاتے ہیں مگر آپ نے انیس و دبیر، غالب، اقبال، انشاء اللہ خاں انشاء اور حضرت نجم آفندی کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو کس کس مرحلے پر کس طرح کے مسائل درپیش رہے۔ ہر چند ڈاکٹر صاحب نے ”کائنات نجم“ مرتب تو کر دی لیکن ابھی جناب نجم آفندی کا بہت سا کلام تشنہ اشاعت ہے۔ مجھے امید ہے ڈاکٹر صاحب اپنے کام پر نظر ثانی فرماتے ہوئے نجم آفندی کا مکمل اور مبسوط کلام قارئین کے سامنے ضرور لائیں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اردو کے اس ظلِ جلیل کی کاوشات میں بحیثیت قاری، تقاریر اور تجاویز شامل رہا ہوں۔ میں ڈاکٹر صاحب کی ہمت مردانہ اور جرأت رندانہ کو سلام پیش کرتے ہوئے ادارہ چہار سو اور اس کے مدیر گلزار جاوید کو اس خاص اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن (لاہور)

مشاق طبیب

ہم اور آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ ڈاکٹر صاحب سید تقی عابدی پیشے کے لحاظ سے مشاق طبیب ہیں لیکن دنیائے ادب میں ایک باریک بیں تجزیہ نگار، سخن رس نقاد، دور بیں محقق، شاعر دل نشیں اور مہذب و شائستہ انسان کے طور پر بہت عمدہ شہرت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے رثائی ادب کے معتمد اہل قلم کی نسبت جس قدر رجحان ساز شناسائی سے نئے امکانات اور حوالے دریافت کئے ہیں وہ اپنی جگہ بہت اہمیت اور معنویت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک اور اہم کارنامہ شاعر مشرق علامہ اقبال کی نسبت بطور طبیب اپنے منصب کی پاسداری کرتے ہوئے تاریخ اردو میں پہلی بار کسی عظیم اہل قلم کی بیماریوں کی تشخیص، تحقیق، تجزیہ اور علاج مستند حوالوں اور قدیم و جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں کچھ اس طرح کیا ہے کہ علامہ اقبال کو آخری ایام میں لاحق امراض کے حوالے سے یہ کتاب نہایت مستند حوالہ اور اپنی نوعیت کی پہلی دستاویز ہے جس کی مدد سے نہ صرف عاشقان اقبال بلکہ اہل علم اور اہل ادب بے پناہ فیضیاب ہوں گے اور اقبالیات کے باب میں بہت سے نئے اضافے بھی شامل ہو سکیں گے۔

تسلیم الٰہی زلفی (کینیڈا)

’’شاعری کی دکاں‘‘

ڈاکٹر سید تقی عابدی

مشاعرہ

جیسا دل چاہے جس کو پڑھا دیجئے
شاعروں کو بلا کر لڑا دیجئے

جب وہ آپس میں دست و گریباں ہوں
ان کو مجوب کر کے چھڑا دیجئے

فکرِ منصور جن کے سروں میں نہیں
اُن بچاروں کو پھانسی لگا دیجئے

داد دیتے رہیں جو فقط آپ کو
ان کو محفل میں آگے بٹھا دیجئے

مطلع سن سن کے متلی سی ہونے لگی
کچھ کھٹائی غزل کی چکھا دیجئے

ناگری خط سے جو دیوتا مت ہوئے
ان کو اردو کا انشا لکھا دیجئے

چار اشعار کب تک سنائیں گے آپ
کوئی تازہ غزل بھی سنا دیجئے

ہم تو ہیں ناظمِ بزم کے ہاتھ میں
اب اٹھا دیجئے یا بٹھا دیجئے

ہر مقامی بھی رکھتا ہے اپنا مقام
کیا مقام آپ کا ہے بتا دیجئے

کوئی شاعر بھی ترتیب سے خوش نہیں
رسم ترتیب کو اب اٹھا دیجئے

شاعری کی دکاں پر ہے پیر مغاں
آیئے کھوٹا سکہ چلا دیجئے

شاعرِ عصر کو کر کے مہمان گھر
اپنی تعریف میں کچھ سنا دیجئے

دے کے کچھ شعر از راہِ لطف و کرم
ہم نشینوں کو شاعر بنا دیجئے

تبصرہ شاعروں پر کریں جب کبھی
میرؔ و غالبؔ سے آگے بڑھا دیجئے

بزمِ شاعر تھی جو مرکزِ فن کبھی
اس کو شعراء کا دنگل بنا دیجئے

ماہرین عروضی سے پوچھے کوئی
آپ کیوں مستند ہیں بتا دیجئے

بات حق کی ہے کڑوی اگرچہ تقیؔ
حوصلہ کیجیے اور سنا دیجئے

بچوں کی ہنسی

کتنی معصوم ہوا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
پھول کی طرح کھلا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
تتلیوں جیسی اُڑا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
گرد کو بادِ صبا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
دل کے دروازے کو وا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
خود بخود دل میں جگہ کرتی ہے بچوں کی ہنسی
کھل کھلا کر جو ہوا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
لگتا ہے جیسے دعا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
ہے چھلکتے ہوئے سونے کی ڈلی
ننھے بچوں کی ہنسی
جس کو سنتے ہی ہر اک شخص کو بچپن سا لگے
دور کے دیس میں جیسے کوئی ہمدرد ملے
جس طرح کھلتے ہوئے پھول کی خوشبو مہکے
چاندنی رات میں جیسے کوئی نغمہ بہکے
جس طرح دل کے کنویں میں کوئی پتھر ڈالے
جیسے بچھڑے ہوئے معشوق کو عاشق پالے
جیسے چوٹی پہ پہاڑوں کی سحر جاگی ہو
جیسے ہرنی کوئی گھبرائی ہوئی بھاگی ہو
لگتا ہے جیسے بیاباں میں کوئی شمع جلی
کھل گئی دل کی کلی
سن کے بچوں کی ہنسی
میٹھی آواز میں ساغر کی کھنک بولتی ہے
چشمِ شفاف میں شیشے کی چمک بولتی ہے
چاندنی دشت میں دریاؤں کو بھرنے والی
روشنی گھر کی منڈیروں پہ اترنے والی
ایسا احساس ہوا
مل گئی مجھ کو خوشی
سن کے بچوں کی ہنسی

یہ تمنا ہے مری
اے خدائے ازلی
لے لے یہ میری ہنسی
جو بناوٹ سے بھری
جو دکھاوے سے سجی
جو سیاست سے بنی
دے دے پھر مجھ کو وہی
مرے بچپن کی ہنسی
مری گم گشتہ خوشی
لو بہاروں میں ڈھلی
وہ ستاروں کی گلی
جو محبت سے بھری
جو حقیقت سے سجی
بھول جاتا ہوں جسے سوچ کے میں تنگ دلی
کاش مل جائے وہ کھوئی ہوئی بچپن کی ہنسی
آئی ہاتف کی صدا رو تو حقیقت ہے یہی
جس میں تبدیلی نہیں کوئی وہ سنت ہے یہی
وقت گزرا ہوا پلٹا ہے نہ پلٹے گا کبھی
بچپنا چھوڑ کے اب دیکھ بڑھاپے کی گھڑی
اچھی لگتی ہے فرشتوں کو بھی بچوں کی ہنسی
اس لیے خواب میں بچوں کو ہنساتے ہیں وہی
عرش اور فرش کی ہے جس پہ پسندیدہ خوشی
آؤ پھر مل کے کریں عام یہ بچوں کی ہنسی

کتنے بچے ہیں کہ ہنستے نہیں اس دنیا میں
پیدا ہو کر بھی جو ہنستے نہیں اس دنیا میں
خون کابل میں رواں سرخ فلسطیں کی گلی
دیکھی جاتی نہیں اب بوسنیا میں بھی خوشی
ننھے بچوں کی ہنسی
جن کے سر پہ ہے کھڑی
تیرہ و تار گھڑی
جو مصیبت سے بھری
روتے بچوں کو ہنسا دے یہ عبادت ہے بڑی
پونچھ دے آنکھوں سے بہتی ہوئی آنسو کی لڑی
بانٹ بچوں میں خوشی
دے دے بچوں کو ہنسی
حجِ اکبر ہے یہی
آبِ کوثر ہے یہی
نیک کاموں میں تقی
سب سے بہتر ہے یہی

تکمیلِ رسالت

نعتیہ رباعیات

(غیر مطبوعہ)

اے رحمتِ باری کے خزانے والے
ہے آج مسلماں کا مسلماں دشمن
اسلام پہ چھٹتے ہیں زمانے والے
اے دشمنوں کو دوست بنانے والے

مقصودِ اوّل ہوئے ہیں مقصد ہو کر
منظور یہی تھا ناظرِ قدرت کو
مجموعۂ التفاتِ بے حد ہو کر
محمودِ خدا آئے محمدؐ ہو کر

وہ جلوۂ اولینِ عالم آیا
مجروح جو ہیں ان کو مبارک ہو صبا
وہ فخرِ حیاتِ نوح و آدم آیا
ہر زخمِ جہاں کے لیے مرہم آیا

ممکن نہ تھا اللہ کا عرفاں ہونا
اے محسنِ انساں ترے صدقے میں
دشوار تھا یہ مرحلہ آساں ہونا
انسان کو آ گیا ہے انساں ہونا

اللہ کی رحمت ہے محمدؐ کے لیے
ہوتے نہ محمدؐ تو نہ ہوتا کچھ بھی
تکمیلِ رسالت ہے محمدؐ کے لیے
کونین کی خلقت ہے محمدؐ کے لیے

طاقت کی بلندیوں پہ چڑھتے رہیے
جس بزم میں ہو ذکرِ رسولِ عربی
فردوس کے راستے پہ بڑھتے رہیے
سنتے رہیے، درود پڑھتے رہیے

اللہ کا عرفان نہیں ہو سکتا
دل میں نہ محبت ہو محمدؐ کی اگر
حاصل کوئی فیضان نہیں ہو سکتا
انسان کبھی انسان نہیں ہو سکتا

کچھ فخر نہیں فخرِ اَب و جد ہونا
اس حد سے نہ بڑھ سکے گا کوئی آگے
یا صاحبِ تخت و تاج و مسند ہونا
انسان کی ہے معراج محمدؐ ہونا

صبا اکبرآبادی (●)

جوش میں اسکی رحیمی

میں خدا کے سامنے تھا۔ درمیاں کوئی نہ تھا
مولوی۔ مفتی۔ فقیہہ و حکمراں کوئی نہ تھا

جو بھی کہنا تھا مجھے دل کھول کر کہتا رہا
آنسوؤں کا ایک دریا رات دن بہتا رہا

جب وہ میری سن رہا تھا کسقدر نزدیک تھا
میرا دل پُر نور تھا۔ سارا جہاں تاریک تھا

جوش میں اسکی رحیمی۔ اوج پر اسکا کرم
مرحبا محرمِ حرم۔ تقدیس و عظمت پر قدم

○

محمود شام (کراچی)

یا غنیَ اللہ!

تری توصیف معراجِ بیاں ہے خوش بیانوں کی
ہو جن میں ذکر تیرا خوش نصیبی ان زبانوں کی
تری یہ شانِ خلاقی دو عالم تجھ سے کہتا ہے
تری خاطر ہی کی تخلیق میں نے آسمانوں کی
کہ تیرے نقشِ پا کی مُہر نوریں ان پہ لگتے ہی
چمک اٹھیں جبینیں ان پہ پھیلی کہکشانوں کی
قیادت تجھ کو بخشی کاروانِ عشق و مستی کی
امانت تجھ کو سونپی دین و دانش کے خزانوں کی
بنے جو گلّہ بانِ آخر کو رہبر بھولے بھٹکوں کے
امامت ہم نے لکھ دی تیرے نام ان گلّہ بانوں کی!
لدا تھا تیرا سامانِ تجارت جن کے اونٹوں پر
صدا خوانی سنائی اب بھی دے ان ساربانوں کی
پکارا وقت نے ہر موڑ پر اے منتظر تجھ کو
طنابیں کھنچ گئیں تیرے لیے سارے زمانوں کی
مزیّن تجھ سے سارے صحیفوں کی لوحِ پیشانی
ہے تیری روشنی سے روشنائی لامکانوں کی
محبت کی سپاہ نامُسلح سے کمک لے کر
کرے تو تاکہ بندی ظلم و وحشت کے ٹھکانوں کی
ہے اک ادنیٰ کرشمہ تیرے انصاف و تدبّر کا
کہ صیاد آپ کرتے ہیں حفاظت آشیانوں کی
تو صورت دیکھتے ہی حالِ دل کا بھانپ لیتا ہے
سمجھتا ہے زبانِ حال سارے بے زبانوں کی
فضائیں گونجتی ہیں تو بہ نغماتِ مدحت سے
منتظر ہیں عدو گنتی سے تیرے مدح خوانوں کی!

عبدالعزیز خالد (واہ)

نعت رسول ﷺ

آؤ کہ کریں درد کا اظہار مسلسل
کرتے ہیں نوازش مرے سرکارؐ مسلسل

سرکارؐ سے درینہ تعلق کی بنا پر
رہتا ہے زمانہ مجھے آزار مسلسل

یہ دل بھی خالی نہ رہے ذکر نبیؐ سے
آنکھیں بھی رہیں عشق میں سرشار مسلسل

اے عشق نبیؐ ایسی تڑپ مجھ کو عطا کر
میں کرتا رہوں شوق کا اظہار مسلسل

فردوس کا حقدار وہی آدمی ہو گا
کرتا ہے تری ذات سے جو پیار مسلسل

اُٹھ اُٹھ کے ہر اک رات کی خاموش فضا میں
اُمت کے لیے روتے تھے سرکارؐ مسلسل

آ کر تو خبر لیجیے اے سرور عالم
تکلیف میں ہے آپ کا بیمار مسلسل

اس دور میں اے شاہ عرب شاہ مدینہ
آتے ہیں نظر کفر کے آثار مسلسل

خوش ہوتے ہیں اُس شخص سے صابرؔ شہ بطحا
توحید کا جو کرتا ہے پرچار مسلسل

صابر عظیم آبادی (کراچی)

مدینے کی

دیکھی ہے زمیں جب سے سرکارؐ مدینے کی
دلکش ہیں حسیں یادیں سرشار مدینے کی!

پوچھے تو رو رو کر احوال مدینے کا
کیا بات سنائیں اے یار مدینے کی

رحمت کی گھٹائیں تھیں ہر سمت مدینے میں
پُر نور فضائیں تھیں دلدار مدینے کی

اک بار مدینے سے جو ہو کے چلا آیا
اس شخص سے آتی ہے مہکار مدینے کی

جب مسجد نبویؐ میں سجدے تھے کیے ہم نے
تو سر پہ بندھی دیکھی دستار مدینے کی

دنیا کے مصائب کو یہ دل سے بھلا دیوے
دھرتی ہے عجب دیکھی غم خوار مدینے کی

سجادؔ سکوں حاصل ہوتا ہے یہاں آ کر
ہر ایک گلی دیکھی شہکار مدینے کی

سجاد مرزا (گوجرانوالہ)

بوب کا چائے خانہ

اسد محمد خان (کراچی)

وہ اپنے سیاروں میں جزیرہ لنڈمان جیسی کوئی جگہ تھی کیوریٹی اور تجارت کے اعتبار سے محفوظ، اور سب معاملوں میں بالکل غیر منظم بلکہ چھوڑ دی گئی جگہ ـــــ میں اور میرا میزبان پہلی بار شہر کی سیر کو نکلے تھے۔

شام ہوتے ہوتے، میرا میزبان، مجھے ایک پرانے ٹی ہاؤس میں لے گیا جو شاید بیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوا تھا۔ یہ چائے خانہ شہر لندن کے رہائشی، ایک جنگلی چائے نوش بوب پگل نے بیچ بازار میں قائم کیا تھا، سو خوب چلتا تھا۔

ٹی ہاؤس کھولنے والے پگل صاحب نے... جو خیر سے بیشتر کنوارے رہے، اسی زمانے میں ایسا کچھ انتظام کر دیا تھا کہ ان کے بعد لندن شہر کی ایک فلاحی تنظیم نے یہاں آکر اس ٹی ہاؤس کا نظم و نسق سنبھال لیا تھا۔ یہ فلاحی ادارہ سو برس سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی، بڑی "لیاقت" سے بوب کے چائے خانے کو سنبھالے ہوئے تھا۔

منتظم فلاحی ادارے پر... اور جملہ گاہکوں پر، آں جہانی بوب کے (غیر) قانونی مشیروں نے ضابطے کی کچھ پابندیاں عائد کی تھیں۔

ضابطے کے مطابق، ٹی ہاؤس کی انتظامیہ پر، اور گاہکوں پر، یہ ایک بات لازم تھی، اور انھیں بہر صورت یاد رکھنی تھی کہ یہاں وہ اعلیٰ درجے کی پتیوں سے بنائی گئی چائے میں، کسی بھی مرحلے پر، دودھ غیرہ ملانے کے مجاز نہیں ہوں گے (پیرا ٹی)۔

موجودہ منتظمین کی طرف سے، بار بار ضابطے کی خلاف ورزیاں ثابت ہو جانے کی صورت میں پگل ٹرسٹ، کسی بھی وقت ٹی ہاؤس کا نظم و نسق اس ادارے سے لے کر، تجویز کیے گئے، دوسرے تیسرے یا چوتھے کسی ادارے کے سپرد کر سکتا تھا۔

واضح رہے کہ بیان کیے گئے اداروں کی تفصیل بنیادی دستاویزات میں درج نہ تھی تاہم، اُن اداروں کے نگراں اور جاسوس وغیرہ بوب پگل ٹرسٹ کے خرچ پر، وقتاً فوقتاً یہاں آکر چھاپے وغیرہ مارتے رہتے تھے۔

گاہکوں کی خلاف ورزی پر، انتظامیہ کو ایک سادہ سی کارروائی کی ہدایت کی جاتی تھی جو یہ تھی کہ خلاف ورزی کرنے والے گاہک یا گاہکوں کو (خواہ ان میں خواتین ہی کیوں نہ شامل ہوں) معذرت کے ساتھ ٹی ہاؤس کی حدود سے نکل جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ایسا کچھ بندوبست کیا جائے کہ خلاف ورزی کا ارتکاب کرنے والے گاہک دوبارہ ٹی ہاؤس کی حدود میں داخل نہ ہونے پائیں۔

ٹی ہاؤس کی اپنی بیکری میں جملہ قسم کے بسکٹ، گلچے، کیک وغیرہ تیار کیے جاتے تھے۔ ان بسکٹوں، بنوں، کیکوں کو کسی بھی صورت میں چائے یا کسی اور مشروب میں تھوڑا ڈپ کر کے، پورا ڈبو کے یا تر کر کے کھانا منع تھا۔ بچوں اور عمر رسیدہ مردوں عورتوں کو بھی اس ضابطے کی پابندی کرنا ہوتی تھی۔ کچھ بھی کھا پی کر بلند آواز میں بُرپ کرنا، ہچکی یا ڈکار لینا، اوّل درجے کی بے ضابطگی تھی۔ گاہکوں کا اونچی آواز میں باتیں کرنا، رونا گانا، کسی طرح کی عبادت کا گیت یا اشلوک پڑھنا، تلاوت کرنا اور وجود مطلق، یعنی اپنے پروردگار سے بلند آواز میں مخاطب ہونا، حدیہ کہ اس (مطلق) کی یاد دہانی اس طرح ثنا کرنا کہ قریب بیٹھا آدمی بھی سن لے، بے حرمتی اور دکھاوے کی ذیل میں آتا تھا۔ یہ سب کرنے والے گاہک کو یاد دلایا جاتا تھا کہ ٹی ہاؤس کی مغربی دیوار کے ساتھ بہت سے ساؤنڈ پروف کیبن بنے ہیں جہاں رونے گانے والوں، اور تلاوت کرنے، مخاطب ہونے اور اونچی آواز میں باتیں کرنے والوں کے لیے مناسب نشستیں اور پرائیویسی فراہم کی گئی ہے۔ تو اگلی بار یہ بات بھولنے والے گاہک کو کسی بھی ساؤنڈ پروف کیبن میں جانا ہوگا۔

یہ ساری جھکی پن یا کچھ پابندیاں... سختیاں، اپنی جگہ: مجھے تو اس ٹی ہاؤس میں کھانے پینے کی چیزوں کا معیار اور ان کی قیمتیں دوسری سب جگہوں کے مقابلے میں مناسب لگیں۔ اس کے علاوہ یہاں گاہکوں کو بیرونِ ٹی، انتظامیہ کی طرف سے ایک خوب صورت سا کارڈ بھی دیا جاتا تھا۔ سال بھر میں سو کارڈ پانے والے گاہک کو تا حیات ممبر کا درجہ مل جاتا تھا۔ ایسے گاہکوں کو ممبری کے پہلے سال، بلوں پر دس فی صد کی چھوٹ دی جاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ تا حیات گاہکوں کو درجہ بدرجہ بڑھتے ہوئے تحائف ملتے رہتے تھے۔ بیس برس کے وفادار گاہک کو دو افراد کے لیے جزیرہ برطانیہ میں تیس دن قیام کا مناسب خرچ اور آنے جانے کا 'فرسٹ کلاس' ہوائی ٹکٹ پیش کیا جاتا تھا۔ ٹی ہاؤس کی شمالی دیوار پر ایسے تمام خوش نصیبوں کی فریم کی ہوئی تصویریں لگی تھیں جو تیس تیس دن کے دورے پر برطانیہ ہو آئے تھے۔

مشرقی دیوار کے متصل کاؤنٹر بنا تھا، ساتھ ہی ایک بھاری بھر کم فرنیچر پیس پر پیتل کا چھپا ہوا ایک بڑا تختہ نصب تھا۔ تختے پر وہ سب ہدایات درج تھیں جو اوپر بیان کی گئیں۔ بورڈ میں ایک پیڈسٹل پر سنگ مرمر سے بنا ایک گنجے انگریز کا شانوں تک کا مجسمہ رکھا تھا۔ وہ انگریز اپنی بے نور آنکھوں سے، بہت سختی کے ساتھ، ناک کی سیدھ میں مستقل دیکھے جا رہا تھا۔

میزبان نے جو کاؤنٹر پر بطورِ مہمان میرا نام درج کرا کے آچکا تھا، میرے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا، " مرا بیدا بوب پگل صاحب کا بُت ہے۔"

اگرچہ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی، تاہم میں نے جواب میں دھیرے سے کہا، "ماشاءاللہ!"

عالم عالم بیگانہ

سلطان جمیل نسیم
(کراچی)

پہلی بار اُلجھن تو ہوتی ہی ہے۔ شروع شروع میں اُلجھن کا شکار میں بھی ہوا۔ لیکن دس پندرہ دن میں خود مجھے یہ محسوس ہونے لگا جیسے میں عادی ہوتا جا رہا ہوں۔

اباّمیاں نے ہم بھائی بہنوں کو کچھ ایسے رکھا تھا کہ ہم اُن کی بات نہایت توجہ سے سنتے اور اُس پر عمل کرنے کی بھی پوری کوشش کرتے تھے۔ اِس کا سبب ہماری سعادت مندی یا اباّمیاں کے رعب داب سے کہیں زیادہ اُن کی بات چیت کا انداز، زبان کی حلاوت اور شیریں لہجے کی تاثیر تھی۔ اللہ نے اُن کے طرزِ کلام میں کچھ ایسا جادو رکھ دیا تھا کہ وہ جو کہتے سننے والے کے دل میں اتر جاتا۔ اور بقول اماں کے یہ سب اِس لئے تھا کہ قرآن اور تفسیر کا علم انہوں نے بچپن ہی سے حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔

ہماری اماں جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں اُن کا کہنا تھا کہ جیسے میں انہوں نے اپنے بھائی بہنوں کو نگی کا ناچ نچوا دیا، اماں باوا کی لوہے کے چنے چبوا دیے، یہ سوچ کر آئی تھی کہ یہ کر زود چیز ہی کیا ہے مگر اِس نے تو پہلے ہی دن اللہ جانے کیا پڑھ کے پھونک دیا کہ اب مصلے پہ بیٹھتی ہوں تو پہلے تمہارے ابا کے لئے دعا کرتی ہوں۔

اباّمیاں نے گھر کا سب سے چھوٹا سا کمرہ اپنے لکھنے پڑھنے کے لئے مخصوص کر لیا تھا جہاں چاروں طرف الماریوں میں کتابیں ہی کتابیں تھیں زیادہ تر عربی کی پھر فارسی اور اردو کی، اِس کمرے میں کوئی میز کرسی نہیں، فرش پر دری اور چادر بچھی رہتی تھی، اباّمیاں کے لکھنے پڑھنے کے لئے ایک ڈیسک اور ایک منقش رحل ہے۔ کمرے میں جانے کے لئے جوتے باہر ہی اتارنے پڑتے ہیں اور اُس کمرے میں اباّمیاں کے صرف خاص مہمانوں کو ہی بلا کے بٹھایا جاتا، جو کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ اباّمیاں کلام پاک کی تلاوت صرف فجر کے وقت کرتے تھے، وہ بھی برآمدے میں جہاں ہم سب بہن بھائی بھی اپنے اپنے طور پر تلاوت کرتے رہتے۔ اماں کا کہنا ہے کہ مہینے بھر میں چار مرتبہ قرآن پاک ختم کر لیتے ہیں۔

جب وہ اپنے کمرے میں ہوتے تو رحل پر قرآن مجید ہوتا اور آس پاس کئی کتابیں کھلی رکھی ہوتیں۔ جن کو وہ حوالے کے طور پر اور وہ بھی ضرورت کے مطابق دیکھتے رہتے اور کچھ لکھتے رہتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب اماں نے میرے کلاوہ میں ساتویں گانٹھ باندھی اور ستاشوں پر نیاز دی۔ ہم سب بہن بھائیوں کی عمر کا حساب اماں نے کلاوے کی گانٹھوں میں باندھ رکھا تھا۔ سب کے کلاوے الگ اور ہر برس کے ہر سب کی پیدائش کے دن ایک گانٹھ کا اضافہ۔ اباّمیاں نے جب پہلی بار یہ عمل دیکھا تو پوچھا۔ "یہ کیا خرافات ہے؟" اماں نے ترنت کہا "دیکھو جی۔ پہلے دن سے آپ کی بتائی باتوں پر عمل کر رہی ہوں۔ اب میری اِس بات میں رکاوٹ نہ کرنا۔"

اُس کے بعد سے اماں کا یہ سالانہ عمل جاری و ساری ہے۔ تو جب میرے کلاوہ میں ساتویں گانٹھ بندھی یعنی جب میں ساتویں برس میں آیا اُسی شام اباّمیاں نے مغرب کی نماز سے واپسی پر مجھے بلا کے اپنے پاس بٹھایا اور ملائم لیکن مستحکم لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے اللہ تعالیٰ کون ہے؟" میں نے اثبات میں گردن ہلا کے کہا۔ "جس نے ہم سب کو پیدا کیا۔" یہ سن کر اباّمیاں نے شاباشی کے انداز میں میری پیٹھ تھپکی اور کہا۔ "اُس پیدا کرنے والے کا پہلا حکم یہ ہے کہ تم پر تم جیسے لوگوں کے جو حق ہیں پہلے وہ ادا کرو پھر نماز پڑھو۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کے بڑے فائدے رکھے ہیں۔ پہلا فائدہ تو یہ کہ آدمی جاگنے سے سونے تک صاف ستھرا رہتا ہے اور یہ تم کو معلوم ہی ہے کہ صفائی کے فائدے کیا کیا ہیں۔ یہ بھی تم نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ اللہ ایک ہے اور اُسی نے دنیا بھی بنائی ہے اور ہم سب کو پیدا بھی کیا ہے

اور ایک دن ہم سب کو اُس کے پاس جانا بھی ہے۔ کیونکہ وہ سارے جہاں کا مالک ہے اِس لئے ہم انسانوں کو اُس نے حکم دیا ہے کہ جب سمجھدار ہو جاؤ تب سے ہمارے پاس آنے تک پانچ وقت کی نماز پڑھتے رہنا، چنانچہ جب ہم اُس کے پاس جائیں گے تو وہ سب پہلے پوچھے گا، بتاؤ تم نے ہمارا کتنا حکم مانا۔ جنھوں نے حکم مانا ہوگا ان کو اللہ کے قریب رکھا جائے گا اور جنھوں نے حکم کی خلاف ورزی کی ہوگی، اُن کو اللہ سے دُور کر دیا جائے گا۔ اِس بات کو یوں سمجھو۔ یہ تمہارا گھر ہے یہاں تمہارے ماں باپ بہن بھائی موجود ہیں، اگر تم کو اِن سب سے دُور کر دیا جائے تو کیا ہوگا؟ تم اکیلے ہو کر خوب روؤ گے، اسی طرح اللہ سے دور کر دیے جانے والے بھی خوب روئیں گے خوب پچھتائیں گے۔ اِس لئے تمہیں بتا رہا ہوں کہ اپنے بڑے بھائیوں کی طرح نماز کے پابند ہو جاؤ۔ جیسے روز

پابندی سے اسکول جاتے ہو، اسکول میں جو کام ملتا ہے وہ کرتے ہو ایسے ہی وقت پر نماز ادا کرو۔ اور پچھتانے والوں میں شامل نہ ہونا۔ اور کبھی کسی کا حق ادا کرنے میں دیر نہ کرنا۔ وہ کہتے رہے میں سنتا رہا۔ اُس وقت

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے دل و دماغ کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں اور
اُن کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ میرے وجود کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ میں
نماز کے لئے لا میاں کے ساتھ مسجد جانے لگا۔

اسکول کے ٹائم ٹیبل سے لے کر آج تک کی مجھے ساری باتیں یاد
ہیں۔ شاید اسی لئے اکثر اماں کہا کرتی تھیں قرآن پاک حفظ کرنے والوں کا حافظہ
اچھا ہوتا ہے۔ اور اب بیوی بھی طنزاً کبھی کبھی کہہ دیتی ہیں کہ میرا حافظہ ہاتھی
کا ہے کہ جو بات ایک مرتبہ سن لی یا دیکھ لی وہ ہمیشہ یاد رہتی ہے۔

مجھے یاد ہے فجر کے وقت سب کے ساتھ اٹھنا، مسجد سے آنے کے
بعد لا میاں کے ساتھ ہم سب بھائی تلاوت کرنے بیٹھ جاتے تھے، بڑے
بھائیوں کو دکان پر بھی جانا ہوتا تھا اس لئے وہ ایک دو رکوع کی تلاوت کے بعد
اُٹھ جاتے تھے، اُس وقت تک کسی بھائی کی شادی نہیں ہوئی تھی اس لئے اماں اپنی
نگرانی میں بہنوں سے ناشتہ بھی تیار کراتی تھیں، جب بھی کوئی نئی چیز بنائی جاتی تو
اماں کی نصیحتوں کا پٹارہ کھل جاتا۔ "دری سیکھ لو، نصیب کس نے دیکھا ہے، کام
کاج آتا ہوگا تو کسی کی محتاج نہیں رہوگی۔"

عموماً ہمارے گھر میں جو ناشتہ تیار ہوتا تھا اُس کی فرمائش ہوتی
تھی۔ اب کسی کی کیا فرمائش ہے مکھن توس کی تو سب کے لئے مکھن توس۔ کبھی
سب کیلئے لڈو پراٹھا۔ کبھی آلو کی ترکاری اور پوریاں۔ لیکن لا میاں کا ناشتہ
وہی رات کا بچا ہوا دال سالن ہوتا تھا البتہ جمعہ کے جمعہ اُن کا معمول تھا کہ فجر کی
نماز کے لئے بھائی کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ کے چورنگی تک جاتے وہاں نکا طوطی
کے پاس نہاری کے لئے برتن اور دسترخوان رکھوا دیتے۔ واپسی پر نہاری اور گرم
گرم نان ساتھ لاتے۔ اماں اچار تیار رکھتی تھیں۔ میرے علاوہ سب ہی کو جمعہ
کے اس ناشتہ کا انتظار ہوتا تھا۔ وہ نہاری کیا ہوتی تھی مرچوں کا دھواں ہوتا
تھا۔ میں تو پہلے ہی دن چوں بول گیا، منہ پھر پیٹ اتنے زور شور سے چیخا رہا کہ
اسکول تو رہا ایک طرف مسجد تک نہیں جا سکا۔ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے
اماں کا لاڈلا تھا میرا حال دیکھ کر انہوں نے یہ وتیرہ بنا لیا کہ نہاری والے دن وہ
میری نان پر مکھن کی پوری ٹکیہ چپڑ کے اس پر گڑ کی ڈلی رکھ دیتی تھیں۔ یا شکر کا
بورا چھڑک دیتی تھیں۔۔۔ کیا مزہ ہوتا تھا۔ اب تو مکھن بھی عنقا ہو گیا ہے اور
اصلی گھی بھی۔ اگر کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اصلی چیز لے بھی آئیں تو کھانے
والوں کا ہاضمہ جواب دے جاتا ہے۔

میرے اسکول کا وقت آٹھ بجے سے ایک بجے تک کا تھا۔ آتے
آتے ڈیڑھ بج جاتا۔ بستہ رکھا، وضو کیا اور لا میاں کے ساتھ مسجد کی طرف چلد
واپس آ کے کھانا کھایا۔ گھنٹہ بھر سویا۔ پھر مولوی صاحب سپارہ پڑھانے
آ جاتے۔ مولوی صاحب کے جاتے ہی عصر کی نماز کے لئے لا میاں آواز دے لیتے۔
۔ عصر کے بعد مجھے محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت تھی۔ سردی کے موسم
میں کوئی کھیل پورا ہی نہیں ہوتا کہ مغرب کا وقت ہو جاتا۔ واپسی پر ماسٹر صاحب کو
موجود پاتا، وہ اسکول کا ہوم ورک کراتے اور آنے والے دن کا سبق سمجھاتے۔
ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد تو میں اماں کی گود میں سر رکھ کے سو جاتا یا پھر اپنی
بڑی بہنوں کے ساتھ کھیلتا رہتا یا اُن کے بنے ہوئے کام بگاڑتا۔ عشاء کے وقت
لا کے ساتھ ہم بھائی مسجد کا رخ کرتے۔ مجھے یاد ہے دسویں پاس کرنے سے
پہلے تک میرے یہی مشاغل تھے لیکن میں نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا اور بی
اے پاس کرنے تک میری پنجگانہ کبھی قضا نہیں ہوئی۔ پنجگانہ تو قضا نہیں ہوئی
لیکن نماز میں یکسوئی بہت عرصے کے بعد نصیب ہوئی، ورنہ ہوتا یہ تھا ادھر نیت
باندھی اُدھر دنیا بھر کے ایسے خیالات نے یلغار کی جن کا سان گمان بھی نہیں ہوتا
تھا۔ خاص طور سے وہ باتیں، جو کالج میں چند لڑکے آپس میں بڑے گندے
طریقے سے کرتے یا کالج کے باتھ روم میں لکھی ہوئی تھیں یا گندی گندی تصویریں
بنا رکھی تھیں۔۔۔ ان باتوں کے اور اُن تصویروں کے ذہن میں آنے سے نماز میں
خلل سا محسوس ہوتا۔ ایک دن میں نے لا میاں کو بتایا کہ نماز میں اکثر دلجمعی پیدا
نہیں ہوتی اور دن بھر کی سنی سنائی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ تو انہوں نے سمجھایا
کہ آدمی کو اسی لئے تو مولود آدم کہا جاتا ہے کہ وہ متضادات کا مجموعہ ہے اس کے
اندر نیکی اور بدی دونوں قوتیں اپنا اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ آدمی کے اچھا ہونے کی
دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق بدی اچھائیوں کی قوت کو بڑھائے
اور یہ قوت اسی طرح بڑھتی ہے کہ عقیدے کے خلاف برائیوں کو زیادہ اہمیت نہ
دے۔ تم کوشش کرو کہ ساری توجہ نماز کی طرف رہے۔ خیالات میں یکسوئی پیدا
کرنا ہی تو عبادت ہے۔

لا میاں کی یہ بات تو میری بارہا دیکھی ہوئی ہے کہ تلاوت کرتے
کرتے اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ پہلی بار میں نے جب یہ دیکھا
تو فوراً آ کے اماں کو بتایا۔ بظاہر میری بات کا کوئی اثر لئے بغیر وہ پانی کا کٹورا بھر
کے لا میاں کے کمرے میں گئیں اور خاموشی سے اُن کے سامنے رکھا اور اُلٹے
قدموں لوٹ آئیں۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ کبھی کبھار دکان پر بھی وہ جا بیٹھتے تھے
وہاں گاہک کو پسند آنے والے کپڑے کی جو قیمت بتا دیتے بھاؤ تاؤ کئے بغیر وہ
اسی قیمت میں لے جاتا۔ اُن کے کئی ملاقاتیوں میں شہر کیا، ملک بھر کے عالم
حضرات تھے۔ بیرون ملک سے تشریف لانے والے لا میاں سے ملے بغیر نہیں
جاتے تھے۔

مقامی لوگ جو کسی مسائل معلوم کرنا چاہتے تھے اُن کے لئے لا
میاں جمعہ کو عشاء کے بعد مسجد میں بیٹھتے تھے۔

ہماری اماں خاصی تنگ مزاج تھیں اور لا میاں سے ذرا بھی خوف
زدہ نہیں، مگر اُن کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہتے ہی بنتی تھی۔ میری دونوں بہنوں کی

شادی دسویں پاس کرتے ہی ہوگئی۔ حالانکہ اماں کہا کرتی تھیں کہ کم عمری کی شادی ایک روگ ہوتی ہے میں جیتے جی اپنی بیٹیوں کو یہ روگ نہیں لگنے دوں گی۔ مگر جیسے ہی مناسب رشتے آئے لامیاں نے فوراً حامی بھر لی اور کسی کی بھی طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھی۔ مسجد میں نکاح ہوا، حاضرین میں چھوارے تقسیم ہوئے اور لڑکے والے سادگی کے ساتھ دلہنوں کو لے گئے۔ اماں نے بیٹیوں کے لئے جہیز کے نام پر جو چیزیں بہت بہت کر رکھی تھیں وہ سب بعد میں بھجوائیں۔ ماشاء اللہ اب دونوں بہنیں اپنے اپنے گھر میں چین کی بنسی بجا رہی ہیں۔ بڑی باجی تو دادی نانی بن گئی ہیں بلکہ خود بھی پچاس کی بھی نہیں ہوئی ہیں۔

میرے دونوں بڑے بھائی جول تھے لامیاں کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ دکان کا پھیرا تو لامیاں کبھی کبھار ہی لگاتے ہیں۔ سارا لین دین بھائیوں کے ہی ہاتھ میں رکھا، وہ ہر ہفتے آمدنی اور اخراجات کا چٹھا لا کے لامیاں کے سامنے رکھ دیتے، اور لامیاں "اللہ برکت دے" کہہ کر بغیر دیکھے واپس کر دیتے۔ لیکن جب بھی کسی ضرورت مند کو دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مانگنے والے کی حیثیت سے زیادہ ہی نکلا۔ یہی حال گھر کا تھا کبھی کسی چیز کی کمی نہیں دیکھی۔ سب کا کہنا اور ماننا یہی تھا دکان کی آمدنی میں یہ ساری برکت لامیاں کی نیک نیتی، خدا پرستی عبادت و ریاضت اور دیانت داری کی وجہ سے ہے کہ نہ کبھی جیب خالی دیکھی نہ گھر میں تنگی ترشی کا منہ دیکھنے کی نوبت آئی۔ گھر بھر کا بوجھ ہماری دکان اٹھاتی تھی میں دو چار دن وہاں جا کے بیٹھتا تھا، لیکن میرے بی اے پاس کرنے کے بعد جب مجھے اس دکان میں بٹھایا گیا تو میں دو تین دن کے بعد گھر بیٹھ گیا۔ وجہ پوچھی گئی تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ دکان کی حالت اس گائے کی سی ہو گئی تھی جو کئی بار بیانے کے بعد سوکھ جاتی ہے دوسرے یہ کہ بھائیوں سے مزاج نہیں ملتا ہے۔ یہی بات شام کو لامیاں کے سامنے لائی گئی اس وقت بھی میں نے یہی کہا کہ اب دوکان کی حالت ایسی ہو گئی ہے جیسے برسوں ایک ہی سیٹ پر اور ایک ہی تنخواہ پر کام کرنے والے سرکاری ملازم کی ہوتی ہے اسلئے اب ہمیں کاروبار تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے پہلے تو میری بات پر وہ مسکرائے پھر اپنے خاص انداز میں سمجھایا کہ ہم ظاہری طور پر جس کام کو اپنے لئے بہتر سمجھتے ہیں اس میں نقصان کا بھی امکان ہوتا ہے اس لئے اپنے معاملات کو اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے، اب رہی بات کاروبار کی تبدیلی کی تو کپڑے کا کام سنت نبوی ہے اور لوہے کا سنت پیغمبری، ان دونوں کاموں کی تجارت میں اللہ تبارک تعالیٰ نے برکت رکھی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ پورا ناپا جائے اور پورا تولا جائے، جو لوگ ناپ تول میں دھوکہ دھڑی کرتے ہیں وہ کبھی فائدے میں نہیں رہتے۔ بھول چوک کی معافی ہے لیکن ڈنڈی مارنے والا ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جس طرح تم بھائیوں کی صورت شکل میں تھوڑا بہت فرق ہے اتنا ہی فرق سب انسانوں کے مزاج میں ہوتا ہے۔ لیکن مزاج کا یہ فرق کسی صورت میں بھی اختلاف میں نہیں بدلنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں تمہارا مزاج اپنے بھائیوں سے کم ملتا ہے اس لئے میں نے پہلے سے ایک دوسری مارکیٹ میں دکان دیکھی ہے تم بھی ایک دو دن میں چل کے دیکھ لو پسند آ جائے تو رجسٹری کرا کے اس میں لاکھ پچاس ہزار کا مال بھی ڈلوا دیا جائے گا۔ اور یہ تمہارا حصہ ہوگا۔

جب پہلے دن میں دوکان کی طرف چلا تو لامیاں نے دکان کی مبارکباد دے کے ساتھ دعائیں کہیں، ستوبیاں سنبھالو تو زندگی پڑی ہے مگر بگڑنے کے لئے ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے۔ میں دکان تک پہنچتے ہوئے سوچتا رہا کہ اس بات کا مطلب کیا ہوا؟ مگر ان کی یہ دوسری بات فوراً سمجھ میں آ گئی، کہ دکان جلدی کھولو دیر سے بند کرو سوت کی طرح گاہک کا بھی بھروسہ نہیں ہوتا۔ اللہ کا شکر ہے دکان ایسی چلی کہ سال بھر کے اندر ہی مجھے لامیاں کے مشورے سے ایک آدمی رکھنا پڑا۔

ایک صبح ہم بھائی لامیاں کے ساتھ فجر پڑھ کے مسجد سے نکلے گھر پہنچ کر حسب معمول ناشتہ تیار ہونے تک ہم سب تلاوت کرنے بیٹھ گئے۔ پھر بھائی اپنا اپنا ٹفن اٹھا کے دوکان کی طرف جانے کے لئے تیار ہوئے اور لامیاں اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ ایک گھنٹے میں چائے کی پیالی اور دلت کی روٹی رکھ کر اماں ان کے کمرے میں گئیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد ہم نے ان کے چیخنے کی آواز سنی تو سب دوڑے۔ لامیاں مسند سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں آنکھیں چھت کی طرف لگی ہیں اور سامنے رحل میں قرآن پاک کھلا رکھا ہے۔

اس روز لامیاں کے بجائے گھر میں دوسرے لوگ تلاوت کرتے رہے پھر کچھ برسوں تک گھر کا نظام پہلے کی طرح چلتا رہا۔ پھر ایک دن میرے بڑے بھائیوں نے وراثت کا قصہ چھیڑ دیا۔

میں نے بغیر کسی لاگ لپٹ کے یہ کہا کہ لامیاں نے اپنی زندگی میں میرا حصہ مجھے دیا تھا۔ اب آپ لوگوں کی دکان اور اس مکان میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے اس لئے جس طرح بھی چاہیں آپ تقسیم کر لیں، البتہ مجھے اس گھر میں رہنے کی اس وقت تک اجازت دیں جب تک میں کوئی دوسرا انتظام نہ کرلوں۔ دو تین ماہ گزرے مجھے ایک ایسا گھر مل گیا جہاں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل ہو گیا۔ میں سچ کہتا ہوں مجھے وہ گھر چھوڑنے کا اتنا ملال نہیں ہوا جتنا اس مسجد کے دور ہونے کا جہاں میں نے لامیاں کے ساتھ پہلی اور آخری بار نماز ادا کی تھی۔ مگر آدمی کو یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر ماحول کو اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ چند روز کے بعد نئے گھر کی طرح نئی مسجد میں بھی وہی اپنائیت پیدا ہو گئی جو پرانے گھر اور مسجد سے وابستہ تھی۔ ہر نماز کے بعد مجھے یہ محسوس ہوتا جیسے لامیاں میرے ساتھ ہیں۔

مجھے اپنے کاروبار کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے ایک

دکان اور لے لی تھی پھر مجھے لوگ بھی ایسے مل گئے تھے جن پر میں دکانیں
چھوڑ کر اگر فی کے لئے شہر سے باہر بھی چلا جاتا یا اُن میں سے کسی کو بھیج دیتا تھا۔
یہ تو میں نے پہلے دن ہی طے کر لیا تھا کہ سود پر پیسہ لیکر کاروبار نہیں
بڑھاؤں گا لیکن جس طرح سارا بازار ادھار پر چل رہا تھا، دنیا مال لیتی ہے میں بھی
لوں گا۔ وہ پیسہ مجھے مال دینے والے کمائیں گے اسی طرح اس مال کو بیچ کر دو
پیسہ کمانا میرا بھی حق ہے۔ یہ کاروبار ہے سود نہیں۔ جس طرح دو چار دن کی دیر
سو ہمیں ادائیگی میں ہو جاتی ہے اسی طرح اگر ہمارے گاہک سے بھی دو چار دن
دن کی تاخیر ہو جائے تو سود بنانے کی ضرورت نہیں کاروبار میں تو اس طرح ہوتا
ہی رہتا ہے۔ ہمارے بھائیوں نے تو دکان پر بورڈ لگا رکھا ہے "آج نقد کل
ادھار" مطلب ہے وہ مارکیٹ سے مال نہیں اٹھاتے تھے، اور جیسا کاروبار وہ کرنا
چاہتے تھے اس کے لئے بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے جتنی گاہک کو کھونے سے
باعث نہیں بلکہ گلا چھوڑنا پڑتا ہے۔ مجھے میرے مطلب کے لوگ مل گئے تھے جو
گاہک کے مزاج کو پہچاننے میں دیر نہیں لگاتے تھے، بند مٹھی کے خریداروں
کا مزاج اس طرح جان گئے کہ ان کے ذریعہ بھی لوگ آجاتے تھے پھر اتفاق یہ
ہوا کہ ایک اچھا اور مستقل گاہک مل بھی گیا۔۔۔ امتیاز۔۔۔ شہر کی ہر بڑی مال
(Mall) اور شاپنگ سنٹر کے علاوہ سب ہی پوش لوکالیٹیز (Localities
) میں اُس کے بوتیک چل رہے ہیں۔ اُس کی ڈیمانڈ تھی۔۔۔ نیا ڈیزائن اور اعلیٰ
کوالٹی۔۔۔ اور قیمت مناسب تھی۔۔۔ میں نے بھی یہ کیا کہ شہر کی سب دکانوں میں کہہ
دیا جو اچھی کوالٹی اور نت نئے ڈیزائن کا مال آئے پہلے مجھے اس کا سیمپل دکھلایا
جائے۔ دوسرے شہروں میں بھی خود چلا جاتا کبھی کسی لڑکے کو بھیج دیتا۔ ایک بار
گاہک کی پسند کا اندازہ ہو جانا ہی شرط ہے پھر تو پیسہ وہ مٹھی میں بند ہو جاتا ہے
امتیاز کے ساتھ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک روز حساب کتاب دیکھتے ہوئے
اندازہ ہوا کہ اس کی طرف خاصی بڑی رقم واجب الادا ہو گئی ہے۔ مال مسلسل جا
رہا ہے لیکن رقم کی واپسی رک سی گئی ہے۔ میں نے لڑکوں سے وجہ پوچھی تو بتایا
گیا۔ چھ جگہ فون کرنے پر ایک جگہ ملتے ہیں اور ایک ہی بات کہتے ہیں کہ گھبرائے
کیوں ہو تم بھی یہاں ہو اور ہم بھی کہیں بھاگے نہیں جا رہے ہیں سارا حساب ہو
جائے گا۔ میں نے کہا معلوم کرو اس وقت وہ کہاں ہیں۔ پتا چلا گھر پر
ہیں۔۔۔ میں حسب معمول مغرب کی نماز کے لئے اٹھا، امتیاز کی طرف نکلنے
والی رقم کی تحصیل ایک پرچی پر اتاری لڑکوں کو وقت پر دکانیں بند کرنے کی
ہدایت دینے کے بعد اور یہ سوچ کر کہ عشاء کے وقت تک تو واپسی ہو ہی جائے
گی، میں امتیاز کی طرف روانہ ہو گیا۔ بڑے شہروں کے قاعدے اپنی جگہ بڑا
نقصان یہ ہے کہ اکثر فاصلہ کم کرنے کے بجائے پھیل جاتا ہے یہ انتظامیہ کی ناقص
منصوبہ بندی کا شاخسانہ ہوتا ہے یا غیر تربیت یافتہ عوام کی عجلت پسندی کا
ٹریفک جام کی عیاشی ان ملکوں میں تو روا ہے جہاں وسائل، مسائل سے زیادہ
نہیں تو برابر ہیں لیکن ہمارے جیسے ملکوں میں زیاں کے علاوہ ایک بڑی مصیبت
کثافت کی بھی ہے علاج معالجہ کی سہولت کم سے کم بیماریاں زیادہ سے زیادہ۔۔۔
راستہ تو کٹ گیا مگر وقت بھی کٹ گیا۔ امتیاز کے گھر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ تحصیل
سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں رہا بس حساب کی پرچی دے کر کہوں گا، کچھ
نہ کچھ تھوڑا تھوڑا بھیجتے رہئے تاکہ ہمارا بھی کام چلتا رہے۔۔۔ دروازہ پر ایک
بندوق بردار بیٹھا تھا۔۔۔ میں نے امتیاز کے لئے پوچھا تو اس نے جواباً میرا نام
پوچھا۔ میں نے دوکان کا کارڈ نکال کر دیا۔ جس کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد اُس
نے پھر میرا نام پوچھا۔ میں نے نام بتایا تو اُس نے اپنی جیب سے موبائل فون
نکال کر کوئی نمبر ڈائل کیا اور فون پہ میرا نام بتایا اور اچھا کہہ کر فون بند
کر دیا پھر مجھ سے کہا آپ اندر جائیں، دائیں ہاتھ پر زینہ ہے زینہ کے اوپر دائیں
ہاتھ پر ہی جو کمرہ ہے اس کو کھول کے اندر چلے جاؤ صاحب ادھر ہی بیٹھا ہے
۔۔۔ اندازہ تھا کہ امتیاز اپنے احباب کے ساتھ بیٹھے ہوں گے میں ان کو چپکے سے بلا کے
پرچی دے کر کہوں گا، ہمیں بھی زندہ رہنے دیجئے۔

میں چوکیدار کی ہدایت پر عمل کرتا ہوا، اوپر پہنچا، مقفل دروازہ
کھولا۔۔۔ میں کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں۔۔۔ دروازہ کھولتے ہی پہلی نظر اُن تین
چار لڑکیوں پر گئی جو لباس سے بے نیاز تھرک رہی تھیں۔ شاید ایک لمحہ یا لمحہ کا بھی
دسواں حصہ یا اس سے بھی کم۔۔۔ میں تو یہ بھی نہیں دیکھ سکا کہ وہاں اور کتنے لوگ
بیٹھے ہیں۔ امتیاز تک تو نظر پہنچی ہی نہیں۔۔۔ میں الٹا پھر آیا۔ تیزی سے زینہ طے
کرتے ہوئے دو ایک بار تو یہ لگا جیسے کپڑے کا کھلا تھان پیروں میں الجھ گیا ہے
اگر سنبھلا نہیں تو گرتا چلا جاتا، امتیاز کی آواز سنائی دی۔۔۔ لڑکھڑاتی ہوئی بھاری
آواز۔۔۔ ممکن ہے آواز میں اتنی لڑکھڑاہٹ نہ ہوتی تو وہ میرے پیچھے آتا۔ میں
اس کی آواز کو ان سنا کر کے باہر نکلا تو میری حالت یہ تھی کہ گاڑی میں چابی نہیں
لگ رہی تھی۔۔۔ پورے بدن پر ایک تھرتھراہٹ سی طاری تھی۔ اللہ کا بڑا کرم ہوا
کہ کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ ہر ایک لمحہ بعد مجھے راستے کے بجائے امتیاز کا کمرہ
تھرکتا دکھائی دیتا۔ خدا خدا کر کے مسجد تک پہنچا۔ وضو خانے میں بیٹھ کے نجانے
کتنی دیر تک میں نے اپنی آنکھوں پر اتنے چھپاکے مارے جیسے ایک نظر میں
دیکھے ہوئے منظر کو اپنی آنکھوں سے دھو دینا چاہتا ہوں۔ وضو خانے میں کئی
آنکھوں پر اتنی دیر پانی ڈالا کہ پہلی باجماعت نکل گئی۔ وضو کر کے نکلا تو فوری
طور سے فرض ادا کرنے کھڑا ہو گیا۔۔۔ پہلی رکعت ٹھیک پڑھی دوسری پڑھتے
ہوئے ایک ساعت کے لئے امتیاز کا اور اُس کے کمرے کا خیال آیا، میں نے
اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ کے پھر وہ آیت شروع کر دی، تیسری اور چوتھی
رکعت میں بھی خیال بھٹکا بلکہ ایک مرتبہ تو کالج کے باتھ روم میں بنی ہوئی ٹیڑھی
میڑھی لکیروں سے بنی ہوئی شبیہیں اور فحش عبارتوں کا بھی خیال آیا، جوں توں
فرض پورے کئے سنت کی نیت باندھی رکوع میں گیا تو احساس ہوا میں نے فرض

کی آخری دو رکعت میں سے کسی ایک میں وہ ایک سجدہ کم کیا ہے۔ اب ذہن اُس بھولے ہوئے سجدے کے پیچھے بھٹکنے لگا۔ سب کچھ بھول کر ایک سجدہ یاد کرنے کے لئے جتنا ذہن پر زور ڈالا اتنا یقین ڈانواڈول ہوتا گیا۔ پھر یہ ہوا کہ کسی وہم کی گنجائش ہی نہ رہی۔ دل مسلسل گواہی دیے جا رہا تھا کہ اک سجدہ کم کیا ہے۔ اِسی خلجان کے عالم میں وتر اور سنتیں ادا کیں نوافل پڑھے۔ مسجد سے چلتے وقت پیش امام صاحب نظر آ گئے تو ان کو ادھر سے رجوع کیا۔ وہ میری بات سن کر مسکرائے اور فرمایا۔

”آپ تو ایک عالم کے بیٹے ہیں۔ آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے آپ کو اگر شبہ ہے کہ ایک سجدہ رہ گیا تو نماز کو دہرا لیجئے۔ پہلی نماز کا شمار نفل میں ہو جائے گا۔“

مجھے نماز کے سارے مسائل کا علم تھا۔ کئی بار چار سنتوں کے بجائے پانچ رکعت پڑھ لی تھیں مگر اب پریشانی یہ تھی کہ جو سجدہ چھوٹ گیا ہے اس کو کیسے ادا کروں؟

ابا میاں ہوتے تو ان سے پوچھ لیتا ہر مسئلہ کی طرح ممکن ہے اِس کو بھی حل کر دیتے۔ بلکہ اگر وہ ہوتے تو شاید یہ بھول ہی نہ ہوتی۔ پھر اچانک خیال آیا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اک سجدہ نہ کرنے کی خلش دے کر اس نے شیطانی منظر کو ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے مٹا دیا۔ مگر کہاں جاتا۔ مسجد سے نکل کر گھر پہنچنے تک کئی مرتبہ لڑکھڑایا۔ گھر پہنچا۔ بیوی نے دروازہ کھولا تو وہ رات ایک امتحان کی رات کے مانند گزری۔ بیوی الگ حیران و پریشان۔ دوسرے دن میں نے دکان فون کر کے کہا۔ ادھار بند کر دو اور وصولی پر زور دو۔ میں شاید دو چار دن نہیں آسکوں گا۔ دکان پر توجہ بہت دیتی مگر ایک سجدہ پھر کسی نماز میں نہ رہ جائے، ایسی غلطی دوبارہ نہ ہو جائے، اِس احساس کی وجہ سے باقی نمازوں میں جو تھوڑا بہت انہماک تھا وہ بھی جاتا رہا۔ میں جماعت میں شریک ہونے کے باوجود اس بھولے ہوئے سجدے کو یاد کر کے ایک کانٹے کی سی کھٹک دل میں محسوس کرتا رہا۔ اور یہ الجھن اتنی بڑھی کہ میری بے کلی کو بیوی بھی بھانپ گئی۔

”کیا بات ہے؟ چار پانچ دن سے تم جب بھی نماز ادا کر کے آتے ہو تمہارے چہرے پہ کچھ الجھن کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو یہ بھی محسوس کیا ہے کہ تم کچھ عجلت پسند اور چڑچڑے بھی ہو گئے ہو۔ کیا مسجد میں کسی سے بحث مباحثہ ہو گیا ہے؟“

اس کے بار بار پوچھنے پر میں نے ایک سجدہ والی الجھن کا سبب بتا دیا ہے۔ پہلے تو اس نے ذرا توجہ سے سنا پھر ساری بات سننے کے بعد نہایت لاپروائی سے کہہ دیا،

”اِس میں تمہارا کیا قصور ہے جو رہ گیا وہ رہ گیا۔ تم نے دہرا دی تو نماز پڑھ لی تھی نا۔ بس کافی ہے۔“

بھلا مجھے کبھی یہ گمان نہیں گزرا کہ میں کوئی عبادت گزار بندہ ہوں۔ لیکن ایک سجدہ کے چھوٹ جانے سے مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں نے جن نمازوں کی ابتدا ابا میاں کی زندگی میں کی تھی ان کے درمیان ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ایک سجدہ جو رہ گیا ہے وہ میری عبادت کے درمیان ایک فاصلہ قائم کر گیا ہے۔ میں وہ فاصلہ کیسے پاٹوں؟

یہ احساس کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھنے ہی لگا، جس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ میں ہر نماز کے بعد دو دو چار چار نفل اور ادا کرنے لگا۔ عمر جتنی بڑھتی گئی، دو کانوں کی طرف سے توجہ کم ہوتی گئی۔ وہ تو اللہ کا کرم تھا کہ اس نے مجھے بھی ابا میاں کی طرح اولادِ نرینہ سے نوازا تھا۔ لڑکوں نے دوکانوں کو سنبھال لیا۔

پھر ان ہی بچوں نے مشورہ دیا کہ ابا آپ اماں حج کر آئیں۔ بیوی نے بھی یہ کہہ کر تائید کی۔

”تم جو کہتے ہو کہ بیس پچیس سال پہلے ایک سجدہ کم کیا تھا، کعبہ شریف اور مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے بھولے ہوئے سجدے کو ادا کرو گے تو اللہ رحیم قبول کرے گا اور تمہارے دل کو اطمینان ہو جائے گا کہ اُس سجدے کی بھی تلافی ہو جائے گی۔“

بے کہے سب نے میری خواہش کو زبان دی تھی میں انکار کیسے کرتا۔ میرے اور بیوی کے فارم بھرے گئے۔ اب قرعہ اندازی کا انتظار شروع ہو گیا۔ یہ انتظار کب ختم ہوا مجھے نہیں معلوم۔ ساری دنیا کہتا شکل آئے ہمارا ہی رہ گیا۔ میں نے بیوی سے کہا۔ ”معلوم ہے ہمارا نام کیوں نہیں آیا؟ کیونکہ ایک سجدہ رہ گیا ہے۔“ میں ساری رات روتا رہا اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا رہا۔ مجھے یاد ہے یا تو میں دو ہی مرتبہ رویا ہوں، ایک ابا میاں کی وفات پر اور دوسری دفعہ حج کی قرعہ اندازی میں نام نہ آنے پر۔ بیوی سمجھا بجھا کے تھک گئی کہ حج اور عمرہ پہ وہی لوگ جاتے جن کا بلاوا آتا ہے۔ بیٹوں نے اس طرح سمجھایا کہ حکومت صرف اتنی ہی تعداد میں حاجی بھیجتی ہے جتنی تعداد سعودی حکومت کی جانب سے مقرر کی جاتی ہے ورنہ دنیا کا ہر مسلمان حج کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ سعودی حکومت کے سامنے انتظامی مسائل ہوتے ہیں اور دیگر ملکوں کے پیشِ نظر مالی وسائل۔ غرض سب اپنے اپنے طور پر تاویل کرتے رہے۔ میں سنتا رہا۔

میرے بڑے بیٹے نے توجہ دی اور وہ اِس طرح کہ مجھے ایک ماہرِ نفسیات کے پاس لے گیا۔ میں ابا مجنوں تو نہیں تھا مگر بیٹے کا دل رکھنے کے خیال سے میں نے ڈاکٹر کے پاس جانے میں ذرا بھی آنا کانی نہیں کی۔ ڈاکٹر صاحب مجھ سے جو پوچھتے رہے میں جواب دیتا رہا۔ اب انہوں نے میرے

بیٹے کو اپنی تشخیص سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا یہ اللہ جانے۔ میں نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں سال بھر تک فرض نمازوں کے ساتھ اُتنے ہی نفل پڑھتا رہا۔ کبھی کبھی تو سجدے میں ایسی رقت طاری ہو جاتی کہ کوئی نہ کوئی نمازی آ کے پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیتا اور ایک گلاس پانی بھی پلاتا۔

زندگی گزر جاتی ہے ایک برس کا کیا گزرنا ۔۔۔ حج کے فارم بھرنے کا زمانہ پھر آ گیا۔ بڑے بیٹے نے کہا اب میں بھی ساتھ چلوں گا ۔۔۔ اِس سال وہاں سے بلاوا آ گیا تھا۔ تینوں کے فارم منظور ہو گئے۔ گھر میں عید کا سا سماں ہو گیا۔ بھئی جس کا اُدھار دینا ہے وہ ادا کر دو ۔۔۔ جس سے ذرا سی کڑوی کسیلی بات کی تھی اس سے معافی طلب کرو۔ دوست احباب عزیز رشتہ دار سب سے کہا سنا معاف کرایا۔

لبیک اللھم لبیک ۔۔۔ کہتے ہوئے جہاز میں سوار ہوئے۔

والدین کے ساتھ حج کرنا بھی ایک سعادت ہوتی ہے مجھے اِس خوشی سے زیادہ ابو کی فکر تھی۔ وہ ایک سال میں بہت کمزور ہو گئے تھے اور دینی رجحان بھی فزوں تر ہو گیا تھا۔ نیند تو جیسے آنکھوں سے روٹھ ہی گئی تھی۔ فرض نماز کے لئے تو مسجد ہی جاتے تھے۔ گھر میں جب تک رہتے اُن کا وقت تلاوت کرنے میں یا مصلے پر نوافل اور قضا نمازیں پڑھتے ہوئے گزرتا ۔۔۔ مجھے کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا جیسے خدانخواستہ اُن کے ذہنی توازن میں کچھ فرق پیدا ہو چلا ہے۔ اسی لئے میں نے ایک Psychiatrist سے مشورہ بھی کیا تھا جس نے یہ رپورٹ دی کہ آپ کے والد خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں اُن کو اپنے والد کے نہ ہونے کا شدید احساس ہے وہ سمجھتے ہیں کہ آپ لوگ اُن سے رہنمائی کے خواہش مند ہوتے ہیں جبکہ وہ اپنے والد سے کسی خاص مسئلہ میں رہنمائی کے طلب گار ہیں۔ وہ ذہنی طور پر بالکل تندرست ہیں۔ ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہر نارمل آدمی کے ذہن میں بھی ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر کی رپورٹ ملنے کے بعد بھی مجھے ابو کے انداز میں ایک اضطراری کیفیت محسوس ہوتی رہی، اسی کیفیت کو دور کرنے کے لئے حج کا ارادہ کیا۔

اُس جگہ سے متبرک جگہ تو روئے زمین پر کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اللہ کے دربار اور نبی ﷺ کے دیار میں پہنچ کر یقیناً ابو کی بے چینی میں کمی ہو گی۔ ایک فرض اور ایک علاج سمجھ کر اِس سفرِ مقدس کو اختیار کیا۔

خلافِ توقع جہاز میں بیٹھتے ہی انہوں نے با آوازِ بلند تلاوت شروع کر دی وہ حافظ بھی تھے اور خوش الحان بھی۔ لب جو تلاوت شروع کی تو اس طرح کہ قرآن کے ہر لفظ کے ساتھ آنسو رواں تھے معلوم ہوتا تھا زبان کے ساتھ اُن کی آنکھیں بھی آیاتِ ربانی کا ورد کر رہی ہیں۔ کلامِ الٰہی کی تاثیر اور آواز کے سوز نے ایسا سماں باندھا کہ جہاز میں موجود بیشتر احرام پوش زائرین کی حالت بھی عجیب ہو گئی۔ آیات کے معنی جن کی سمجھ میں آ رہے تھے وہ بھی اور جو صرف اللہ کا کلام سمجھ کر سن رہے تھے وہ بھی ابو کی دلسوز آواز اور آنسوؤں کا ساتھ دے رہے تھے۔

کراچی سے جدہ پہنچنے تک تلاوت کا سلسلہ ایک لمحے کے لئے نہیں رکا۔ دوسرے مسافروں کا کہنا تھا کہ تلاوت کے اجالے میں فاصلہ ایسے طے ہو گیا کہ کراچی کی روشنی سے نکلے اور جدہ کی روشنی میں پہنچ گئے۔

جدہ پہنچ کر اب اُن کی ایک ہی خواہش تھی کہ جلد سے جلد حرم شریف کا دیدار کریں۔ معلم کی گاڑیاں دیر سے لینے آئی تھیں۔ ابو کی بے کلی کا یہ عالم کہ وہ اُڑ کے حرم شریف جا پہنچیں۔ جب معلم کی گاڑی میں بیٹھے تو سب نے ہم آواز ہو کر تلبیہ کا ورد شروع کر دیا۔ ہم سب کی کوشش تھی کہ کسی بھی طرح ابو کو زیادہ پُر جوش نہ ہونے دیں۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جوں جوں حرم شریف قریب آتا جا رہا تھا ۔۔۔ ابو کے چہرے کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی ۔۔۔ اُن کی آنکھیں چاروں طرف ایسے گھوم رہی تھیں جیسے حرم شریف کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہوں ۔۔۔ اور ذہن ۔۔۔ بس ہم اُسی کو قابو میں رکھنا چاہتے تھے۔ معلم نے راستے میں ہم سے پاسپورٹ طلب کئے۔ ہمارے گلے میں اپنے پتے اور ہمارے نام اور رہائش گاہ کا نمبر لکھا ہوا فیتا اِس تاکید کے ساتھ ڈالا کہ جب کبھی آپ کہیں راستہ بھٹک جائیں تو یہ آپ کی مدد کرے گا۔ ابو نے وہ فیتہ گلے میں ڈالنے کے بجائے امی کو دے دیا۔ "تم رکھو۔ میں یہاں کھونے نہیں پانے آیا ہوں۔"

رہائش گاہ پر اپنا سامان رکھ کر حرم شریف کی طرف چلے۔ ابو آگے آگے اس طرح چل رہے تھے جیسے یہ ساری جگہ اُن کی دیکھی بھالی ہے۔ حرم شریف کے سامنے پہنچ کے باب فہد پر رک گئے۔ کہنے لگے۔ باب السلام سے داخل ہوں گے۔ زیادہ ثواب ملتا ہے۔ باب السلام کو تلاش کرنے میں کوئی دس منٹ لگے۔ مجھ سے اور امی سے کہا۔ خانۂ کعبہ پر نظر پڑتے ہی جو دعا مانگو گے پوری ہو گی۔

ہم اندر کی طرف تھوڑا گئے تو سامنے خانۂ کعبہ ۔۔۔ میرے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے ہوئے تھے لیکن نظر خانۂ کعبہ کے جلال و عظمت کے سبب جہاں پہنچی تھی وہیں ٹھہر گئی اور دعا کہیں دل کے نہاں خانے میں شرمندہ شرمندہ سی بیٹھی رہ گئی ۔۔۔ میرے وجود میں ایک لرزش سی طاری ہو گئی ۔۔۔ ہوش مجھے اُس وقت آیا جب امی نے میرا بازو پکڑ کے ہلایا ۔۔۔ میری آنکھوں نے اُن کی نظروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دیکھا۔

ابو سجدے میں تھے ۔۔۔ میں نے جھک کر اُن کو کھوجنے کے اِس عالم سے نکالنا چاہا۔ مگر اب وہ ہمارے عالم میں کہاں تھے۔

وے صورتیں الٰہی۔۔۔

شکیلہ رفیق (کینیڈا)

"اے بھیا لکھو شیخ سرائے کتوں دستجاوت ہے؟"

"ارے بابا! ہم کا بیاں کی کچھ کھبر نا ہیں، ہم تو آپے ہی یاد کوئے ہیں۔۔۔۔۔ وہ بنگلیا رے کے موڑ پر کلو پان والے سے پوچھ لیو جائے کے"

یہ وہ فقرے نہیں تھے، کانوں میں مدھر دھن بجانے والے وہ گھنگرو تھے جن کی جھنکار نے صدی بیت گئی تھی۔ منہ میں رس گھولنے والے وہ گلاب جامن تھے جنہیں اس نے جانے کب آخری بار چکھا تھا۔ آنکھوں کو تر اور تازہ کرنے والی وہ صورتیں تھیں جنہیں اس نے برسوں سے نہ دیکھا تھا۔ ہائے اب بھی تو یہی زبان بولتی تھیں۔

کیتو جو اس کی بہن کا نوکر تھا۔ اسے لکھنؤ سے یہاں لے کر آیا تھا۔ جس کا اصل نام جانے کیا تھا مگر بس اسے پیار سے "کیتو" کہتے تھے۔ جب کہ ہمارے کراچی میں یہ ایک خوش ذائقہ پھل کی صورت جانا جاتا ہے۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ بہت دور تقریباً آدھی صدی پیچھے جا چکی تھی۔ اسی شہر کی ایک بڑی کوٹھی میں اس کا جنم ہوا ہوگا۔۔۔۔۔ نہ جانے چھٹی اولاد اور تیسری بیٹی پر خوشیوں کے نقارے بجے یا۔۔۔۔۔ اداسی کے بادل چھائے

یا پھر۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ ہوا ایک معمولی واقعہ سمجھ کر قبول کر لیا گیا۔ اسے ان میں سے کسی کی خبر نہ تھی کہ پیدا ہونے کا جرم تو وہاں ضرور سرزد ہوا تھا مگر پرورش کراچی جیسے تجارتی اور معروف شہر میں ہوئی۔

گھر والے جب سیتا پور کی باتیں کرتے تب اس کے دل میں میٹھی میٹھی سی کسک ہوتی۔ جی چاہنے لگتا وہاں جا کر اس مکان کے اس کمرے کو دیکھے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ کیسا ہوگا وہ کمرہ؟

اُن دنوں کے بچے آج جیسے نہ تھے بلوچوں جیسے گھر کے ہی کسی کمرے میں پیدا ہو جاتے تھے۔۔۔ اور سب خیر بھی رہتی تھی۔ آج کی طرح نہیں کہ سب سے مہنگے ہسپتال میں بھی پیدا ہوں وہ بھی قینچی چھری کے استعمال کے بعد۔۔۔۔

کیا جب کے بچے بہت شریف یا بیوقوف ہوا کرتے تھے۔ یا پھر۔۔۔۔۔ آج کل کے کچھ زیادہ ہی ذہین ہیں۔ بہر حال۔۔۔ جو بھی ہے۔۔۔ اب بھی اچھا ہے اور جب بھی، سب اچھا ہے اور اللہ کی مرضی کہہ کر بات بن جاتی تھی۔

بچپن کراچی کے ایک محلے میں کھیل کود کر گزرا۔۔۔۔ اسکول بھی وہیں شروع ہوا۔۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔ بعد کے تمام مراحل، شادی بیاہ، بچے وہیں طے ہوئے۔ میاں کا تبادلہ حیدرآباد سندھ ہوا تو گھر سے وہاں رہنا ہوا۔ جہاں سندھ کے ان پڑھ لوگ اس کے میاں کے پاؤں اس لئے چھوا کرتے کہ وہ "سیدزادے" تھا۔ وہ اس بات پر حیران ہوتی اور میاں شرمندہ ہو کر انہیں روکتا مگر۔۔۔ وہ اس حرکت سے باز نہ آتے۔۔۔۔۔ جن ہاتھوں سے پاؤں چھوتے پھر ان کو سینے پر باندھ لیتے۔ یہ ان کا روایتی انداز تھا۔ وہ محبت سے انہیں تکا کرتی۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ دونوں انسان ہیں پھر یہ تفریق کیسی؟ مگر انہیں سمجھانے سے قاصر تھی کہ یہ تو ان پڑھ اور سادہ لوح لوگ تھے۔

مگر وہ۔۔۔۔۔!

جن سے زندگی میں طرح طرح کے دھوکے کھائے۔ وہ بھی تو اسی جہان کے بندے تھے۔

مسکراتے چہروں کے شیشوں میں زہر کی پڑیا کیں ہوتیں، دعا دیتا ہوا شفقت بھرا ہاتھ سر سے پھسل کر پشت سہلاتے ہوئے بھٹکنے لگتا۔

شفیق مسکراہٹ کے پیچھے خباثت چھپی ہوتی۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں کبھی ان کے کیے کا صلہ نہیں ملتا۔۔۔۔۔ وہ اپنے آپ کو انہیں میں گردانتی تھی۔ وہ۔۔۔ جو سب کے لیے اپنے خلوص کی پوٹلی کھول کر بیٹھ جاتی۔ پوٹلی سے خلوص تو دم بھر میں خالی ہو جاتا مگر جب وہ خالی پوٹلی کو تکتی تو اس میں کنکر بھرے ہوتے۔

ایک شام گلشن میں واقع "گلف" کے شاپنگ مال میں موہن جوداڑو جیسے ہی نیشنلا جیسی نامی دکانوں پر وہ اپنی شفقت کو تلاش کر رہی تھی کہ دور سے اسے مسز جمال آتی نظر آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا مگر۔۔۔ مسز جمال نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنے چہرے کے تاثرات یکسر بدل لئے۔ وہ بالکل سادہ واقع ہو گئیں اور لاتعلقی سے آگے بڑھنے لگیں۔ لیکن جب اس نے سلام کیا تب انہیں مجبوراً رکنا پڑا، پھر ان کے چہرے کے تاثرات بھی ایک دم بدل گئے وہ اچانک بے حد خوش اخلاق ہو گئیں اور گرم جوشی سے بولیں۔

"ارے شرمین! تم؟ میں نے تو تمہیں دیکھا نہیں۔ تھا اچھا ہوا تم نے آواز دے لی۔ کیسی ہو؟ ایمان سے کل ہی تم کو بہت یاد کر رہی تھی۔"

اس کے بعد بھی وہ بہت کچھ کہتی رہیں۔۔۔ اور وہ۔۔۔۔۔ صرف مسکراتی رہی

کہ۔۔۔۔۔

وہ۔۔۔۔۔

ایک چہرے پہ دوسرا چہرہ لگانے کے فن سے ناواقف نہ جو تھی۔

مصنوعی قہقہے۔۔۔۔۔ فریب کی زندگی۔۔۔ اندر کچھ باہر کچھ۔۔۔۔۔ وہ ہر دم یہ سب کرنے سے مجبور بھی تھی اور عادی بھی۔ وہ تو ہر دم اسی فکر میں رہتی کہ ایسے تمام لوگوں کو بدل ڈالے۔۔۔۔۔ ان کے اندر سے تصنع اور بناوٹ کے پرتوں کو

کمر یہ کہ انہیں حقیقی رنگوں میں نہلا دے۔۔۔ سب کو تھرا نکھرا کر کے ان کا اندر باہر ایک کر دے۔

مگر۔۔۔

ایسا وہ صرف سوچ ہی سکتی تھی۔۔۔ کیوں کہ اس ضمن میں وہ جب بھی کوئی عملی قدم اٹھاتی سب کی تضحیک کا نشانہ بنتی۔ اچھے قدم نا ہموار ٹھہرائے جاتے۔۔۔ اسے پرانے زمانے کی ''بی بی'' جیسے خطابات سے نوازا جاتا

اور۔۔۔

نئے زمانے کی ''بے بی'' کے جرائم اس میں تھے ہی نہیں۔

سو۔۔۔ زندگی اسی طرح گزرے جا رہی تھی۔ جیسے ندی میں بہتی ہچکولے لیتی ناؤ کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے اسی طرح وہ بھی کراچی سے ٹورنٹو جا پہنچی۔

یہ۔۔۔ گزشتہ دو دنیاؤں سے بالکل مختلف ایک تیسری ہی دنیا تھی۔ اسے یہاں کچھ اچھا لگ رہا تھا اور کچھ برا۔

اسی اچھے برے کے درمیان ایک دن ایسا بھی آیا کہ اچانک ہی اسے مژدہ ملا کہ وہ ہندوستان جا سکتی ہے۔ جو اسے مژدۂ جاں فزا محسوس ہوا۔

فارم بھرتے ہوئے شہروں کے خانے میں اس نے سب سے پہلے سیتاپور لکھا۔ اور پھر اسی سے دل دھک دھک کرنے لگا۔

کیا واقعی وہ اپنے شہر پہنچ سکے گی؟ جہاں اس کے والد عبدالرحیم خان نامور وکیل کے طور پر پہچانے جاتے تھے؟

اس گھر کو دیکھ سکے گی؟

اس گھر کی زیارت کر سکے گی جہاں وہ پیدا ہوئی تھی؟

''اے بابو! رستہ جانت نا ہیں تو کاہے نکل پڑت ہو''

وہ ایک دم ہی چونک گئی۔۔۔ ماضی کے سمندر سے حال کی سڑک پر آ گئی۔

کینو نے شاید پھر کسی سے محلہ شیخ سرائے کی بابت پوچھ لیا تھا۔

اس نے دیکھا ایک بزرگ تھے جو شفقت سے مسکرا کر کینو کو ان الفاظ میں نصیحت کر رہے تھے۔ وہ بھی مسکرا کر بزرگ سے بولا

''ارے بابا جی! نکل پڑے ہیں ان کا لے کے یہ مہری بڑی ماں (بڑی اماں) ہیں گوروں کے دیس سے آئی ہیں ہی یہاں ہی پیدا ہوئی تھیں۔۔۔ دیکھیں چاہت ہیں وہ مکان جس ماں یہ جنمی تھیں کینو کی پوربی اردو کا امتزاج اسے لطف دے رہا تھا۔ وہ بولی ''تم کیسے مزے میں پوربی بول رہے ہو۔۔۔! میری والدہ بھی یہی زبان بولتی تھیں اور بہت پیاری لگتی تھیں۔۔۔

مگر۔۔۔ اب تو۔۔۔'' وہ پھر اداس ہونے لگی۔ مگر کینو نے ایسا نہ ہونے دیا ہنس کر بولا ''ان چھوٹے شہروں کے لوگ کتنے مخلص اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں نہ صرف ان کی بولی بلکہ ان وضع داریاں اور اخلاق بھی برقرار ہیں۔۔۔ آپ جتنا جتنا ان سے ملتی جائیں گی خوش ہوتی جائیں گی۔

''ہوں۔۔۔ یہ تو ہے اب تک بھی جن سے ملی ہوں تو خوشی ہی ملی ہے اس نے مسکرا کر کینو کو دیکھا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر وہ بھی مسکرا دیا۔

وہ جن سے بھی راستہ پوچھتا اسے جتنا بھی معلوم ہوتا ان کی مدد کرتا۔

تب ہی اسے کراچی کا وہ دن یاد آ گیا۔ جب ایک روز راستہ بھٹکنے پر صحیح راستہ چند وہاں کھڑے لڑکوں سے پوچھا تھا۔ جنہوں نے اسے غلط راستہ کر شاید لطف لیا ہو گا۔ کیوں کہ وہ بعد میں تقریباً تین گھنٹے تک ادھر ادھر بھٹکتی رہی تھی۔

مگر۔۔۔

یہاں ابھی تک ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ جن کو علم نہ تھا وہ بھٹکانے نہیں تھے معذرت کر لیتے تھے اور جو ذرا بھی واقف تھے حتیٰ الامکان ساتھ دے رہے تھے۔

یہ کتنے سادہ اور مخلص لوگ ہیں۔ اپنا وقت خوشی خوشی انجان لوگوں پر صرف کر رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بدلے میں انہیں کچھ نہ ملے گا۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

کیا ایسا کر کے انہیں راحت ملتی ہے؟

یقیناً ہاں!

پھر۔۔۔؟ ہماری وہ راحتیں کہاں گم ہو گئیں؟ جنہیں تلاش کرنے کی ہم زحمت بھی نہیں کرتے نہ ہی ضرورت سمجھتے ہیں۔ وہ اسی سوچ سمندر میں غوطہ زن تھی کہ کینو کی آواز اسے باہر کھینچ لائی۔

''آپ کا گھر آ گیا''

وہ باہر نکل آئی سوچ سمندر سے بھی اور گاڑی سے بھی ''ارے! کیسے مل گیا؟''

''مجھے خیال ہی نہ آیا کہ آپ کے والد کا نام لوں۔۔۔ آپ نے بتایا تھا کہ انہیں اب تک وہاں کے کچھ لوگ جانتے ہیں۔ جیسے ان کا نام لیا ایک نہیں کئی پتہ بتانے والے مل گئے۔ آپ تو پتہ نہیں کن سوچوں میں گم تھیں۔ میں اس دوران یہی کرتا رہا۔

''خوش رہو۔۔۔ تم نے اس وقت سفر کر دیا ہے''

''یہ۔۔۔ ہے۔۔۔ آپ کا گھر۔۔۔ یعنی آپ کے والد کی کوٹھی''

میں نے قدم آگے بڑھائے۔۔۔ تصاویر دیکھ رکھی تھیں۔۔۔ اور۔۔۔ میری خوش قسمتی کہ اب جو خاندان وہاں مقیم تھا اس کے سربراہ بزرگ والد سے بخوبی نہ صرف واقف تھے بلکہ قدر دان بھی، انہوں نے مجھے گھر کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

وہ۔۔۔۔!!

یہ کئی منزلہ کوٹھی پہلی نظر میں کراچی P.C ہی لگی پھر میں آپ ہی ہنس دی، بھلا پرل والے کیا جانیں کہ اتنی وسیع دنیا میں ایک چھوٹا سا شہر سیتا پور بھی ہوتا ہے۔

میں احاطے میں داخل ہوئی۔ گھر میں رہنے والے فرد میرے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ خواتین اپنایت بھری مسکراہٹ نچھاور کر رہی تھیں۔ گھر کے بزرگ نے مجھے اک اک کر کے دکھانا شروع کیا۔ یہاں آپ کے والد دفتری امور انجام دیتے تھے اس پورے حصے میں، یہ مسلمانوں سے ملاقات کی بیٹھک تھی۔ اس حصے میں ملازمین اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے نیچے کے گھر کا کونہ کونہ دکھا دیا۔ پھر اوپری منزل پر لے گئے۔ جہاں خواب گاہیں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا کہ کسی طرح اس کمرے کو جان جاؤں، جس میں میں نے پہلی بار اس دنیا میں آ کر اپنی پلکیں جھپکائی تھیں۔

پر۔۔۔۔

کچھ نہ سمجھ سکی وہ نہ ہی کوئی اور مدد کر سکا۔ پھر خود ہی ایک کمرے کو اپنا جنم بھومی تصور کر لیا اور۔۔۔۔ چیکوں، پلکوں رونا شروع کر دیا۔ خواتین عجلت سے ادھر اُدھر بھاگیں، کوئی پانی لے آئی، کوئی موسمی کا جوس اور کسی نے چائے کے لیے اصرار کیا۔ میں نے دو گھونٹ پانی پیا اور بس۔۔۔۔ میں نے وہاں ڈھیر ساری تصاویر کھینچیں، جوں ہی میں آنگن میں گئی تو چھوٹے چھوٹے بچے سب کے سب بھاگ کر تصویر کھنچوانے آ گئے۔ ماؤں نے روکنے کی کوشش کی مگر میں نے ماؤں کو روک دیا۔

کہ۔۔۔۔

مجھے یہ سب بہت اچھا۔۔۔۔ بہت اچھا۔۔۔۔ بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔

پھر۔۔۔۔

یہ سب کچھ آنکھوں میں سمو کر اور دل میں بسا کر وہاں سے آنا ہی پڑا۔

"تنڈے" کے کباب کھاتے ہوئے جانے کیوں مجھے وہ سب بھی یاد آیا جو میں نے دیکھا نہیں تھا۔ جس دور میں میں جنمی ہی نہ تھی۔

اور اب۔۔۔۔

ایک بڑے ملک کے، بڑے شہر کے، ایک بڑے مکان میں بیٹھی میں سوچ رہی ہوں کہ وہ چھوٹا شہر، اس میں بسنے والے وہ مخلص لوگ، وہ بچے، وہ محبتیں، وہ رفاقتیں، وہ خلوص، وہ پیار اور وہ چہرے۔۔۔۔

اب کہاں بستے ہیں؟؟

غزل

کاش یہ خواب حقیقت ہو جائے
میری دنیا مری جنت ہو جائے
خود پہ آ جائے یقیں انساں کو
معتبر دل کی شعریت ہو جائے
آس باقی ہے تو امکاں باقی
شامِ غم صبحِ مسرت ہو جائے
گرد ہو کیوں مرے آئینوں پر
صاف ہر دل سے کدورت ہو جائے
نوعِ انساں ہے بہت خاص تو پھر
عام اخلاص و مروت ہو جائے
ہو محبت سے محبت سب کو
اور نفرت سے ہی نفرت ہو جائے
قلبِ انساں ہو چہ گاؤ جہاں
اس میں آفاق کی وسعت ہو جائے
آسماں جھک کے زمیں کو چومے
زندگی خواب کی صورت ہو جائے
وسعتِ دشتِ جنوں لا محدود
بیکراں میری محبت ہو جائے
اس تعیش کا ہے عادی مرا دل
کم نہ یہ درد کی دولت ہو جائے
خواب ایسا تو نہیں تھا میرا
طاقِ نسیاں کی جو زینت ہو جائے
درد کچھ اور بنامِ درماں
دل کی کچھ اور مرمت ہو جائے
مجھ کو لگتا ہے کہ بیمار ہیں سب
ٹھیک انساں کی طبیعت ہو جائے
دل نے کی ہیں جو خدا سے باتیں
کوئی سن لے تو مصیبت ہو جائے
زندگی دشتِ جنوں ہے پنہاں
تو غزل آہوئے وحشت ہو جائے

ڈاکٹر پنہاں (یو ایس اے)

رقصِ بسمل

گلزار جاوید (راولپنڈی)

ایک مدت گزر جانے کے بعد آج بھی میں ماسٹر لعل حسین کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے قاصر ہوں۔ جب بھی میرے ذہن میں ماسٹر لعل حسین کی یاد تازہ ہوتی ہے تو میں مخمصے میں پڑ جاتا ہوں۔

ہیڈ ماسٹر لعل حسین کی شخصیت، وضع قطع، عادات واطوار، انداز گفتگو اور لباس کے بارے میں بتانا آپ کا اور اپنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ ہمیں نہیں معلوم روبوٹ پہلے ایجاد ہوا کہ ماسٹر لعل حسین؟ ہمیں تو فقط اتنا معلوم ہے کہ ماسٹر لعل حسین اذیت پسند، اکھل کھرا شخص تھا۔ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر سکون حاصل کرنا اس کی ہابی تھی۔ قصائی کو بھی جانور ذبح کرتے وقت کبھی نہ کبھی ترس ضرور آتا ہوگا۔ مگر یہ مشین نما انسان احساس وجذبات کے معاملے میں قصائی سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ ابھی احترام ومروت سے چھو کر بھی نہ گزری تھی۔

معمولی سی بات تھی۔ عابد کو شیراز سے پرزہ لیتے ہوئے پکڑا اور دونوں کو نہ صرف سکول سے رسٹی کیٹ کیا بلکہ دو سال کے لئے ہر قسم کے امتحان میں بیٹھنے سے بھی نااہل قرار دے دیا۔ ہمارے معاشرے میں بھلا کون ہے جو نقل کے بغیر پاس ہونے کا دعویٰ کرے...... اگر ایوب صاحب والا واقعہ بیان کروں تو وہ بھی عجیب ہے۔ ایوب صاحب کو صرف اس بنا پر سکول سے نکال دیا کہ وہ سکول سے ملحقہ مکان کی کسی خاتون میں دلچسپی لیتے تھے۔ تالی اوّل تو ایک ہاتھ سے نہیں بجتی ایوب صاحب کے ساتھ خاتون .... مذکور بھی قصوروار تھیں اور پھر یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا۔ اس سے سکول کے ڈسپلن کا کیا تعلق؟ مگر ماسٹر لعل حسین کا استدلال یہ تھا کہ اس قماش کے شخص کو استاد کہلوانے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے شخص کے سکول میں رہنے سے بچوں کا اخلاق بگڑ سکتا ہے۔ یہ بھی خوب رہی جیسے ہمارے سکولوں کے بچے پہلے بہت مہذب اور اخلاق یافتہ ہیں۔

اپنی انہی صفات کے سبب ماسٹر لعل حسین سکول کے بچوں اور اسٹاف کے لوگوں کے لئے خوفناک جن کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ہر کسی کی روح قبض ہونے لگتی۔ جس کے قریب سے بھی گزرتے وہ دل میں جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرنے لگتا۔ ان کی غیر موجودگی میں انہیں کن کن القاب اور کلمات سے نوازا جاتا۔ اس کا انہیں ہرگز اندازہ نہ تھا۔ ہر کلاس نے انہیں اپنے پسندیدہ نام سے نوازا ہوا تھا۔ دسویں کے لڑکے دارو غۂ زندہ کہتے تھے۔ نویں والے کریلا کہہ کر پکارتے تھے۔ آٹھویں والوں نے بڑا دلچسپ نام رکھا ہوا تھا کھٹکا۔ کلاس بدلنے کے ساتھ ماسٹر لعل حسین کے نام بھی بدلتے رہے البتہ سٹاف کے رکھے ہوئے نام پائیدار ہوتے اور مدت تک چلتے۔ ماسٹر ایوب جاتے جاتے انہیں آدم بیزار کا لقب دے گئے تھے۔ زیدی صاحب ٹرانسفر کے بعد بھی خط وکتابت میں ہٹلر کا کو اکہہ کر ہی مخاطب کرتے۔ اشفاق صاحب کا عبدالشکور کریک تو بہت ہی مشہور ہوا۔

اب ذرا ملاحظہ فرمایئے! ایک لڑکا حساب میں ذرا کمزور تھا۔ سات نمبر کم آئے باقی کے مضامین میں نمبر ٹھیک تھے۔ لڑکے کا والد سرکاری افسر، سفارش کے لئے آتے وقت مٹھائی کا ڈبہ ساتھ لے کر آ گیا۔ بس صاحب! لعل حسین بپھر گئے۔ بولے "اوّل تو حساب جیسے لازمی مضمون میں رعایت ناممکن پھر آپ نے مٹھائی کا ڈبہ لا کر رہے سہے امکانات بھی ختم کر دیئے...... "یقین کیجئے اس شخص کے اصرار پر خاصا بے عزت کر کے سکول سے نکالا۔ شریف آدمی تھا جبھی تو ماسٹر لعل حسین سے بدلہ نہ لیا مگر رنگا زی کی لمبائی سے بڑا افسر لگتا تھا۔

پھر صاحب پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ لڑکا بڑا بدمعاش تھا نام اس کا عبدالسلام تھا۔ سکول کے باغیچے سے اس نے چند پھول توڑ لئے۔ درگزر سے بھی کام لیا جا سکتا تھا۔ سب کو پتہ تھا اس کا باپ جوئے کا اڈہ اور بھائی شراب کی بھٹی چلاتا ہے اس کے باوجود تپتے فرش پر لڑکے کو ہاتھوں کے بل مرغا بنا کر خود بھی چلچلاتی دھوپ میں ٹہلتے جاتے اور بڑبڑاتے جاتے "اس بدبخت نے سکول کا باغ ہی نہیں اجاڑا معصوم پھولوں سے جینے کا حق بھی چھینا ہے۔"

چھٹی کے بعد لڑکا گھر پہنچا تو اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں چھالوں سے بھری ہوئی تھیں۔ لڑکے کے باپ، بھائی دونوں اپنے غنڈے لے کر ماسٹر لعل حسین کے گھر چڑھ دوڑے۔ بھلا ہو ماسٹر لعل حسین کے پڑوسی امتیاز علی پولیس حوالدار کا جو لڑکے کے باپ سے بھتہ وصول کیا کرتا تھا۔ منت سماجت سے اس نے معاملہ رفع دفع کیا۔ واپسی پر ماسٹر لعل حسین کو سمجھانے آیا تو الٹا حوالدار امتیاز علی کو ڈانٹنے لگے "تم نے خواہ مخواہ ان بدمعاشوں کی خوشامد کی۔ میں بھی دیکھتا وہ میرا کیا بگاڑتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کرتے نا کہ میرے اوپر ہاتھ اٹھاتے۔ موم کا بنا ہوا تو نہیں کہ ٹوٹ جاتا۔ کم از کم لوگوں کو پتہ چل جاتا کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق۔"

صاحب! ہر وقت ڈسپلن ڈسپلن کی رٹ لگانا بھی اچھی بات نہیں۔ قانون آدمی کیلئے بنا ہے نہ کہ آدمی قانون کے لئے۔ حفیظ صاحب کو صرف اس لئے سسپنڈ کر دیا گیا کہ وہ چھٹی کے بعد لڑکوں کو سکول سے باہر ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ لمبی چوڑی رپورٹ معہ ثبوت ہیڈ آفس بھیج کر

حفیظ صاحب کو سخت مشکل میں ڈال دیا۔ رپورٹ کے چند دن بعد حفیظ صاحب آموں کا ٹوکرا لے کر جو جھول حفیظ صاحب گاؤں سے آیا تھا لعل حسین کے گھر معافی مانگنے پہنچ گئے۔ آموں کا ٹوکرا دیکھ کر لعل حسین اول فول بکنے لگے۔ ''پہلے یہ شخص قوم کے نونہالوں کو لنگڑا لولا اور اپاہج بنا رہا تھا اب مجھے حرام خور بنانے چلا آیا ہے۔ اب تو اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔'' آخری دنوں میں حفیظ صاحب اپنے بچوں کا واسطہ دے کر پیروں میں بھی پڑ گئے مگر لعل حسین ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بولے ''سب کے بچے خدا پالتا ہے تمہارے بھی وہی پالے گا۔''

ادریس کا شمار سکول کے لائق لڑکوں میں ہوتا تھا۔ اسمبلی کے دوران کسی لڑکے نے اس کے ساتھ شرارت کی اور زور سے اس کی ہنسی نکل گئی۔ دفتر میں بلا کر ہاتھوں پر اتنی چھڑیاں ماریں کہ کئی دن تک بے چارے کے ہاتھ سوجے رہے............ انسان سے فرشتوں والے کردار کی توقع مناسب ہے کیا؟ محمد یعقوب کلرک بھلا مانس انسان تھا۔ عزت کرنی اور کرانی جانتا تھا۔ فیس لیتے وقت چار آٹھ آنے واپس نہ کرنے سے کونسا آسمان ٹوٹ پڑتا تھا۔ ایک لڑکے کی شکایت درست ثابت ہونے پر سالانہ ترقی رکوانے کے ساتھ اس کا تبادلہ بھی کرا دیا۔

ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ڈی ایس پی طارق مرزا کے لڑکے کو بھی نہ بخشا۔ ایک دن اسے لیٹ آنے پر وارننگ دی اور دوسرے دن سرِ عام مرغا بنا ڈالا۔ ہمارے ملک میں تو ایس ایچ او اپنے علاقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ طارق مرزا تو ڈی ایس پی تھا۔ بظاہر تو اس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا البتہ خاموشی سے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ماسٹر لعل حسین کا تبادلہ کسی دور افتادہ مقام پر کرا ڈالا۔ اس سے بھی ماسٹر لعل حسین نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ ان کے رنگ ڈھنگ وہی رہے۔ وہاں کا اسٹاف اور طالب علم اس رویے کے قطعاً عادی نہ تھے جلد ہی سکول کا پورا عملہ ماسٹر لعل حسین کے خلاف باقاعدہ محاذ کی شکل اختیار کر گیا اور اسی محاذ نے لوگوں کو سسپنڈ کرنے والے ہیڈ ماسٹر لعل حسین کے ایک واقعے کو بنیاد بنا کر انہیں سسپنڈ کر ڈالا۔ آپ ضرور ماسٹر لعل حسین کی معطلی کا سبب بننے والا واقعہ جاننا چاہیں گے۔

اس روز ہیڈ ماسٹر لعل حسین سکول سے چھٹی کے بعد گھر واپس جا رہے تھے۔ ایک جگہ مجمع دیکھ کر رکے تو کیا دیکھتے ہیں ''بڈاوا'' ہو رہا ہے۔ کاغذ کے مصنوعی گھوڑے میں دھنسا چھوٹا سا معصوم خوبصورت بچہ ٹھمک ٹھمک کر ناچ رہا ہے اور لوگ اس پر پیسے نچھاور کر رہے ہیں۔ اصول پسند ماسٹر لعل حسین کے لئے یہ واقعہ ناقابلِ برداشت تھا۔ آگے بڑھ کر ''بڈاوا'' کے مالک سے الجھ پڑے۔ بھلا وہ سادہ لوح دیہاتی لعل حسین کی وعظ و نصیحت کیا جانے؟ اسے پیسے چاہئیں تھے۔ جو بچے کے ناچنے سے حاصل ہو سکتے تھے۔ اس نے ماسٹر صاحب کی بات سنی ان سنی کر کے انہیں ٹالنا چاہا...... لعل حسین اڑ گئے۔ بولے ''میرے ہوتے ہوئے بچہ نہیں ناچے گا'' ''بڈاوا'' والے نے ماسٹر صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ اس کا دھندہ ہے اس کی اور اس کے گھر والوں کی روزی کا ذریعہ ہے...... ہٹ کے پکے لعل حسین کی ایک ہی رٹ تھی۔ اس پھول کو سرِ بازار غلام نہ کرو۔ لعل حسین کی باتیں ''بڈاوا'' والے کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ تنگ آ کر بولا ''سو ڈیڑھ سو لگاتا ہوں۔ آج کی دہاڑی تم دے دو' بچہ نہیں ناچے گا'' ''بڈاوا'' والے کے جواب میں ماسٹر لعل حسین نے جیبوں کو ٹٹولا۔ صرف بتیس روپے نکلے جو انہوں نے ''بڈاوا'' والے کی طرف بڑھا دیئے۔ ''بڈاوا'' والے نے ماسٹر صاحب کے پیسے ہتھیلی پر رکھ کر............ ان کی تنگ دستی اور انہیں دھکا دے کر پیچھے کرتے ہوئے لڑکے کو ناچنے کا اشارہ کیا۔ ماسٹر لعل حسین نے اس سے بھی زور سے ''بڈاوا'' والے کو دھکیلا اور لڑکے کو اپنی آغوش میں لے کر کھڑے ہو گئے۔

چند ساعت کے بعد لوگوں میں ہیجان پیدا ہو گیا کیونکہ ناچ دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ پیسے برس رہے تھے' بچہ سہما ہوا ایک کونے میں کھڑا تھا............ مجمع حیرت و استعجاب کے ملے جلے تاثر میں، مصنوعی اور بے جان خوشی کو گنڈ کرتے ہوئے، سیٹیوں، تالیوں اور طرح طرح کی فقرے بازی کی باڑ ہوئیں پھر سے رقصِ بسمل دیکھنے میں مصروف ہو گیا جبکہ ایک حیران و پریشان کمسن بچہ' بے بسی و بیکسی کے عالم میں بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کرنے کے باعث تماشا بھی تھا اور تماشائی بھی!!!

☆

○

''شاید تمام تعلیم کا نہایت قیمتی نتیجہ یہ ہے کہ یہ انسان کو اس قابل کر دیتی ہے کہ انسان زندہ رہ سکے جو اس کو کرنا ہی ہے، جب وہ کرنا ہی ضروری ہوتا ہے چاہے اس کو پسند ہو یا نہ ہو۔ یہ زندگی کا پہلا سبق ہوتا ہے جو یاد کرنا اور سیکھنا ضروری ہوتا ہے اور انسان جس قدر جلد سبق سیکھنا شروع کر دے یہ غالباً آخری سبق ہوتا ہے جو وہ مکمل طور پر سیکھتا ہے''

(تھامس ہکسلے)

ماہر علی

''اشکوں کی زباں''

محمود الحسن

(راولپنڈی)

ہم تو کہتے ہیں کہ ہم پہ مہرباں کوئی نہیں
آپ بھی کہہ دیجیے بیشک کہ ہاں کوئی نہیں

کس طرح چپ چاپ کہہ دیتے ہیں یہ بھی دل کا حال
لوگ کہتے ہیں کہ اشکوں کی زباں کوئی نہیں

پہلے شکوہ تھا کہ رونے سے نہیں حاصل فراغ
اب شکایت ہے کہ دل کا ترجماں کوئی نہیں

جذبۂ بے اختیارِ شوق خود ہے راہبر
کون کہتا ہے امیرِ کارواں کوئی نہیں

جانے کیوں خود کو سمجھ بیٹھے تھے گردوں کا ستوں
وہ کہ جن کا آج دنیا میں نشاں کوئی نہیں

قربتیں ایسی کہ تم رگِ جاں ہو گئے
اب تمہارے اور ہمارے درمیاں کوئی نہیں

کاش ہو حسنِ عمل سے بھی مزین اُن کی بات
ہیں کئی آتش بیاں آتش بجاں کوئی نہیں

دوستو ہے یہ رہِ الفت میں مرمٹنے کا نام
یہ نہیں تو پھر حیاتِ جاوداں کوئی نہیں

سایۂ دامانِ رحمت اے میرے پیارے رسولؐ
سر پہ ہے خورشیدِ محشر سائباں کوئی نہیں

تھی کبھی محمودؔ جن سے گرمیِ بازارِ عشق
آج کیوں وہ سربکف آتش بجاں کوئی نہیں

سید مشکور حسین یادؔ

(لاہور)

اپنی طرف نگاہ نہ کرنا براہِ راست
ہر روز آئینے سے گزرنا براہِ راست

ہے اپنے آپ سے بھی ڈرنا براہِ راست
کرنا براہِ راست مکرنا براہِ راست

معمول ہے ہمارے لئے تیرے ہجر میں
مصحف کی طرح خود پہ اترنا براہِ راست

اک شغل ہو گیا ہے ترے نام کے طفیل
بننا براہِ راست سنورنا براہِ راست

ہے گردو پیش پھول کھلانے کا اک ہنر
خامہ کا ہر طرح سے ٹھہرنا براہِ راست

بارش بہاروں کی بشاشت پہ کیا ہوگی
آساں ہوا بشر کو بکھرنا براہِ راست

اچھا لگا ہے داورِ محشر کو جانِ یادؔ
محشر کے درمیان ٹھہرنا براہِ راست

○

مظفر حنفی

(دہلی بھارت)

تجھے خیال میں مل جاؤں گا کہیں بھی میں
کہ آسمان بھی میں ہوں یہاں زمیں بھی میں

نظر بھی میں ہوں نظر کا جمال بھی میں ہوں
حسیں کے ہاتھ کا آئینہ بھی حسیں بھی میں

مرا خمار اتارے سے کیا اترتا ہے
کہ پینے والا بھی میں جامِ احمریں بھی میں

یہ تجربے کے مزاجوں کا فرق ہے ورنہ
شراب جیسا خنک بھی ہوں آتشیں بھی میں

ہوا جو ذات کا عرفان تو دیکھتا کیا ہوں
کہ لامکاں کا مکاں بھی ہوں میں مکیں بھی میں

خود اپنا آپ ہے دنیا سے بڑھ کے مجھ کو عزیز
خود اپنے واسطے ہوں مارِ آستیں بھی میں

بہک نہ جائیں مظفر عوام اسے پڑھ کر
یہ قیل و قال آں بھی میں ہوں ایں بھی میں

○

امین راحت چغتائی

(راولپنڈی)

سحر بھی آئی تو اپنے جلو میں لائی شام
سنور سنور کے بگڑتے رہے ہمارے کام

بتاؤ کوئی ہمیں اختیار ہے کہ نہیں
یہ چار دن کی بھی ہے زندگی اُسی کے نام

یہ آئینہ بھی ازل سے مصالحت آثار
کہ جو بھی آئے وہ اس میں دکھائی دے گلفام

اِسے بھی کوئی مکافات کا عمل جانو
بدل رہے ہیں مکانوں کی تختیوں کے نام

کسی دریچے میں آنچل نہ آنکھ روزن میں
یہ کس گلی میں پہنچ کر ہمیں بھی آئی شام

کبھی قریب سے گزرو تو کچھ سنائی دے
مچا ہوا ہے جو خلقت کے دل میں اک کہرام

فریب حدِ نظر کا تھا اور کیا راحتؔ
جسے سمجھتے رہے ہم بھی چرخِ نیلی فام

○

پی۔ ایس۔ جبین جوہرؔ

(میرٹھ بھارت)

پردیس میں رہنے کے ٹھکانے بنا لئے
جانا ہم سے دور بہانے بنا لئے

کیا ہم پہ گذرتی ہے کسی کو نہیں معلوم
رسوائی کے دنیا نے فسانے بنا لئے

ناقابلِ برداشت سکھیوں کے قہر سے
بچنے کو راستے میں ٹھکانے بنا لئے

تم نے مری آزاد خیالی و انا کو !!
تنقید کے پرزور نشانے بنا لئے

کہتے ہو کاروبار کی خاطر گئے پردیس
لوگوں نے زہر گھول کے طعنے بنا لئے

تھا ایک ہی سوال مجھے چھوڑ کیوں گئے
کیا کیا جواز تم نے نہ جانے بنا لئے

تم نے مرے شباب کی دنیا اجاڑ کر
اپنے ہی شب روز سہانے بنا لئے

جانے مری وفا میں کمی تھی کہ تم میں تھی
غیروں کو اپنے' ہم کو بگانے بنا لئے

لگتا ہے میرے حسن و جوانی سے اوب کر
اب غیروں کی بانہوں کے سرہانے بنا لئے

بڑھتے ہی گئے فاصلے دونوں کے درمیاں
آخر لکیر کھینچ کے خانے بنا لئے

ولی عالم شاہین (کینیڈا)

عذابِ نقلِ مکانی تو اک بہانہ ہے
سگِ زمانہ جہاں ہے سگِ زمانہ ہے

بھری تھی آنکھ میں جو چاندنی شبِ رفتہ
یقین کیسے کروں آج وہ فسانہ ہے

تماشے اور تھے لاڈلیوں کے وقتِ سفر
اک اور بوجھ بہت دور تک اٹھانا ہے

ہر ایک کو ہے وہ نسبت ہر ایک سے کہ یہاں
ترا خیال بھی اک لطفِ محرمانہ ہے

لگائے مل کے برس بھر کے قہقہے اک دن
امریکا کی ادا ایسی کافرانہ ہے

غلط جگہ ہو غلط وقت یا غلط لہجہ
تحفظات کی حد سے نکل ہی جانا ہے

ہوا کے دم سے فروزاں ہے جس دیئے کی لو
ہوائے تند کا آخر وہی نشانہ ہے

ہے سر پہ سایہ فگن کوئی بدنما فانوس
حیات کس ہوسِ دوں کا شاخسانہ ہے

عزیز تھی تجھے آوارگی ہوا جیسی
عجب نہیں کہ بگولوں کا اب نشانہ ہے

خود اپنے آپ سے باہر تو رہ کے دیکھ لیا
درونِ دل بھی وہی دخلِ دام و دانہ ہے

مگر ہم اس کی بھی شاہینؔ خیر مانگتے ہیں
خوشی سے اپنا تعارف تو غائبانہ ہے

سرور انبالوی
(راولپنڈی)

شب زندگی کی سحر ہوگئی
محبت کی مجھ پر نظر ہوگئی

زمانہ اُسی سمت کو چل پڑا
نگاہِ محبت جدھر ہوگئی

کبھی اس نگر اور کبھی اُس نگر
ہماری تو یونہی بسر ہوگئی

اُمڈ آئی دنیا اُسے دیکھنے
یہ بستی کو کیسے خبر ہوگئی

وہ آئے تو پلکوں پہ اشک آگئے
مری داستاں مختصر ہوگئی

امیدوں پہ بھی اوس پڑنے لگی
بڑی دیر اے نامہ بر ہوگئی

دوانے تو کچھ کام کرنا نہ تھا
دعا بھی تو اب بے اثر ہوگئی

ترا نام ہونٹوں پہ جب سے سجا
مری ذات بھی معتبر ہوگئی

سرورؔ اُس کے کوچے سے گزرا میں کیا
میری خاک بھی معتبر ہوگئی

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہؔ (دلی بھارت)

ماضی سے اترے کوئی زہرہ جبیں
مجھکو لے جائے گزشتہ میں کہیں

کسمساتی حسرتوں کا نزول
مضطرب کرتا ہے اب بھی ہمنشیں

محرومیوں کا تذکرہ کرتے رہے
اور کہتے ہیں کوئی خواہش نہیں

کل تھے بزمِ شوق کے روحِ رواں
آج ناصِر نگاہ کوئی نہیں

بنتے پھرتے تھے جو ہر دل عزیز
کوئی اب اُن کو صدا دیتا نہیں

اپنا' میرا کہتے جو تھکتے نہ تھے
دل سے نسبت تھی کسے اے ہمنشیں

چل دیے سب چھوڑ کر دور و دراز
اس پہ طُرہ یہ کہ ہم تنہا نہیں

وہ ہوئے ہیں سرخرو یہ زعم خود
لخت لخت کرکے کسی کا یقیں

کہتے ہیں آوازے جرمِ خیال
لرزاں ہوا جسدِ خاکی کا مکیں

ہم نا کہتے تھے کہ اُوب جاؤ گے
اب تمہارا جی نہیں لگتا کہیں

لکھے تھے عیش و طرب تقدیر میں
پھر زری آنکھیں ہوئیں کیوں آبگیں

''ہوگیا لبریز جامِ زندگی''!
کہتے کہتے کوئی گزرا ہے قریں

اپنے ہونے کا کرو اعلان تم
اور کھو جاؤ کہیں پھر ہمنشیں

تشنہؔ رہنا ہے مقدر آخرش!
جھانک اندر تو یہ منظر خود ہیں

جلیل عالی
(راولپنڈی)

خوئے قاتل تری تدبیر کہاں لائی ہے
سوئے مقتل تو ہمیں وحشتِ جاں لائی ہے

اس کے آگے یہ تری ناجوری ہے کیا شے
جیسے منصب پہ ہمیں دل کی فغاں لائی ہے

ہم سے صحرائے انا پار کہاں ہوتا تھا
یہ تو اک موجِ محبت ہی یہاں لائی ہے

سوچ جس سمت بھی نکلی ہے یقیں کی دھن میں
بھی ہر بار ہوا اور گماں لائی ہے

وقت کی دھوپ ہوئی تیز تو اک یادِ جمال
سایۂ ابرِ تسلی کی اماں لائی ہے

ہے ذرا اور ہی احساس کہانی اپنی
سو ذرا اور سا اندازِ بیاں لائی ہے

○

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
(بھاگلپور، بہار)

گمرہی آگہی ضروری ہے
یہ بھی وہ بھی ضروری ہے

چاندنی کا سراغ پانے کو
دھوپ سے دوستی ضروری ہے

خودسروں کو بھی راہ پر لائے
ایسی کچھ بندگی ضروری ہے

آشنائی وقار پا جائے
ایسی بے گانگی ضروری ہے

ظلمتِ شب بھی مانگتی ہے دعا
میرے گھر روشنی ضروری ہے

گرم سورج چمن میں اترا ہے
کچھ نہ کچھ تازگی ضروری ہے

رہبری کو ہوا غبار نصیب
اس لئے گمرہی ضروری ہے

منزلیں اس طرح نہیں ملتیں
کچھ تو دیوانگی ضروری ہے

دل سے مجبور ہوں مناظر میں
اس لئے شاعری ضروری ہے

علی کمیل قزلباش

(کویت)

تکمیل ضروری نہیں آثار مگر رکھ
گھر بن نہیں سکتا، نہ ہو دیوار مگر رکھ

پھل دے، نہ تصرف میں تیرے سایہ ہوا تا
رستے میں کہیں وقت کے اشجار مگر رکھ

معیار ہو کچھ بھی یہ ضروری ہے بہت عشق
جیسا بھی ہو جتنا بھی اظہار مگر رکھ

کس آن میں کیا جانیے حالات ہوں کیسے
دشمن نہیں رکھتا کوئی، تلوار مگر رکھ

عمروں کی ضمانت تو کوئی دے نہیں سکتا
اک لمحے کی یاری ہی سہی یار مگر رکھ

اشراف کی مانند نہ رکھ زر کا خزینہ
کیسے میں کمیل اپنے کچھ اشعار مگر رکھ

○

غلام مرتضیٰ راہی

(فتح پور بھارت)

ڈبو کر دیکھتا تھا یار مجھ کو
سکھایا تیرنا بیکار مجھ کو

وہی کشتی، وہی پتوار مجھ کو
ملا اُس نے کھیون ہار مجھ کو

زباں کی کاٹ سے دیکھا ملا کر
لگی کچھ تیز کم تلوار مجھ کو

کبھی ہوتی نہ پھر لڑنے کی ہمت
ملی ایسی نہ اب تک ہار مجھ کو

ہے برحق "ہر کمالے را زوالے"
گرا چوٹی سے اے کہسار مجھ کو

جنہیں ہے ناز اپنے فاصلوں پر
پکڑنے دیں ذرا رفتار مجھ کو

کسی نے وصل کا وعدہ کیا ہے
بلایا ہے سمندر پار مجھ کو

قیامت کے سوا نزدیک ما نا
نظر آتے رہے آثار مجھ کو

نظر سے اس کی گرنا تھا کہ راہی
سنبھلنا ہو گیا دشوار مجھ کو

فیصل عظیم

(کینیڈا)

یہ جوالا خاک میں کیسے دبائیں
کہاں تک آخر اپنا جی جلائیں

زمیں لاوا اُگلنا چاہتی ہے
پہاڑ اب اپنے اپنے سر بچائیں

بہت پتھر پڑے ہیں خواہشوں کے
ہم اس ملبے کے نیچے دب نہ جائیں

یہ روز و شب جو بے چینی بہت ہے
تو کیا ہم اپنے خیمے پھر اُٹھائیں

ہر اک جانب سے حملے ہو رہے ہیں
پلٹ آتی ہیں خود اپنی صدائیں

پناہیں ڈھونڈتی ہے خود کلامی
کہ اندیشوں کی آوازیں نہ آئیں

کوئی کرتب ہے گویا زندگی بھی
کہ رسی پر چلیں اور ڈگمگائیں

میں اب جو منہ چھپائے پھر رہا ہوں
تو کیا میں واقعی چہرہ نما تھا

رب نواز مائل

(کوریا)

بہر سُو جس سے گویا کچھ جمال آئے
ہمیں بھی کاش ہاتھ ایسا کمال آئے

یہ چپ سے سانحہ جیسا پڑا ہے اب
لبوں پر بھی، نہ تو پھر اِک سوال آئے

سمٹنے کو ہو جیسے سب و جود اپنا
پس ہجر مدیہ اب تو وصال آئے

محبت میں اسے بھی کم نہ سمجھوں گا
اگر اس کو مرا بھی کچھ خیال آئے

کہاں ہیں وہ، کہاں سے ہم انہیں لائیں
وہ جن کے ہاں سے جب آئے نہال آئے

معمّا سا معمّا ہی کہیں جس کو
یہ کیسے عہد کے آگے سوال آئے

○

ایک مسلسل غزل

رؤف خیر

(حیدرآباد دکن)

بچھا ہوا ہے زمیں رنگ جال سا کوئی
ہے آسمان بھی ہم پہ۔ وبال سا کوئی

کہیں سے لاؤ ہماری مثال سا کوئی
ہماری طرح کا آشفتہ حال سا کوئی

وہ کر رہا ہے مسلسل دلوں پہ بمباری
دلا رہا ہے ہمیں اشتعال سا کوئی

لگا ہوا ہے ازل سے مرے تعاقب میں
کبھی عروج سا کوئی زوال سا کوئی

جو خوش جمال بھی ہے اور ہم خیال بھی ہے
مرے لیے تو ہے مال و منال سا کوئی

ہمیں گزند پہنچنے کبھی نہیں دیتا
ہے ایک ہاتھ جو بنتا ہے ڈھال سا کوئی

ادھر اُدھر کی حکایات بے سند نہ سنا
سخن سنا تو کسی حسب حال سا کوئی

رؤف خیر ہمارا کمال چبھتا ہے
پڑا ہے یاروں کی آنکھوں میں بال سا کوئی

منظور ثاقب

(فیصل آباد)

شریف زادوں کو ناواقفِ وفا نہ سمجھ
لباسِ امن میں شاہیں کو فاختہ نہ سمجھ

جو حرفِ حق تمہارے منہ پہ برملا ہے کہا
مری بلا سے اسے حرفِ باغیانہ سمجھ

ہمیں اشکوں کے پیچھے چھپی ہے جو کلفت
زمین عشق کا اس کو تو آبیانہ سمجھ

سرِ خیال ملے گر کوئی حسیں تو اسے
تو راہوار تغزل کا تازیانہ سمجھ

گزرتے لمحے کی قیمت نہ تول لمحے میں
گزرتے وقت کا ہر لمحہ تو ایک زمانہ سمجھ

تری شکست میں ممکن ہے تیرا حصہ ہو
تو اپنے آپ کو اس درجہ بے خطا نہ سمجھ

بنظرِ خاص پرکھ تو سدا جہاں کا چلن
رواروی میں ہر اک بات کو روا نہ سمجھ

فلک کے ساتھ زمیں کو بھی ڈگمگا دیں گی
کسی کی آہوں کو اتنا بھی نارسا نہ سمجھ

اگرچہ دعویٰ تجھے وسعت نگاہ کا ہے
مگر نگاہ کو اپنی تو طائرہ نہ سمجھ

دلوں کے ٹوٹنے جڑنے کی ان صداؤں کو
حیات ایک حقیقت ہے واہمہ نہ سمجھ

یہ نارسائی بھی تو ہے ایک وجہ بھی
تو پارساؤں کو اتنا بھی پارسا نہ سمجھ

سوائے اس کے سمجھ لے تو جو بھی کچھ چاہے
ہاں مال و دولتِ دنیا کو تو خدا نہ سمجھ

رپورتاژ۔۔۔ نگلیں گُم گشتہ

طاہرہ اقبال (فیصل آباد)

(قسط: ۲)

ہمارے میزبانوں کا فلیٹ گلشن ٹو میں تھا۔ تین کمروں کے اس خوبصورت، چھوٹے سے فلیٹ کا کرایہ حکومتِ پاکستان ساٹھ ہزار ٹکا ادا کرتی تھی۔ دراصل حکومتِ پاکستان کی ڈپلومیٹ کو یہ واضح ہدایات ہیں کہ پاکستان کے وقار کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے اور ایک اچھے معیارِ زندگی کو اپنایا جائے۔ اسی لیے انھیں پاکستان کی نسبت کہیں زیادہ تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ اس سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر فریسہ کی چودہ سالہ بیٹی اُصلا نے اس نئے ملک سے متعلق ہمیں معلومات دینا شروع کیں۔

"یہ لوگ زبان کے معاملے میں بہت Touchy ہیں۔ ان لوگوں کی زبان سے محبت دیکھ کر ہمیں شدت سے احساس ہوا کہ ہم بھی اپنی زبان سیکھیں۔" یہ انگریزی بولنے والی فیملی اب اردو کے قریب ہو رہی تھی لیکن انگریزی کے بیچ ٹوٹا ٹوٹا کر اور کچھ اُکھڑا اُکھڑا کر۔ "ہم اردو بولتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں لیکن یہ فخر سے بنگلہ بولتے ہیں۔" کمرے کو جیسا حبس گھیرے کھڑا۔

انسانی نفسیات بھی عجیب ہے کہ جب کوئی مشترکہ دشمن ہدف نہیں رہتا تو پھر گروہوں میں بٹ کر خود ہی سے لڑنے لگتے ہیں۔ کچھ ویسی ہی عدم تحفظ کا شکار نظر آتی ہے۔ ہماری جبلی اختلاف اور مبارزانہ فطرت لڑنے کے لیے سو ایک بہانے ڈھونڈ نکالتے ہیں تو قوم کو متحد رکھنے کے لیے کسی مشترکہ دشمن کا ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے۔

"روزانہ صبح سکول اسمبلی میں 71 کے واقعات بیان ہوتے ہیں اور آزادی کے ترانے گائے جاتے ہیں جن میں اپنی فتح کا ذکر ہوتا ہے کہ دشمنوں نے ہمارے بھائیوں کا خون بہایا لیکن ہم نے انھیں شکست دی۔ اپنے وطن کو اُن سے پاک کیا اور بالآخر دھرتی ماں کو آزاد کروایا۔"

پر یہ تو کوئی جا کر پوچھے۔ نواب سلیم اللہ خان، مولوی فضل الحق (شیرِ بنگال) حسین شہید سہروردی اور نذرالاسلام کی روحوں سے کہ آزادی کتنے عرصے بعد غلامی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور آزادی کے لیے دی گئی قربانیاں کتنے عرصے میں اپنی تاثیر کھو دیتی ہیں اور نئے غلام کس نئی فتح کے حصول کے لیے نئے آقاؤں سے لڑنے لگتے ہیں اور انہی سے مدد مانگنے لگتے ہیں جن سے کبھی آزادی چھینی تھی۔ کب مذہب کا اتحاد قومیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قومیت زبان میں محدود ہوتی ہے۔ زبان خطوں میں۔ یوں تو پھر آزادی گھر گھر تک مقید ہو جائے گی۔ گھر میں بھی فرد فرد تک اور ہر فرد دوسرے فرد کی آزادی میں مخل۔ آزادی بٹتے بٹتے کس اکائی میں روپوش ہو جائے گی اور پھر کوئی طاقت سب اکائیوں کو نگل جائے گا۔ تاریخ میں یہی لکھا ہے۔ پر تاریخ کبھی سبق نہیں سکھایا کرتی۔ ہر نسل اپنے تجربات سے خود ہی سیکھتی ہے اور پھر وہیں جا کھڑی ہوتی ہے جہاں پہلی کھڑی تھی۔ شاید اسی گورکھ دھندے کے پیشِ نظر اسلام میں جہاں مذہب کے بنیادی ارکان کی پابندی پر زور دیا وہاں حاکموں کی اطاعت کا بھی پابند کیا۔

اُصلا بتا رہی تھی۔ "مجھے سکول میں بچے گھیر لیتے ہیں کہ تم پاکستانی ہو ہماری قاتل ہو لیکن ہمیں یہی سمجھایا گیا تھا۔ ان کی کسی بات سے بھی اختلاف نہ کرو۔ کہو جو آپ کہتے ہیں وہ بالکل درست ہے لیکن مارنے والی میں تو نہیں۔ اُن سے پوچھو جو مارے گئے اور ہمارے سر الزام ڈال گئے۔ ہمارے لیے تھوڑی مارے گئے اپنے اپنے مفادات کے لیے مارے گئے۔" شدت سے وہ مصرعہ یاد آیا۔

؏ لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

ہر پاکستانی انھیں اسی 93 ہزار فوج کا سپاہی نظر آتا ہے۔ چاہے وہ دہائیوں بعد ہی کیوں نہ پیدا ہوا ہو۔ "کوئی صوبے کا پوچھے تو ہم اپنے صوبے N.W.F.P کا کہہ دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ خصوصاً پنجابیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔" ہر ایک کو کھلا زہر بھرے دسترخوان خوش آمدید کہنے والے جو دل میں آ ایل ہلا کر کہہ جانے والے اور جلدی سب اختلاف بھول جانے والے پنجابی جن کے دور ہیروں کچھ بھی بعد نہیں، ہر آنے والے فاتح کو حکمران مانا جن کی تاریخی سرشت رہی جو بھی آیا پنجاب کہیں مزاحم نہ ہوا کہ چاہا تاکہ کیا کہ چاہا آگے بڑھ گیا۔ پنجاب نے ہمیشہ محفوظ رستہ دیا۔ پھر یہ پنجابی اتنے دور مارنے کو کیونکر چلے گئے کیا مارنے والوں میں بس پنجابی ہی شامل تھے۔ نہیں تو پھر یہ مارنے والے کون کون تھے۔ ہمارے ہی بڑے تھے لیکن انہوں نے کیوں مارا۔ مارنے والے حالات کیونکر پیدا ہوئے کس کس نے پیدا کیے کہیں بھی تو کچھ غیر جانبدارانہ نہ تھا۔ نہ اِدھر نہ اُدھر۔

سوالوں کی کثرت نے بوکھلا دیا۔

"آپ بھی کسی کو مت بتائیے کہ آپ پاکستانی ہیں یا کم از کم پنجابی ہیں۔" ہمیں اپنی شناخت چھپانی ہو گی۔۔۔ ہمارے ہاتھوں پر یہاں مٹنے والے لاکھوں خاندانوں کے کسی نہ کسی بڑے کا خون لگا ہے اور خون کی بُو بہت دور سے پہچان لی جاتی ہے۔ اسی لیے تو کل شام ایک دکان کے باہر کچے ناریل کے ڈھیر میں سے ناریل خرید کر پانی پیتے ہوئے ناریل فروش لڑکے نے پوچھا تھا۔

"بھائی لوگ کہاں سے آئے ہیں کیا؟" اور ہم خاموش رہے تھے۔

بتانے کی جرأت نہ ہوئی تھی کہ ہم پاکستانی ہیں تمہارے بڑوں نے ہم وطن کیونکہ ناریل کے ڈھیر پر بیٹھے تینوں لڑکے ہمیں جس فراخدلی سے بیٹھے

اور پکے ہوئے ناریل پیش کر رہے تھے! جس خلوص سے مسکرا مسکرا کر
دیکھ رہے تھے ان کی اس مہمانداری کو زک پہنچانے کو کوئی نہ چاہتا تھا۔

کتنے پیارے ناریل کے سر میں سوراخ کرتے اور اچھل کر پانی
باہر نکل آتا بہت مزے کا بالب بھرا ہوا پانی' جیسے منہ زور چشمہ پھوٹ پڑا ہو جیسے
وہاں ڈاب بولتے ہیں۔

ڈاب میں مزہ لگا کر پیتے ہوئے ہم نے سوچا تھا اگر ہم کہہ دیں ہم
پاکستانی ہیں۔ تمہارے پرانے ہم وطن تو یہ 71 کے بعد کی نسل کا کیا ردعمل ہوگا
جنہوں نے پینٹ شرٹ پہنی ہوتی ہے جو دھوتی شرٹ ترک کر چکے ہیں۔ پر
دشمنیاں ترکے میں ملتی ہیں اور نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ انھیں ترک کرنے
والے حالات کب اور کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ کتنی نسلیں اس انتقامی زہر سے
نیلو نیل ہوں لیے تریاق کا ست بنتی ہیں۔

رات کھانے پر ڈاکٹر فریدہ کی بہو اولی نے بریانی بنائی تھی' جسے
کھانے کو ہمارے سوا کسی نے چمچ کانٹا استعمال نہیں کیا تھا۔ ہمارے میزبان بتا
رہے تھے یہاں امیر غریب کا دسترخوان ایک جیسا ہی ہے کسی سرمایہ دار کی
شادی پر بھی چلے جاؤ' یہی بریانی' سبزی' یا مچھلی ملے گی اور آخر میں مٹھائیوں میں
ڈلی ہوئی کھیر' اور سب ہاتھوں سے کھاتے ہیں اور بڑے مزے لے لے کر کھاتے
ہیں۔ یہاں کمپلیکس نہیں ہے کسی کو بھی' منسٹر بھی سائیکل رکشہ پر بیٹھ جائے گا۔

نریان نے سائیکل رکشہ کی سواری کا اشتیاق ظاہر کیا تو صاحب نے
فوراً ٹوک دیا کہ۔ "جب تم سائیکل رکشہ پر بیٹھو گی تو لوگ کہیں گے یہ غریب ہیں۔
ان کے پاس کار نہیں ہے"

ڈاکٹر فریدہ نے کہا "یہ مخصوص پاکستانی ذہنیت ہے۔ ہم لوگ
اسٹیٹس کانشس ہیں۔ جبکہ یہاں یہ مرض نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ زبان کے متعلق
کمپلیکس کا شکار ہیں۔ نہ اسٹیٹس سے متعلق جیسا کہ ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ پنجابی
بولنے والے سے ہم اردو بولتے ہیں اور اردو بولنے والے سے انگریزی' یا پھر نکلتے
ہیں تو ہوٹلوں' پارکوں میں بچوں سے انگریزی بول کر دوسروں پر رعب ڈالنے کی
کوشش میں لگے رہتے ہیں اور اپنی مادری یا قومی زبان میں بات کرنا گویا عوام
میں شامل ہونے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ عام آدمی کا ہم زبان ہونا بے عزتی کی
بات معلوم ہوتی ہے۔

تیسری منزل کے فلیٹ کی کھڑکی سے باہر کا منظر لبھاتا تھا۔ جھیل کے
ساکن پانیوں میں کیلوں کے سائے ٹھہرے تھے جیسے بانہیں پھیلائے کسی سے
گلے ملنے کو بے تابانہ بڑھ رہے ہوں۔ کسی محبوب کو کسی پسندیدہ مہمان کو جن کے
تنوں کے ساتھ یہاں کے فلیٹوں کی طرح کئی منزلہ کیلوں کے گچھے لگے تھے' اور
ناریل کے پیڑ پھلوں کی مالائیں لٹکائے دھمال ڈالتے تھے۔ یہاں کیلے اور
ناریل روزانہ کی چیزیں تھیں جو سستے اور اچھے تھے ورنہ باقی پھل اس قدر مہنگے کہ

قیمت ہی کرنسی ختم ہو جائے' جس روز ہم پاکستان سے آئے تو کینو کی معمولی قسم دس
روپے درجن کی آوازیں گھنٹہ گھر کے اردگرد لگ رہی تھیں۔ اچھا سا سرگودھا
سے 175 روپے فی سینکڑہ آیا تھا لیکن یہاں دس روپے درجن والا کینو 180 ٹکا
کلو اور سیب 400 ٹکا کلو کی چھتیں تنت شاپنگ پلازہ میں لگی ہوئی تھیں۔ سیب دو
سو سے چار سو ٹکا کلو تک' دراصل یہاں یہ سارے پھل باہر سے منگوائے جاتے
ہیں۔ یہ نہیں کہ ہماری زمینوں کی طرح ہر قسم کے پھل ہر نوع کی جنس اگا دی اور
گھر کی مرغی دال برابر ہو گئی۔ نہری پانیوں نے ملیں آم کے باغوں کو سینچ دیا۔
کینو سستے آئے تو بازاروں میں رل پڑ گئی۔ خربوزے اور تربوزوں کے پہاڑ
کھڑے ہو گئے۔ مختلف سبزیاں' پھل اور فصلیں اگا دینے کی صلاحیت رکھنے والی
یہ زمینیں بھی اپنے باسیوں کی ہم مزاج ہی ہوتی ہیں یا شاید ان کے مزاج سے
انسانی مزاج اثر پذیر ہوتے ہیں۔ انسانی رویوں اور فطرت میں بھی اپنی مٹی کا
خمیر رچا ہوتا ہے۔ یہاں کم کم اقسام پیدا کرنے والی زمینوں کی طرح بیچنے کھانے
کی چیزیں بھی کم کم' سستی کی اور دور دور نظر آتی تھیں جو اکثریت کی جیب کی
دسترس سے بھی اتنی ہی دور تھیں جتنے دور دور فوڈ پوائنٹس تھے' ایسے ہی جیسے یہاں
کے لوگ اپنے مہمانوں سے دور دور ہوتے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ البتہ
کیلوں کی باڑ سے ڈھکی یہ جھیل بہت خوبصورت تھی جس کا ٹھہرا ہوا مرئی پانی صاف تھا
جس میں موجود کشتیاں ثابت تھیں اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک
لوگوں اور اشیاء کو پہنچانے کے لیے کھڑے کینو (Canoe) بھی کھلے کھلے اور
صاف تھے۔ تو یہ تھی بنگال کی جھیل ہے ہر شخص کے بچپن کی
فنتاسی (Fantasy)۔ یہاں آٹھ مہینے بارش ہوتی رہتی ہے سو ہر ایک دو میل
کے فاصلے پر برساتی پانی کا بڑا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے اور جھیل یا جوہڑ بن جاتا ہے
وہ اس طرح کہ اگر اسے گندگی سے بھر نہ دیا گیا ہو۔ اس میں ثابت اور صاف
ستھری کشتیاں موجود ہوں۔ کناروں پر کھڑے کیلے اور ناریل کے درخت
شاداب اور کنارے چلنے پھرنے کے قابل ہوں تو یہ جھیل ہے ورنہ ایسی جھیلیں کم
ہی نظر آئیں۔ زیادہ تر گندے آئی ہوتی۔ جن کے کناروں پر اگائے ہوئے اور
کیا... وہاں کوڑا' کرکٹ اور بھینسیں تو ہمیں کہیں نظر نہ آئے لیکن ایسا کچھ تھا
ضرور جن کے فضلے سے جھیلوں کے کنارے اٹے رہتے تھے۔ سطح آب پر
آلائشوں کی ایک پوری تہہ تیرتی تھی۔ چھلکوں' لفافوں' ناریل کے چھال' کیلے کے
ڈنٹھل اور شاخیں' گچھے جن کے اندر کے نیچے کائی زدہ پانی لگا تھا۔ تو یہ جوہڑ ہیں جیسے
ہمارے دیہاتوں کے جوہڑ ہوتے ہیں' لیکن بنگالی ناؤں کا کوئی دوسرا اچھو نظر
نہیں آتا جن میں کشتیاں ایک علاقے سے دوسرے تک سفر کرتی ہیں اور اکثر
پہنچ نہیں کہاں جا کے رکتے ہیں اور زیریں سطح کی گندگی کو چیرتے ہوئے کیلوں
ناریل کی ٹوکریوں اور دھوتیوں اور ساڑھیوں کو ڈھوتے رہتے ہیں۔

ہمارے میزبانوں نے بتایا۔ بس سارا بنگلہ دیش ایسا ہی ہے۔ بس

یہ جھیل دیکھ لو گویا سارا ملک دیکھ لیا۔ اس ملک میں ورائٹی نہیں ہے۔ نہ موسم میں نہ نیچر میں نہ اجناس میں، جیسے ہمارے ہاں نیچر کا حسن انواع اقسام میں بکھرا پڑا ہے اور انواع میں بھی بے شمار جہتیں اور زاویے۔ پہاڑ ہیں تو ہر جگہ کے پہاڑوں کا الگ رنگ، دریا ہیں تو ہر ایک کا چلن مختلف، ریگزار ہیں تو میلوں نئے نئے سجاؤ۔

وادیٔ سوات، وادیٔ کاغان، ہنزہ، چترال، مارگلہ کی پہاڑیاں تو اس حسن کا تصور بھی نہیں۔ ہم سب نے پاکستان کے خوبصورت مناظر کو یاد کیا اور تعریفیں کیں۔ یعنی پھر وہی موازنہ اور احساسِ تفاخر۔

"سلہٹ کے چائے کے باغات، بڑی تعریف سنی ہے ان کی۔"

ہم نے دبی دبی خواہش کا اظہار کیا۔

"سبزہ ہی ہے نا ہمارے لیے سبزے کی کیا وقعت۔ خود ہمارے ایبٹ آباد میں چائے کے باغات لگے ہی تھیں اور پھر آپ کا علاقہ ملتان اور [illegible] زرخیزی و شادابی کی کوئی ہے۔"

لیکن میں قدیم اور دیہی بنگال دیکھنا چاہتی تھی۔ بڑے بڑے شہر تو ساری دنیا کے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ وہی اونچی عمارتیں، پلازے، گاڑیاں، سڑکیں، بھیڑ اور رنگینی۔ بس ذرا سا معاشی، معاشرتی اور تنظیم کا ہی تو تھوڑا فرق ہوتا ہے۔"

"یہ آپ ذرا دعا کریں ابر تھمے بس آپ کو دیہی بنگلہ دیش پورے کا پورا نظر آ جائے گا۔ سارا بنگلہ دیش بس ایک جیسا ہے۔ میلوں بڑھتے چلے جایئے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئے گی۔"

شاید یہ وہی نفسیاتی کیفیت تھی جسے نفسیات کی زبان میں ضرور کچھ کہتے ہوں گے کہ جب ہم سے کوئی چیز چھن جاتی ہے تو کچھ عرصہ اس کی کمزوری کا ماتم کرنے کے بعد ہم اس کی خامیاں گنوانے لگتے ہیں اور اس کے ان خامیوں کو یاد کرتے ہیں جن کی وجہ سے ہمیں فائدے کی نسبت نقصان ہی اٹھانا پڑ رہا تھا۔ اچھا ہوا جان چھوٹ گئی۔ لیکن گلشن کے اس علاقے میں موجود چوڑے پاٹ والی یہ جھیل خوبصورت تھی، جس کے متعلق میزبانوں نے بتایا تھا، دعا کریں اس سے خوبصورت جھیل نہیں ہے۔ باقی یہ تو طے ہے کہ سارا بنگلہ دیش بس ایسا ہی ہے جیسے یہ کھڑکی کے نیچے پڑا ہوا نظر آ رہا ہے۔

ڈاکٹر فریدہ کی جوائنٹ کی چھٹی مانگ رہی تھی جس پر وہ خاصی برہم تھیں۔ "ہر چوتھے دن چھٹی ۔۔۔ ڈیوٹی مارنے جاتی ہے۔ بدلنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ جتنی رکھیں، سب کی ایک ہی رام کہانی ہے۔ دوسرا شوہر چھوڑ گیا ہے پہلے کے بچے گاؤں میں نانی کے پاس ہیں اور تیسرے کی تلاش جاری ہے۔"

"اس کلاس کی اکثر عورتیں تین شادیاں ضرور کرتی ہیں اور مرد چھ شادیاں ۔۔۔ ایک عورت یا مرد پر کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ ذائقہ بدلتے رہتے ہیں۔ شاید یہ مچھلی اور دال کے تیل کی تاثیر ہے کہ بارشوں اور جھیلوں بھرے موسموں کی ۔۔۔ جیسے بے اعتبارے یہاں کے دریا اور جھیلیں ویسے ہی ۔۔۔ یہ واحد اسلامی ملک ہے جہاں بارٹن لیگل ہے۔ یہ سب یورپین سازش ہے کہ مسلمانوں کو اخلاقی دیوالیہ پن سے دوچار کیا جائے اور ان کی نسل کم کی جائے۔۔۔"

ڈاکٹر فریدہ زچ ہو رہی تھیں۔ دولی کی چھٹی بین الاقوامی منصوبوں اور سازشوں کا حصہ بن گئی تھی۔ ساڑھے چار فٹ کی سانولی سی مشتِ استخواں دولی میں ایسی کوئی مکمل فریکشن ہمیں تو نظر نہ آئی۔ ڈاکٹر فریدہ کا البتہ یہاں کا چھ سالہ تجربہ بھی تھا کہ یہاں بنگال کا جادو حسین مہروں کا نام نہیں جنسی کشش کا نام ہے جو یہاں کی دال اور مچھلی کی تاثیر میں ہے۔

ہمارے میزبانوں نے بنگلہ دیش میں کمزور پڑتی مذہبی و مشرقی اقدار پر افسوس کا اظہار کیا۔ ہم نے اس افسوس میں شرکت کی اور ہم سب نے اسے مغربی اور ہندوستانی سازش قرار دیا۔ پاکستان کو توڑ کر دراصل مذہب اسلام کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں کو ایجوکیشن ہے۔ لڑکے لڑکیاں فرینڈز ہیں۔ والدین اس مغربی کلچر کی نقل کو تسلیم کر چکے ہیں لیکن مسلمان سازشوں کا شکار آخر کیوں ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنی اچھی چیزیں، اچھی قدریں اور اچھے لوگوں کو آپ ہی مار ڈالتے ہیں یا پکڑ پکڑ کر مرواتے ہیں۔ اس تاریخی سرشت کی بھی کوئی نفسیاتی توجیہہ ضرور ہوگی۔ آخر مسلمان اتنی جلدی اکڑتا، بکتا اور جھکتا کیوں ہے۔ دولا نے بتایا۔ O لیول کی کوئی ایسی لڑکی نہیں ہوتی جو بوائے فرینڈ نہ رکھتی ہو۔ لڑکے لڑکیاں آزادانہ ملتے ہیں۔ یعنی وہی کلچر جو ہمارے ہاں ہائی سوسائٹی اور نچلے طبقے میں مروج ہے لیکن ہمارا متوسط طبقہ بڑا مضبوط ہے لیکن یہاں متوسط طبقہ ختم ہو رہا ہے۔ ہمارے میزبانوں کا تجزیہ یہی تھا کہ یہاں مڈل کلاس مر رہی ہے جب مڈل کلاس ختم ہو جائے تو اخلاقی و مذہبی اقدار کہاں سے ابھریں گی۔ فاقہ زدہ خالی پیٹوں کے لیے تو خدا بھی حرام حدود کو حلال قرار دے دیتا ہے، جہاں روٹی اور گوہر کی شبیہ میں فرق مٹ جائے وہاں اخلاق کی پرستش کیسے ہو، جہاں پیٹ پوجا سب سے بڑا مقصد اور قدر رہ جائے وہاں عقائد کے پاس دار کہاں سے آئیں گے، جہاں دولت کا آہنی پردہ بصارتوں اور سماعتوں کو لپیٹ لے تو وہاں اس خود سے نور کی کرنیں کیسے پھوٹیں گی اور صدا کی لوح سے ضمیر کا سوز کیسے جھلکے گا۔

عموماً انتہائی طبقات، انتہاؤں کو چھو جاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں متوسط طبقہ بہت سٹرونگ ہے۔ اقدار تو مڈل کلاس کا ہی مسئلہ ہے نا، اسی لیے اقدار اور اخلاقیات کا نظام ابھی قائم ہے۔ یہ نتیجہ نکالتے ہوئے ہم سب نے خود کو مڈل کلاس محسوس کیا۔ اخلاقی اقدار اور اسلام کے کڑے وارث۔ بھلا کوئی سپر نیشن سے خود کو الگ کرتا ہے۔ یہ تو وہ لوگ نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے، سازشوں کا شکار ہو کر اپنی اقدار اور روایات کو ہی گروی رکھ بیٹھے۔

☆

''ذوقِ شاعری''

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

خوں میں ڈوبی ہے روشنی دیکھو — یہ بھی ہے رنگِ زندگی دیکھو
کب سے آوارۂ وفا ہوں میں — اک ذرا میری سمت بھی دیکھو
غم تعاقب میں ہیں مسرت کے — دوڑ کیسی ہے یہ لگی دیکھو
زخم دے کر مزاج پوچھتے ہیں — دوستوں کی یہ دوستی دیکھو
جن کو میں آشنا سمجھتا تھا — وہ بھی نکلے ہیں اجنبی دیکھو
میرے چہرے کے آئینے میں کبھی — تم مرے دل کی بیکلی دیکھو
بزم در بزم کر گیا رُسوا — یہ میرا ذوقِ شاعری دیکھو
اُن سے روداد دل کہی تو زہیرؔ — رہ گئی پھر بھی ان کہی دیکھو

سیفی سرونجی (سرونج بھارت)

ہر ایک شخص کو حیران کر کے دیکھوں گا — میں اپنی موت کا اعلان کر کے دیکھوں گا
بہت اڑایا ہے میں نے مزاق لوگوں کا — اب اپنے آپ کا ایمان کر کے دیکھوں گا
میں قطرہ قطرہ زمانے میں خرچ ہو جاؤں — عظیم کوئی میں نقصان کر کے دیکھوں گا
مصیبتوں سے کہو گھر مرے چلی آئیں — میں تازہ اور بھی ایمان کر کے دیکھوں گا
بہت اٹھا لیا شہرت کا لطف اے سیفیؔ — میں خود کو شہر میں انجان کر کے دیکھوں گا

ضیاء پرویز (فیصل آباد)

یاد وہ نام میرے دستِ دعا نے رکھا — غم کی دنیا میں مجھے جسکی وفا نے رکھا
یوں چلے آئے ہیں وہ دل کے نہاں خانے میں — جیسے گلشن میں قدم بادِ صبا نے رکھا
تری صورت کو نگاہوں میں بسایا ہے کبھی — تیری یادوں کو کبھی دل کے سرہانے رکھا
اور بڑھنے نہ دیا دل کے جنوں کو اُس نے — میرے ایماں کا بھرم اُس کی حیا نے رکھا
تیری ذات سے الفت کا صلہ ہے شاید — مجھ کو پستی میں صدا تیری جفا نے رکھا
شہر کے لوگ تو دشمن تھے ہمیشہ میرے — میری عزت کا بھرم میرے خدا نے رکھا
تجھ سے مل کر بھی میرے دل کی اداسی نہ گئی — شبِ تاریک میں سورج کی ضیاؔ نے رکھا

O

ملک زادہ جاوید (نوئیڈا بھارت)

غربت کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا
پھانسی لگا کے مر گیا بزدل نہیں رہا

مٹھی سے ریت کی طرح خوشیاں نکل گئیں
کچھ بھی تمام عمر کا حاصل نہیں رہا

ہیں کیکٹس اُگے ہوئے گملوں میں بے شمار
شاخوں پہ اک گلاب کہیں کھل نہیں رہا

تعلیم بالغاں کی ہوا اسقدر چلی
بستی کا اک بزرگ بھی جاہل نہیں رہا

مفلس نے صبر و شکر کو اپنایا اس طرح
عزت میں کوئی اسکے مقابل نہیں رہا

جاوید قہقہوں کو زمانہ گزر گیا
اب دوستوں کا پہلے سا سرکل نہیں رہا

یعقوب خاور (میر پور خاص)

میں اشک غم سے تھا دُھلا دُھلا ہوا
وہ گردِ جستجو سے تھا اٹا ہوا

زمین تنگ ہوگئی تو کیا ہوا
ہے سر پہ آسمان تو کھلا ہوا

میں نامراد بامراد اسی سے ہوں
ہے جس کے آستاں پہ سر جھکا ہوا

میں بدگماں یا خوش گماں بھی کیوں رہوں
کہ جس سے آج تک نہ سلسلہ ہوا

نہ کام آیا عمر بھر کا ساتھ بھی
میں اس کا ہو سکا نہ وہ مرا ہوا

مگر وہ مہرباں اگر نہیں ہوئی
تو دل بھی کب اسی سے ہے لگا ہوا

مجھے خبر ہے اس کی آرزو ہے کیا
جو راستہ ہے پاؤں میں پڑا ہوا

خوش آئینہ ہوا جو رُو بہ رُو
میں خود پہ پہلی بار آئینہ ہوا

جسے میں ڈھونڈتا رہا تمام عمر
ملا وہ کل کسی کو ڈھونڈتا ہوا

احمد ظہور (اسلام آباد)

اپنے آئینہ احساس میں دیکھو مجھ کو
مجھ کو محسوس کرو مجھ سے نہ پوچھو مجھ کو

ہمسرِ شاہ ہوں نہ کسی شاہ کا مصاحب ہوں میں
مجھ کو جانو تو میرے نام سے جانو مجھ کو

اک تبسم کے عوض جان بھی حاضر ہے مگر
اتنا ارزاں بھی نہیں ہوں کہ خریدو مجھ کو

رک گئے کیوں حدِ ادراک سے آگے جا کر
منظرِ دیدۂ حیرت سے پکارو مجھ کو

مجھ کو تو شوقِ پرستش نے ڈبویا ورنہ
کب صنم بندے سے کہتا ہے کہ پوجو مجھ کو

قیدِ گل سے بھی نکل جاؤں گا خوشبو کی طرح
تم نہ بھنورے کی طرح پھولوں میں ڈھونڈو مجھ کو

میں بھی بکھرا ہوں تری زلفِ پریشاں کی طرح
اپنے ہاتھوں سے کبھی آ کے سنوارو مجھ کو

O

مہندر پرتاپ چاندؔ (انبالہ، بھارت)

معلوم نہیں مجھ کو برا ہوں کہ بھلا ہوں
ہاں، لوگ یہ کہتے ہیں کہ نیت کا کھرا ہوں

یہ بات کھٹکتی ہے زمانے میں سبھی کو
کیوں اہلِ نظر کی میں نگاہوں میں بسا ہوں؟

رتبہ مرا اونچا ہے فلک سے بھی زیادہ
کہتے ہیں مجھے عشق میں خود اپنا خدا ہوں

ہر بار نئے روپ میں آتا ہوں جہاں میں
خود اپنے کیے کی ہی سزا اور جزا ہوں

شرمائے جسے دیکھ کے شاہوں کی بھی پوشاک
بے لوث قلندر کی وہ بوسیدہ قبا ہوں

جس حال میں رکھے مجھے مولا میں اسی میں
دل شاد ہوں، مسرور ہوں، راضی بہ رضا ہوں

جھولی مری خالی ہے مگر آس ہے قائم
میں آج بھی اے چاندؔ! اسی در پہ کھڑا ہوں!

○

صدیق ہمایوں (میرپور خاص)

سوچ رہے ہیں دیوانے
خواب کہانی افسانے

اب آغاز محبت ہے
اور انجام خدا جانے

چشم ہوئی نم ناک کہ پھر
چھلک رہے ہیں پیمانے

آپ جو آئیں محفل میں
پھول لگے پھر مسکانے

میں تو مرتا ہوں اس پر
اس کی باتیں وہ جانے

جو کچھ مجھ پر بیتی ہے
میں جانوں یا تو جانے

اک تصویر خیالی سی
اس پر لاکھوں افسانے

شمع روشن رہتی ہے
مرتے ہیں بس پروانے

○

ڈاکٹر شاہد رحمٰن (فیصل آباد)

آہستہ آہستہ میں چلتا جا رہا ہوں
شہر سے دور نکلتا جا رہا ہوں

میرا اپنے آپ پر قابو نہیں ہے
صورتِ دریا اچھلتا جا رہا ہوں

ہے خیال و خواب کی دنیا مرے ساتھ
اور میں دن رات چلتا جا رہا ہوں

میں رہِ الفت پہ اس کا ہاتھ تھامے
راستے کے پھول چنتا جا رہا ہوں

کچھ نہ کچھ وہ بھی بدلا ہے یقیناً
اور کچھ میں بھی بدلتا جا رہا ہوں

○

حمیر نوری (کراچی)

پھوٹ کر رو بھی نہیں سکتا، سسکتا ہوں میں
اس کی بنیادی سبب یہ ہے کہ ڈرتا ہوں میں

اس کو اس بات کا احساس یقیناً ہو گا
کس طرح شہر کے اس کرب میں زندہ ہوں میں

جو بھی ہونا ہے وہی ہو کے رہے گا اک دن
فرق صرف یہ ہے کہ اس شہر میں تنہا ہوں میں

میری مرضی بھی وہی ہے، جو مرے دوست کی ہے
اس کی آواز میں آواز ملاتا ہوں میں

جاننا چاہتا ہوں، کیوں ایسا ہوا میرے ساتھ
سخت مشکل سے ترے شہر سے نکلا ہوں میں

خواہ کچھ اس کے نتائج بھی برآمد ہوں گے
کیا کروں وقت ہی ایسا ہے کہ سنتا ہوں میں

اس طرف کم ہی توجہ کوئی دیتا ہے یہاں
جو نہیں لکھا گیا ہے وہی لکھتا ہوں میں

اور لوگوں میں مرا نام بھی شامل ہے حمیر
جس سے آگاہ نہیں ہے، وہ شناسا ہوں میں

تصور اقبال (پنڈی گھیب)

سنے میرے غم کے بھی نالے کوئی
بڑے کرب میں ہوں نکالے کوئی

ہماری زباں پہ نہ اُف آئے گی
ہمیں جتنا چاہے ستائے کوئی

بہے جا رہے ہیں سمندر کی اور
مرے آنسوؤں کو سنبھالے کوئی

سنبھل ہی نہ پائیں کسی طور ہم
مصیبت میں ایسی نہ ڈالے کوئی

شبِ غم ہے کٹتی نہیں اس طرح
نئی صورتیں اب نکالے کوئی

مرا گھر ہے نفرت سے تاریک سا
محبت سے کردے اجالے کوئی

گلے مل کے میں نے کہا تھا اُسے
مرے پیار کو یوں سنبھالے کوئی

نہیں ہوں میں پتھر کی صورت اگر
تو فکر و نظر میں خیالے کوئی

مرے عیب یوں تو ہیں لاکھوں مگر
میرے عیب یوں مت اچھالے کوئی

ہمیں اپنی محفل سے "اُن" کے لیے
تصور جی یوں مت نکالے کوئی

ناصر عباس ناصر (ہدی شہزیانوالی)

دربدر پھرتی ہوا کا ہے خیال
زندگی تو کو بکو کا نام ہے

کل شرابی نے کہا بے ساختہ
زندگی جام و سبو کا نام ہے

ایک عاشق نے لکھا دیوار پر
زندگی اُس خوبرو کا نام ہے

اہلِ فرقت نے کہا یہ دوستو
زندگی تو روبرو کا نام ہے

شاعروں نے کہہ دیا کہ زندگی
فقط، شعر و گفتگو کا نام ہے

ہم تو ناصر جانتے ہیں بس یہی
زندگی تو جستجو کا نام ہے

○

راہی کی سرگذشت

صفوت علی صفوت

(نیو یارک)

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے
(داغ دہلوی)

اے لوگو! آپ سب جو اردو زبان کی خوبصورتی پر ایمان رکھتے ہیں جان لیں کہ ہند کے اللہ زادوں پر ایک اور کتاب کا نزول ہوا ہے۔ فرمایا جاتا ہے کہ یہ غلط ہے

اُٹھ کر اُٹھی نہیں لب ہے پیام سے آگ

اے لوگو! پہلے بھی یہ اعلان کیا جا چکا ہے کیا نہیں کھول دیا ہم نے تمہارے لئے تمہارا سینہ اور اُتار رکھا تم سے تمہارا بوجھ

ابھی یہی الفاظ تحریر کیے تھے کہ دل نے ہاتھ سے کہا کہ تھوڑی دیر کو قلم رکھ دیا جائے۔ پھر چند ہندسوں کی ترتیب نے نیو امریکہ کو کراچی پاکستان سے ملا دیا۔ دوسری طرف ٹیلیفون پر محترم فرمان فتح پوری صاحب موجود تھے۔ صحت کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ

اب ہم کو اپنے دل پہ بھروسہ نہیں رہا

صحت کی باتوں کے بعد دریافت کیا کہ حضور آپ فتح پور ہندوستان کے جناب غلام مرتضیٰ راہی کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ کہنے لگے کہ چند روز قبل انکی کتاب "راہی کی سرگذشت" موصول ہوئی ہے۔ ورق گردانی کر رہا ہوں۔ میں نے سوال کیا کہ کیا آپ اُن سے کبھی ملے ہیں تو بولے کہ ملاقات تو نہیں ہوئی مگر مجھے فخر ہے کہ راہی صاحب نے فتح پور کا نام روشن کر رکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کتاب پر میں نے چند الفاظ قلم کرنے کا سوچا ہے اور امید ہے کہ یہ سطور سب سے پہلے راولپنڈی کے چہار سو میں انشا پردازی کی مشق کے طور پر پیش ہونگی۔ فرمان صاحب کہنے لگے کہ یہ بہت اچھی بات ہے۔ اگر تم اپنی تحریر کی کاپی مجھے بھی بھیج دو تو اپنے ایک نوٹ کے ساتھ اسے کراچی سے نکلنے والے "نقاد" کی زینت بنا سکوں۔ سو میں نے اس کی حامی بھر لی۔

چونکہ یہ سرگذشت خود نوشت ہے لہٰذا مصنف پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ غلام مرتضیٰ راہی نے اس ذمہ داری کو بہت خوبی سے نبھایا ہے۔ نوعمری سے لیکر "عمر پیری" تک کے شبستانوں کو روشن کیا۔ دوران میں تنگ دریاؤں کو دریا ہے رواں کر دیا کوئی کمال نہیں۔ شباب کے چشمہ آلودہ زاویوں کا تذکرہ اور سیاہ زلفوں کے سایہ میں ستاروں میں سفر کہ جہاں پر

وقت بہتا ہی نہیں تیری جوانی ہے

ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں راقم کو کہیں کہیں اپنی جھلک بھی نظر آتی ہے صاف بات ہے کہ میں یہاں تخلیقی انتقادی صعوبت میں پڑنا نہیں چاہتا۔ جہاں تک راہی صاحب کے اسلوب کا تعلق ہے تو محترم اسماعیل آزاد سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ زبان صاف ہے گہری ہے جاذب ہے اور روانی میں اپنی مثال آپ ہے اور بلا مبالغہ کتاب پڑھتے ہوئے سب بھولتا جاتا ہوں میں تنقید کی باتیں۔

تاہم اگر راہی صاحب مجھ سے کہتے کہ بھائی کوئی اور عنوان تجویز کرو تو میں اُنکی کتابوں کی "لا" کی تکرار پر جاتا اور تجویز کرتا کہ اس کا عنوان (کتاب کے صفحہ ۸ کے حوالے سے) "لا فکشن" رکھا جائے البتہ (خود نوشت سوانح عمری) کے الفاظ برقرار رہتے۔ تاہم موجودہ عنوان میں لفظ "راہی" بھی راہی صاحب کو بچا لے گیا۔ اور وہ اب بھی صراطِ مستقیم پر اپنے سفر میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔ سچائی کے ساتھ جناب غلام مرتضیٰ راہی کی یہ کتاب اُنکی دوسری تصانیف کی طرح اس بات کا ثبوت ہے کہ ہند میں اردو نہ صرف زندہ ہے بلکہ منزل پا لینے کے لیے بیقرار ہے۔

ہم سوچتے ہیں ہم بھی فتح پور جا بسیں
اُردو کی ایک ہستی کا مسکن وہاں پہ ہے

☆

تخلیقِ عصر

عطیہ سکندر علی (سکھر)

ہوا تحریر کر مجھ کو!

فلک کی چھت سے رکالے ابر کی لیریں اگر ٹکی ہوئی ہیں تو ان
چمگادڑوں سے رخوف مت کھاؤ کہ یہ سب خون کی پیاسی رسیہ ہجر کر پڑیں سے
لپس پر چمکتی تجلی کی اندھی رفتار کے ساتھ عمر سے میں رہ تم ہیں سکتے پہ قادر ہیں تم ان
سے مت ڈرو اور بس روشنی گل نہ ہونے دو!

روشن امیدوں کی نوید مذکورہ بالا نظم ڈاکٹر وزیر آغا کے تازہ شعری مجموعے سے آپ کی نذر کی گئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی نسبت کوئی تعریفی و توصیفی جملہ بچا ہے جو تحریر نہ کیا گیا ہو۔ اس کے باوجود "ہوا تحریر کر مجھ کو!" کی نسبت کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو کتاب کی اہمیت و افادیت کو بہتر طریق پر نمایاں کر سکے۔ ہمارے خیال میں زیرِ نظر کتاب میں درج ڈاکٹر رشید امجد کے مختصر دیباچہ سے بہتر وسیلہ ہو نہیں سکتا۔

"وزیر آغا کی نظمیں، شعورِ ذات اور تعینِ خود کے عصری مفاہیم کی تعبیر ہیں۔ موجود کو نیاتی تناظر میں 'نا' نہ فکری و طبعی پس منظر کے ساتھ انسانی باطن میں اترنے اور ہونے نہ ہونے کی حقیقت دریافت کرنے کا عمل وزیر آغا کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ ایک ہی معنیاتی کل میں بنی ہوئی ان نظموں میں دو آوازیں بہ تکرار ابھرتی اور اپنا آپ تخلیق کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو تابندہ ہونے کے اثبات کی کہانی ہے۔ یہ بھیگی چاپ ہیں، دستک میں ڈھلی، متصل بستیوں کو نیند سے بیدار کرنے نکلی ماتھوں کی قوسوں پر سیہ آنکھوں کے حلقوں، لرزتے بند ہونٹوں پر تحریر ہو کر انھیں زندگی دیتے اور اک اک سمت "ہونے" کا میلہ لگائے رکھنے کی آرزو مند ہے۔ دوسری آواز ایک گھاؤ در گھاؤ کہانی، پہاڑوں میں دراڑیں دراڑوں سے دھواں، اندری اندر جل بجھنے کی کیفیت سے متعلق ہے۔ وزیر آغا نے ان دونوں آوازوں کو کبھی جدا جدا اور کبھی باہم ایک کر کے مصور کیا ہے۔ اس تصویر کشی میں فکری ریاضت، وجدانی تجربے کی حدت اور حسی ادراک کی جودت لفظوں کے ساتھ وارد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مختصر مگر منضبط نظموں میں بلا کی جاذبیت ہے۔ "ہوا" اور "آواز" وزیر آغا کے محبوب استعارے ہیں۔ ان استعاروں کی جتنی متنوع جہات اور امکانات اُن کے ہاں ظاہر ہوئے ہیں، معاصر نظم میں اس کی نظیر کم ہے۔ یہ دو استعارے زندگی، اس کی روانی، تغیر، حیرت اور دیگر کئی مفاہیم اور دیگر معنیاتی پرتوں کے حامل ہیں۔ وزیر آغا کی یہ نظمیں عمر کے اس حصے کی تخلیقات ہیں جب موجود اور ماموجود کے روابط کا ادراک گہرا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں ہوا اور آواز کے استعارے مزید گہرے مفاہیم کے ساتھ آئے ہیں۔ وزیر آغا کی نظمیں، مجموعی طور پر نظم کے خالص آہنگ سے تعلق رکھتی ہیں جو کلی طور پر غزل کے آہنگ سے جدا ہے۔ اردو کی اکثر نظمیں، اپنے فنی برتاؤ میں غزل کے بہت قریب ہو جاتی ہیں لیکن وزیر آغا اُن نظم کہنے والوں میں سے ہیں جنھوں نے غزل اور نظم کے آہنگی اور فنی برتاؤ میں فرق ملحوظ رکھا ہے۔ جدید اردو نظم میں اُن کی منفرد پہچان (موضوع اور برتاؤ) دونوں حوالوں سے موجود ہے۔"

دستیابی: کاغذی پیرہن، عظیم مینشن، رائل پارک، لاہور۔ قیمت: ۱۲۵ روپے

عرضِ ہنر سے آگے

چہارسو کے صفحات اور آپ اس امر کے شاہد ہیں کہ تازہ تصانیف کے تعارف میں ہماری کوشش ہمیشہ تازگی اور تازہ کاری کی رہا کرتی ہے۔ لہٰذا مندرجہ ذیل اشعار کے خالق اور آپ ایک بار پھر روبرو ہو کر دست بدست کا فیصلہ دست دراز میں کیجیے۔

حقیقت سے کہاں پردہ اٹھایا جا رہا ہے
یہ قصہ یوں نہیں جیسے بتایا جا رہا ہے
کھرچ ڈالے گئے سب حرف نوری تختیوں سے
فقط رنگوں میں گم رہنا سکھایا جا رہا ہے

ہر ایک سیلِ بلا کی ہے مار اپنی طرف
سو آئے کیا کوئی سوچ بچار اپنی طرف
غرض اِس آئنہ خانے میں اس کو کیا ہم سے
کہ دیکھتا ہے اُسے بار بار اپنی طرف

بستی میں کوئی بھی نہ ترے ساتھ رہا تھا
ہم نے جو کہا تھا وہی آخر کو ہوا تھا
تجھ کو یہ جنوں تھا کہ جہاں جیت لے سارا
جو پاس تھا وہ بھی ترے ہاتھوں سے گیا تھا

"اس کے ہاں دھڑکن ایک عقدے کی بجائے ایک انکشاف بن کر وارد ہوتی ہے۔ اس دھڑکن میں جغرافیائی بصیرت ہے۔ وہ جلیل عالی کا ایک حیرت انگیز عنصر ہے۔ اس پہلو سے وہ بڑے ہی انگیز شعر کہہ چکا ہے"۔ (احمد ندیم قاسمی)

"جلیل عالی کی غزل کے انسان نے ایک ایسی دنیا تعجباً دریافت کی ہے جو آسمان اور زمین، معاشرے اور تاریخ، مناظرِ فطرت اور حواسِ انسان کے درمیان واقع ہے"۔ (جیلانی کامران)

"حالی انسانی زندگی کے پیراڈاکسیکل حقائق کا شاعر ہے۔ زندگی کے تضادات اور تناقضات اس کی توجہ کا خاص مرکز ہے۔ اس کی شاعری سطور سے زیادہ بین السطور کی شاعری ہے"۔ (ظفر صدیقی)

"جلیل عالی کی شاعری یقیناً اس منزل پر ہے جہاں شاعر اپنا مستقل مقام طے کرنے کی کاوش میں ہوتا ہے اور اس کے واضح آثار اس کے ہاں نظر بھی آتے ہیں"۔ (ظفر اقبال)

"جلیل عالی کی شاعری میں ایسی ہوی سچائیاں اور صداقتیں سمٹ آئی ہیں جو اپنے دلکش اسلوب اور راست فکری کی وجہ سے کلیوں، کہاوتوں اور اقوال کی صورت اختیار کر گئی ہیں"۔ (محمد منشا یاد)

"اس کی شاعری میں جہاں ایک مرکزی تجربے کی رو موجود ہے وہاں ہر غزل اشعار کی الگ الگ اکائیوں کے باوجود مخصوص داخلی اور خارجی فضا لئے ہوئے ہے"۔ (یوسف حسن)

"عالی کی شاعری زندہ تخلیقی عمل سے شرکت کا وسیلہ ہے اور تنوع موضوعات کے باوجود اپنی ایک خاص جہت رکھتی ہے۔ اس سے اپنے مسلک کو عصری حسیت سے جوڑنے اور زندگی کو رزمیہ تجربے کے طور پر دیکھنے کا فن سیکھا جا سکتا ہے"۔
(ڈاکٹر نوازش علی)

قیمت: ۱۷۵ روپے دستیابی: دوست پبلی کیشنز، آئی ایٹ ون، اسلام آباد

لسانیات اور تنقید

اس امر میں اب قطعاً کوئی گنجائش اور اختلاف نہیں پایا جاتا کہ نقد و نظر کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر ممتاز و منفرد مقام کی جانب تیزی سے گامزن ہیں۔ کچھ لوگ اگر نیر صاحب کی جواں عمری اور جواں بختی کو ان کی کامیابی کا راز گردانتے ہیں تو غلط بھی نہیں کرتے مگر قدرت نے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کو پیدائشی طور پر جو تجسس، اشتیاق، وارفتگی اور وہبی عطا کی ہے اس کی مدد سے ناصر صاحب ہر دو ورز دیک کی تمام چیزیں اچھی طرح دیکھ اور پرکھ کے ساتھ ان کی بابت واضح اور ٹھوس رائے قائم کرنے میں بھی خاصے مشاق دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت وہ اپنے دلائل اور نظریات کو قاری پر ٹھونسنے کے بجائے دعوت کلام کا اہتمام کیا کرتے ہیں جس میں ہر نظریہ اور ہر نقطے کو شامل بحث کر کے گفتگو کا حاصل دودھ میں سے بالائی کی طرح نکال کر اپنے قاری کو مطمئن بھی کیا کرتے ہیں اور متفق بھی۔ حال ہی میں پورب اکادمی اسلام آباد نے ڈاکٹر صاحب کے چودہ تنقیدی مقالات کو دوسو پچانوے مجلد صفحات کے جامے میں پیش کیا ہے جس کی بابت ہم اپنے عصر کے واجب الاحترام صاحب قلم کی آرا آپ کی نظر کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

"ناصر عباس نیر ان گنے چنے نوجوان اہل نقد و نظر میں شمار کئے جا سکتے ہیں جو تنقید، تحقیق دونوں شعبوں میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ناصر صاحب نمائش کے لیے لکھتے ہیں نہ کسی کو مرعوب کرنے کا خیال ان کے دل میں ہوتا ہے۔ لکھا پڑھا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ادب میں کیا کچھ لکھا جا رہا ہے اور کیا کچھ اس میں امر واقعی ہے کا کام ہے یا نہیں، اس کی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ زیرکی اور ذہانت تو خدا داد ہیں لیکن انہیں مستقل کرنے کے لئے جس ضابطہ عمل اور جگر دری کی ضرورت ہے وہ ان کی اپنی پیدا کردہ ہے۔ زیرو زبر درست تو سبھی کیا کرتے ہیں لیکن قطعیت کی حد تک بلا کم و کاست ان مغربی ادب اور لسانی تھیوریوں کو سمجھنا اور پھر اردو کے ہم عصر بیانیوں پر ان کا اطلاق کرنا کار سے دارد والا معاملہ ہے اور یہ کام ناصر عباس نیر کمالِ علم سے کچھ آگے نکل کر بہر مندی سلیقے اور شعور سے کیا کرتے ہیں۔۔۔۔" ڈاکٹر ستیہ پال آنند

"گزشتہ چند برسوں میں جن نوجوانوں کی تحریروں نے ان کے خیالات اور تخلیقی صلاحیتوں نے اور ان کے سنجیدہ رویوں نے امید کی شمع جلائی ہے تو میں تنقید کے زمرے میں ناصر عباس نیر کا نام لوں گا۔ ناصر عباس نیر کے مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ خود کو پورا پڑھوانے کی قوت رکھتے ہیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ ان کے منتخب مضامین کتابی شکل میں پڑھنے کا موقع میسر آ گیا ہے۔ یہ مضامین بیک جا و بیک نظر ایک مزاج اور ایک مثال کو ہمارے سامنے متعین کرتے ہیں۔ آج تنقید میں موجود ایک سنجیدہ اور زیرک نقادی کی کو پورا کرنے کے نئے امکانات روشن ہو رہے ہیں۔ یہ مضامین تنقید کے موجود پُر ہول خلا کو اپنے پُر مغز خیالات اور حسنِ آفرینی سے یقیناً آباد و منور کریں گے۔۔۔۔" ڈاکٹر معین الدین عقیل

دستیابی: poorab_academy@yahoo.com قیمت: ۳۰۰ روپے

پیڑ سے بچھڑی شاخ

معدود با رستیم اہل قلم میں جناب نجمہ عثمان اس حوالے سے منفرد مقام کی حامل ہیں کہ وہ بیک وقت نظم و نثر میں اظہار بیان کی قدرت رکھتی ہیں اور ایک زمانہ مغرب میں بتانے کے باوجود مشرق سے اسی طرح جڑی ہیں جس طرح وطن میں مقیم اہل قلم ہوا کرتے ہیں۔ نجمہ عثمان کے تازہ افسانوی مجموعے "پیڑ سے بچھڑی شاخ" کے اندر کل سترہ افسانے شامل ہیں جن کی بابت قریب سات احباب قلم نے اپنے تاثرات کا مثبت انداز میں اظہار کیا ہے۔ راقم السطور کو شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد آٹھ تک جا پہنچتی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ ہمیں آٹھ کی تعداد سے منہا کرتے ہوئے ان سات قابل احترام اہل علم و ادب پر توجہ مرکوز کیجیے جنہوں نے "پیڑ سے بچھڑی شاخ" اور اس کی مصنفہ کی نسبت نئے زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ بصورت دیگر آپ کو فقط ہماری رائے اور تجربے پر قناعت کرنا ہوگی جو یقیناً گھاٹے کا سودا ہوگا جسے آپ بھی شاید گوارا نہ

کریں۔

☆ نجمہ عثمان کے افسانوں میں نہ خطابت ہے اور نہ ہی عورت کی بے بسی پر آہ وزاری۔ ان کے ہر افسانے میں دھیما پن اور انسانی رشتوں کی وہ آنچ ہے جس کی گرمی کبھی کم نہیں ہوتی۔۔۔۔ مصطفےٰ کریم

☆ نجمہ عثمان کے بیشتر افسانے ان رسوم و قیود کی حدود میں رہتے ہوئے بھی قاری کے ساتھ دور تک جاتے ہیں اور اسے ایک احساسِ زیاں کے سپرد کر جاتے ہیں۔ ان افسانوں کا مرکز و محور عورت ذات اور اس کی مظلومی کے مختلف مظاہر ہیں جنہیں وہ چابک دستی سے پیش کرتی ہیں۔۔۔۔ ارمان نجمی

☆ نجمہ کے افسانے برطانیہ میں رہائش پذیر پاکستانیوں کی سماجی، مذہبی مشکلات اور مسلمانوں کی اپنی ایک علیحدہ دنیا بسانے کی کوششوں اور اس میں ناکامیوں کی داستانوں کے بارے میں نہایت سچی جاگتی تصویریں ہیں۔۔۔۔ صفیہ صدیقی

☆ نجمہ عثمان ایک جینوئن ادیبہ ہیں۔ وہ ایک بڑے تخلیقی ویژن کی مالک ہیں۔ نجمہ زندگی سے فرار حاصل کرنے کی غرض سے کہانی نہیں لکھتیں بلکہ کہانیوں میں زندگی کرتی ہیں۔ ابھی ان کے پاس لکھی بہت سی کہانیاں ہیں جنہیں وہ لکھ رہی ہیں اور مجھے انہیں کہانیوں کا انتظار ہے۔۔۔۔ فردوس حیدر

☆ نجمہ عثمان کا نام میرے ذہن میں آتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ وہ شاعرہ زیادہ اچھی ہیں یا افسانہ نگار۔ یہ دونوں باتیں جب خلط ملط ہونے لگتی ہیں تو میرا اول فیصلہ سناتا ہے کہ ان کی تیسری جہت پہلی دونوں خصوصیات پر بھاری ہے یعنی وہ ایک بہت اچھی انسان ہیں اور ہر آدمی کو انسان ہونا کہاں میسر ہوتا ہے۔۔۔۔ عذرا اصغر

☆ نجمہ عثمان نے ہمیں تحیّر میں ڈال رکھا ہے وہ شعر بھی کہتی ہیں اور افسانے بھی لکھتی ہیں۔ یوں تو بہت سے لکھنے والے کئی میدانوں میں طبع آزمائی کیا کرتے ہیں مگر نجمہ عثمان ان سے یوں مختلف ہیں کہ ان کے افسانوں میں نظم کی خوبی شامل ہوتی ہے اور وہ اپنی نظم میں افسانہ کہنے کا ہنر رکھتی ہیں۔۔۔۔ رضا علی عابدی

☆ یوں تو نجمہ کیمسٹری کی طالب علم تھیں مگر لگاؤ انہیں اس زمانے میں بھی ادب سے تھا جس کے باعث ان کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے۔ نجمہ کو نیچر، پھول اور پودوں سے محبت ہے اور یہی محبت انہیں انسانوں اور ان کے مسائل سے بھی ہے جس کا اظہار وہ اپنے میلان کے مطابق نظم اور نثر میں عمدگی سے کر رہی ہیں۔۔۔۔ تنویر اختر

دستیابی: A-517، فیصل ٹاؤن، لاہور۔ 57, ROSEDALE ROAD
EPSOM SURREY KT 17 2J H-LONDON. U.K

اِک جہاں اور

محمد داؤد طاہر عام ڈگر اور روش سے ہٹ کر جدت طراز طبیعت کے حامل ایسے قلمکار ہیں جو ہمیشہ نئی صبح اور نئی اُمید کے ساتھ ایک سے ایک نئے جہاں کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتے ہیں۔ "اک جہاں اور" سے قبل جناب داؤد طاہر "شوقِ سفر میرا" "سفر زندگی ہے" "ایک سفر اور سہی" "منزل نہ کر قبول" "نئی منزلیں پکارتی ہیں" اور اب "اک جہاں اور" پیش کر کے ادبی سرمایہ کو ثروت مند کیا ہے۔ ابتدائے سفر میں داؤد طاہر ایک سفرنامہ نگار کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں اس قدر تیزی سے کامیاب ہوئے کہ اس میدان کے بہت سے شہسواروں نے انہیں داد و تحسین سے نوازتے ہوئے خوش دلی اور خوش امیدی سے اپنی انجمن کا رکنِ رکین قرار دے ڈالا۔ بقول سید ضمیر جعفری "داؤد طاہر کے سفر کے وسیلے سے قاری چند گھنٹوں کے اندر ترکی و ایران دیکھ بھی سکتا ہے اور سمجھ بھی سکتا ہے" جناب جمیل الدین عالی نے داؤد طاہر کے سفرناموں کو صحت، سادگی اور سادہ بیانی کی خوبصورت مثال قرار دیا۔ امجد اسلام امجد نے محمد داؤد طاہر کی تحریر کو خوبصورتی اور مہارت سے جا بجا بے رنگ سے تعبیر کیا جس کی ایک ایک تصویر سچی اور حقیقی دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے داؤد طاہر کے سفرناموں کو حیرت کے ساتھ معلومات کا خزانہ بھی گردانا ہے۔ محترم سید پروفیسر فتح محمد ملک، پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے علاوہ محترمہ بشریٰ رحمٰن اور عطاء الحق قاسمی و مستنصر حسین تارڑ نے بھی داؤد طاہر کو اپنے اپنے الفاظ اور اپنے اپنے انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ آج جناب داؤد طاہر اپنی تازہ تخلیق "اک جہاں اور" کی بابت احباب کے تبصروں اور تذکروں کا موضوع ہیں۔

"اک جہاں اور" لاہور سے ملتان کے درمیان موجود اہم تاریخی و تہذیبی آثار کا ایک دلچسپ تذکرہ ہے جس میں پروفیسر ڈاکٹر شوکت محمود (میکسم کارڈونسٹ) کے چھ صفحات کے دیباچے کے علاوہ پاڑہ وکی، الاپائی، [illegible]، رام گمس، مانگا، چھلے، ترنڈہ، سرائے چھیمبہ، سرائے نورنگ، پھول نگر، چھانگا مانگا، شیر گڑھ، حجرہ شاہ مقیم، دیپالپور، بصیرپور، شاہ برج، قلعہ الیاس خان، ست گرہ، اکبرہ، جہانیاں، رتہ ٹبہ، قتل آباد، ملکہ ہانس، پاکپتن، [illegible]، چاولی مشائخ، [illegible]، خلجی پور اور [illegible] کے اہم مذہبی، تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی شخصیات و مقامات کا ذکر تفصیل اور تحقیق کے ساتھ تخلیقی انداز میں کچھ اس طور تحریر کیا ہے کہ وقت کا شناسا مزاج بھی کتاب کو آپ سے یا آپ کو کتاب سے اس وقت تک جدا ہونے نہیں دیتا جب تک اول تا آخر صفحے تک ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف مزاج آشنا ہو کر آپ کے محسوسات کو مکمل نہ کر لے۔ داؤد طاہر کی دیگر کتب کی مانند "اک جہاں اور" بھی فیروز سنز نے شائع کی ہے جس کے باعث کتاب کی طباعت اور پیشکش کے حوالے سے کسی طرح کے ابہام کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ "اک جہاں اور" کی قیمت ۴۹۵ روپے مقرر کی گئی ہے جو کتاب کے معیار کے حوالے سے مناسب اور موزوں کہی جائے تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔

☆

"مقدس بول"

آخر اک دن!

وزیر آغا (لاہور)

اُجلے اُجلے کورے کاغذ
اپنے مکھڑوں پر ہندسوں کے پھل پھول سجا کر
اپنے آپ کو
عطرِ گلال کے چھینٹوں سے
چشمہ دے کر
ایک مقدس بول کی مٹی لے کے
خود کو شاداں کر کے
ناز دکھانے آ جاتے ہیں!

ناز دکھانے آ جاتے ہیں
پر اُن کو پھر دیکھتے دیکھتے
جانے کیا ہو جاتا ہے
پہلے کیسوں پھر کھاتوں
پھر غلّوں میں چھپنے لگتے ہیں
پھر غلّوں سے باہر آ کر
دست بدست سفر کرتے ہیں
میلے کالے ہاتھوں کی پوروں پر
رقص دکھاتے ہیں
کالے میلے ہاتھوں پر جو
چکنی کالک جم جاتی ہے
اس کالک سے
اپنے اجلے تن پر
دُکھ کی لاکھ کتھائیں لکھواتے ہیں
کلیاں بن کر
زخموں اور پھوڑوں سے
گاڑھا امرت رس پیتے جاتے ہیں
آخر اک دن
میل کچیل کی تیرہ کوٹھری کے اندر
کالا دھن بن جاتے ہیں!!

قطعات ------ ستیہ پال آنند

نہاں ہیں میری روش میں کئی زمان و مکاں
اکیلا گرمِ سفر ہوں میں خود ہی مست الست
کہا نہیں تھا اک درویش نے یہ مصرعۂ تر؟
"جریدہ رو کہ گذرگاہِ عافیت تنگ است!"

(۲)

وہ نظم ہو کہ غزل، گیت ہو کہ افسانہ
ہر ایک راہ پہ بڑھتے رہے ہیں میرے قدم
حکایتِ سفرِ زیست کیا بیاں میں کروں
"لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم!"

(۳)

قلم نہیں ہے اگر، لوحِ خشت ہے موجود
کوئی تو ہو گا مرے بعد میرا واقفِ حال
مدام خامۂ انگشتِ خونچکاں سے ہی
"کشیدہ ایم بہ تحریر کارگاہِ خیال!"

(۴)

یہ مانا، نظم نگاری تری کمال کی ہے
خوشا کہ ستیہ پال آنند میری بات تو سن
کلامِ رومی و تبریز پڑھ بصوتِ بلند
"دماغِ مجلسِ روحانیاں معطر کن!"

(۵)

اک ناتمام سلسلہ ہجرت کا کو بہ کو
دیکھی ہے میں نے ہر نئے گھر کی شکست و ریخت
اب آسمان سر پہ ہے، دھرتی ہے زیرِ پا
"منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست!"

(۶)

دیکھے ہیں میں نے یورپی گلشن کے گلبدن
چکھے ہیں ہونٹوں کے سب شروب عمر بھر
پیری میں پوچھتا ہوں یہ خود سے کہ کیا نہیں
"خارِ وطن ز سنبل و ریحان خوشتر؟"

(۷)

نخل خود رو ہو کہ دہقاں کی شجر کاری ہو
منحصر اس پہ ہے روئیدگیِ نشو و نما
ذہن کی قدرتِ تخلیق تو اک حیلہ ہے
"شعر خود خواہشِ آں کرد، کہ گردد فنِ ما!"

فلسطینی بچوں کی یاد میں

(کچھ لہو رنگ ماہیے)

امجد اسلام امجد (لاہور)

گڑیا بھی ، غبارے بھی
یہ جن کی نشانی ہیں
بچے تھے تمہارے بھی!

بچوں کی جو لاشیں ہیں
انسان کے چہرے پر
انمٹ یہ خراشیں ہیں

کس طرح سے دیکھے ماں!
یہ جلتے ہوئے غنچے
یہ مسلی ہوئی کلیاں

دل اب تو پھر ہا ہے
یوں ٹوٹ گئی دنیا
بچے نہ رہے سانجھے

تعبیر کے رستوں میں
اک پل میں ہوئے مٹی
جو خواب تھے بستوں میں

ماں زور نہ زر والے
تاریخ میں زندہ ہیں
بس حق کے سفر والے

اب جانے کہاں ہوگی!
جو قتل ہوا بچہ
اُس کی بھی تو ماں ہوگی!

کیا خوب کھلی تھی
اک چشم زدن میں ہی
مٹی میں ملی تھی

مقتل میں جو شمعیں ہیں
دراصل یہ بچوں کے
ماں باپ کی آنکھیں ہیں

نزدیک ہے وہ دن بھی
ظالم بھی فنا ہوں گے
اور ظلم کے خاصان بھی

دونوں ہیں تماشائی
''موسیٰ'' کا ید بیضا
عیسیٰ کی مسیحائی

○

تجویز

(رباعی کی صنف میں)

پروفیسر مامون ایمن (نیویارک)

بینائی ہو مقصود تو دیدہ رکھیے　　　دیدار کا دروازہ دریدہ رکھیے
دنیا میں کوئی رت ہو، کوئی موسم ہو　　　احساس بہرحال رمیدہ رکھیے

☆☆☆

برسات کو برسات کا چہرہ رکھیے　　　لمحات کو لمحات کا چہرہ رکھیے
حالات کو تقدیر نہ کہیے ہرگز　　　حالات کو حالات کا چہرہ رکھیے

☆☆☆

آنکھوں میں سوالات کو بے کل رکھیے　　　کرنوں کو سدا ذات پہ شیتل رکھیے
جاں لیوا ہے دنیا میں سکوں کا لمحہ　　　ہر سانس پہ برپا کوئی ہل چل رکھیے

☆☆☆

سر میں کسی آشوب کا سودا رکھیے　　　سینے میں کسی جذب کا ہوکا رکھیے
اِک پل میں پلٹ سکتا ہے ہر اک پانسہ　　　بے وجہ نہ ہر بات کو بے جا رکھیے

☆☆☆

آئینے میں مطلوب کی صورت رکھیے　　　آنکھوں میں طرح داری قسمت رکھیے
ہیجان سے ہو جاتا ہے ہر دل ہی شل　　　جذبات کی حدت میں نہ شدت رکھیے

☆☆☆

ملنے میں بچھڑنے کا بھی امکان رکھیے　　　مسکان میں اشکوں کو بھی نازاں رکھیے
سایے کے لیے دھوپ ہے لازم یک سر　　　آرام میں ہر سانس کو فرحاں رکھیے

☆☆☆

عقبیٰ کے لیے سامنے دنیا رکھیے　　　ہستی کو امانت کا سراپا رکھیے
وجدان تو اک موڑ ہے آگاہی کا　　　ادراک سے منزل کا تقاضا رکھیے

☆☆☆

دل ساز ہنر، جذب کا جوہر رکھیے　　　تنہائی میں خود ساختہ منظر رکھیے
موسم سے بدل سکتا ہے جگ کا چہرہ　　　شیشے کے لیے ہاتھ میں پتھر رکھیے

☆☆☆

سرباز کا ہر زخم خمیدہ رکھیے　　　کردار میں اوصاف حمیدہ رکھیے
رُکنا ہو جہاں رُکیے، مگر سایے میں　　　منزل کی صدا رہ میں خمیدہ رکھیے

☆☆☆

تحسین سے معمور بیاباں رکھیے　　　ظلمات کے لمحات چراغاں رکھیے
احباب سے اخلاص کا رکھیے رشتہ　　　غیروں میں صدا اپنی نمایاں رکھیے

صحرا نہ سہی، خود کو بہاراں رکھیے — آداب کا انداز نیازاں رکھیے
ہر گام پہ، ہر موڑ پہ، ہر دھڑکن پر — جُز دوست سے تقریب کا امکاں رکھیے

☆☆☆

ہستی کو سدا خاک بسر ہی رکھیے — آگاہی کا انداز دِگر ہی رکھیے
منظر سے کبھی دیکھیے پس منظر بھی — ہر شام کے پردے میں سحر ہی رکھیے

☆☆☆

خاموش نگاہی میں صدا ہی رکھیے — یادوں کے لیے دل میں صبا ہی رکھیے
بازار نوازی کا تقاضا ہو جب — نیلام کا نرخ بیش بہا ہی رکھیے

☆☆☆

ہر سانس میں احساس سلامت رکھیے — ہونٹوں پہ شکایت نہ ملامت رکھیے
طوفان کے زنداں میں بھی رہ کر، خود کو — خوش بُو بھرے جھونکوں کی علامت رکھیے

☆☆☆

آئینہ ' اُمت ذات کا منظر رکھیے — اُمید کا ہر عکس منور رکھیے
ٹوٹا ہو اگر قطرے سے اس دنیا میں — تدبیر کے ہر ہاتھ میں ساگر رکھیے

☆☆☆

منزل کے لیے وقف زمانہ رکھیے — جھولی میں فقط دل کا خزانہ رکھیے
مل کر جو بچھڑتا ہو کسی سے جگ میں — امکان میں خوش باش بہانہ رکھیے

☆☆☆

دلگیر کی زنجیر ہلائے رکھیے — دھڑکن کو بھی ہونٹوں سے ملائے رکھیے
تقدیر کی راہوں میں بہت کانٹے ہیں — کانٹوں کے لیے پھول کھلائے رکھیے

☆☆☆

اپنوں سے سدا خود کو ملا کر رکھیے — غیروں کو مقدر سے ہٹا کر رکھیے
اک ریلے میں لُٹ جاتی ہے ساری رونق — چہرہ ذرا جھونکوں سے بچا کر رکھیے

☆☆☆

آواز کا اعجاز زباں میں رکھیے — ایجاز کا انداز بیاں میں رکھیے
دھرتی سے جُڑا رکھیے قدم کو، لیکن — پرواز کا شہباز سماں میں رکھیے

☆☆☆

الفاظ معانی کو سجائے رکھیے — کاوش کی کڑی دھوپ میں سائے رکھیے
پھیلائے نقطے کو جہاں کی صورت — قطرے کو بھی صحرا میں بہائے رکھیے

☆☆☆

تحریر سے تصویر سجا کر رکھیے — تعمیر کی تحریر بنا کر رکھیے
گر زعم رباعی کا ہے، ایمن صاحب! — تحریر کو زنجیر بنا کر رکھیے

○

پھر غزہ جل رہا ہے

غالب عرفان
(کراچی)

تہذیب کا جنازہ سج کر نکل رہا ہے
تاریخ کا ہیولا چولا بدل رہا ہے
حیوانیت کا جذبہ شعلے اگل رہا ہے
صیہونیت کے ہاتھوں پھر غزہ جل رہا ہے
صیہونیت کے ہاتھوں پھر غزہ جل رہا ہے

بچوں پہ قہر ٹوٹا بے گھر ہوئی ہیں مائیں
بہنوں کے سر سے پھر اب اڑنے لگیں ردائیں
بھائی کے دل میں نفرت کا دیو پل رہا ہے
صیہونیت کے ہاتھوں پھر غزہ جل رہا ہے

معصوم سے یہ چہرے کیوں بولتے نہیں ہیں؟
یہ شیر خوار کیوں لب اب کھولتے نہیں ہیں؟
سفاک دل کا پتھر تک بھی پگھل رہا ہے
صیہونیت کے ہاتھوں پھر غزہ جل رہا ہے

اس خطۂ عرب میں یہ آگ جس نے پھونکی!
اُس سے یہ جا کے کہہ دو سرحد نہیں جنوں کی
دستور حریت کا ہم سے ہی چل رہا ہے
صیہونیت کے ہاتھوں پھر غزہ جل رہا ہے

بارود شعلہ زن ہے شعلے لپک رہے ہیں
پھر غزہ کے مناظر دنیا کو تک رہے ہیں
کہسار پھٹ پڑے ہیں لاوا ابل رہا ہے
صیہونیت کے ہاتھوں پھر غزہ جل رہا ہے

نیرو کی بانسری کا چھیڑا ہے راگ کس نے؟
اُمت کے جسم و جاں میں بھڑکائی آگ کس نے؟
صیہونیت کا ہاتھی کس کو کچل رہا ہے؟
صیہونیت کے ہاتھوں پھر غزہ جل رہا ہے

اک انقلاب تازہ ذہنوں پہ چھا رہا ہے
بہتا لہو سفر کے رستے بنا رہا ہے
دل کا یقین حق کے نعروں میں ڈھل رہا ہے
صیہونیت کے ہاتھوں پھر غزہ جل رہا ہے

یارب! ضمیرِ عالم پر کیسی خامشی ہے؟
اقوام کی زباں پر یہ چپ سی کیوں لگی ہے؟
ہر آنکھ جب کہ پُرنم ہر دل دہل رہا ہے
صیہونیت کے ہاتھوں پھر غزہ جل رہا ہے

○

’’فخرِ سرحد‘‘

یونس صابر
(پشاور)

م   میرے شہر میں ہے محسنؔ احسان کا گھر
ح   حرف ہنر کا پارکھ شاعرؔ دانش ور
س   سخنوری میں چرچا عالمگیر اُس کا
ن   نظم، غزل میں بھی مرشد ہے میرؔ اُس کا

ا   اُس کے فکر میں ہے نور محبت کا
ح   حلم اور نرم روی ہے راز رفاقت کا
س   سبھی کو ملتا ہے وہ خوش گفتاری سے
ا   اُس نے فن میں رنگ بھرا فنکاری سے
ن   نام اور کام بڑا ہے اردو دنیا میں
    فخر وہ سرحد کا ہے اردو دنیا میں!

○

۔ہندکو رنگ۔

میں بولاں کے نہ بولاں

فضا قسمی دا عالم اے سنوں کیہ تاہنوں کیہ
خود غرضاں نوں اپنڑا غم اے سنوں کیہ تاہنوں کیہ
ہنڑ بس اپنڑی ذات اپنڑے غرض دی سوچ سیاست اے
اے بی کسے کے دا کم اے سنوں کیہ تاہنوں کیہ
اُچے لوکاں دی محفل اج آخراں جانڑاں فیشن اے
اجکل شوہر دا موسم اے سنوں کیہ تاہنوں کیہ
کتے کیہا کنوں کیہا دیکھدا جاندا رہ بابا
او عمرانؔ اے یا اکرمؔ اے سنوں کیہ تاہنوں کیہ

فریاد

قیصر تمکین (کراچی)

سرکار کڑا وقت ہے
ہم پہ یہ کڑا وقت ہے سرکارؐ
دنیا کا کوئی خطہ ہو
رسوا ہمی ہر آن ہیں
اپنا بس ایک جرم ہے
ہم لوگ مسلمان ہیں
سرکار کڑا وقت ہے
ہم پہ یہ کڑا وقت ہے سرکارؐ

ہوں بوسنائی یا ہوں فلسطینی مسلمان
کشمیری ہوں چیچن ہوں کہ افغان
دن ان کا خوں آشام ہے
رات ان کی خوں آشام
کب ختم ہوں گے ان کے یہ سرکارؐ
رنج و غم و آلام
سرکار کڑا وقت ہے
ہم پہ یہ کڑا وقت ہے سرکارؐ

مانا کہ بہت ہم ہیں گنہ گار
مانا کہ بہت ہم ہیں خطا کار
طالب ہیں مگر در گزر و عفو خدا کے
اور لطف و کرم کے ترے سرکارؐ
ہم پہ یہ کڑا وقت ہے سرکارؐ
کڑا وقت ہے سرکارؐ
کڑا وقت ہے سرکارؐ

''دوسرا ہمالہ''

(شبنم رومانی مرحوم کے لیے ایک نظم)

ضیاء شبنمی (ملتان)

اس غزل دشمنی کے موسم میں — تو تغزل کا ہے علمبردار
تری ہر نظم عشق کی تہذیب — تیرا ہر شعر حسن کا معیار
ہر چٹکتی کلی لٹکتی زلف — تیری دوشیزۂ سخن کا سنگار
ہر بہکتا قدم لپکتا جسم — تیری اک جنبشِ قلم پہ نثار
کتنی افسانہ ساز شاموں کا — تیری نظموں میں ڈھل رہا ہے خمار
چاندنی دھوپ نرمیاں آہنگ — نیند خوشبو چھنک دھنک جھنکار
مثنوی ۔ تیری اک نئی کوشش — اور جزیرہ ہے اک نئی آواز
تیرے خط جیسے سبزۂ نو خط — تیز تیکھے سبک غزل انداز
تیری باتیں بچی تُلی باتیں — صاف سیدھی لطیف سحر طراز
تیری شوخی میں رنگِ معصومی — تری معصومیت میں شوخی ناز
اے مرے رحمدل غزال شکار — اے مرے پاکباز شاہد باز
تیرے اشعار سن کے اہل شعور — داستانوں کو بھول جاتے ہیں
شاخِ گل جیسے خوش بدن اکثر — تری نظموں کو بھول جاتے ہیں
گلرخوں کی طرف سے تیرے نام — اب چنبیلی کے پھول جاتے ہیں
تری محفل سے حاسدانِ کرام — پھانک کر غم کی دھول جاتے ہیں
یعنی امید و بیم کے مارے — گھر کا رستہ ہی بھول جاتے ہیں
تیرا ماضی ہے اک سراب شباب — حال تیرا ہے ایک گلستاں
شاعروں میں ہے اک بڑا شاعر — دلِ دل میں ہے اک عظیم انساں
ترے ''اقدار'' کی حسیں ترتیب — جس طرح آسماں پہ کابکشاں
تو نے توڑا غرور لات و منات — بت شکن تجھ کو مانتا ہے جہاں
ترے سینے میں شہریار کا دل — ترے ماتھے پہ بندگی کا نشاں
نسلِ نو کے لیے ترا پیغام — عزتِ نفس کا اجالا ہے
تیری شخصیتِ گرامی تو — واقعی دوسرا ہمالہ ہے

○

''غموں کی بھیڑ''

تجسم اخلاق ملیح آبادی (راولپنڈی)

ساتھ چلنا ہے تو چل
یا ڈگر اپنی بدل
کہکشاں قدموں میں ہے
موت تو رستہ بدل
تو صدف ہے یاد رکھ
ذات سے موتی اگل
بن کے خوشبو پھیل جا
رنگ میں تتلی کے ڈھل
نفرتوں کی باڑھ کو
اپنے پیروں سے کچل
زندگی کے رنگ کو
تو ہتھیلی پر تو مل
سب کی اپنی مشکلیں
سب کے اپنے اپنے حل
مال وزر ہے ان دنوں
ہر پریشانی کا حل
زندگی خاموش! چپ
ہوگئے اعصاب شل
یاں غموں کی بھیڑ ہے
ایسی دنیا سے نکل
جان لیوا کس قدر
تیرگی کا ایک پل
کب تجھے سوچا نہیں
کوئی لمحہ کوئی پل
تو نہ ہو جب سامنے
آنکھ ہو جاتی ہے تھل

''چینج وی نیڈ''

(ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں)

شگفتہ نازلی (لاہور)

دائرے میں رہنے کی عادی سے ہو جاتے ہیں......
ابھی سی ڈگر پہ ہیں، منتشر سی فکر کے ساتھ......
اور بگولوں کی مانند اڑتے ہی تو پھرتے ہیں......
چینج کچھ نہیں ہوتا، کچھ نیا نہیں لگتا......
اکتائے سے لمحوں میں، ان کہے سے خدشوں میں ......
یوریت کے رستے پہ گھومتے جو رہتے ہیں......
گردشوں میں گھرتے ہوئے، اک سے ماسک تکتے ہوئے......
یکساں بیان سنتے ہوئے، کالموں کو پڑھتے ہوئے......
تبصروں میں بیٹھے ہوئے، خود فریبی بنتے ہوئے......
زندگی کہیں ہم سے جیسے روٹھ جاتی ہے......
پھر اسے منانے کو ہوگئی، نئی کا سفر......
مسکراتے لہجے میں کیسا خوشگوار لگے......
اور اک انوکھی لگن اپنے ہمرکاب رہے......
دیپ اپنی دھن کے رہیں ساتھ ساتھ رستے میں......
سب پڑاؤ طے کر لیں، بدلے سے تناظر میں......
پھر پلٹ کے جو دیکھیں، دائرہ سراب لگے......
اور مرحلے سارے، بھولے بسرے خواب لگے......
آج دور حاضر میں جو ادیبا کہتے ہیں......
یہ ہی بات اپنے میر کہہ گئے بہت پہلے......
کہ ثبات دنیا میں ہے فقط تغیر کو ......!

○

''تمہارے دیس''

علی آذر (کراچی)

سات سمندر پار میں کر کے
آئی تمہارے دیس
ماں کے آنچل کو چھوڑا
بابا کے آنگن کو چھوڑا
بہنوں کی وہ پیاری باتیں
ویر جواں بھائی کا سایہ
سکھیاں چھوڑیں
ساون اور بہاروں کے جھولے
ساون اور بہاروں کو چھوڑا
کوئل کی کوکو چھوڑ آئی
باغوں کی خوشبو چھوڑ آئی
وطن جو اپنا سب سے بڑھ کر
اُسکی سوندھی مٹی چھوڑی
کس کس کو میں چھوڑ کے آئی
کس کس سے منہ موڑ کے آئی
صرف تمہاری خاطر جانان
اور بدلے میں کیا میں مانگوں
صرف تمہارا پیار ہی ساجن
عمر بھر کا ساتھ ہی ساجن
چھوڑ دیا ہے سب کو میں نے
تم کو چھوڑوں
ناممکن ہے
تم بن جینا
ناممکن ہے
تم بس میرے ساتھ ہی رہنا
بوند بوند جو برسے ہر دم
پیار بھری وہ سات ہی رہنا

ہائیکو

نوید سروش (میرپورخاص)

نعت لکھے جب تو
پھیلے خوشبو ہی خوشبو
گلشن میں ہر سُو

بادل برسے گا
اک نہ اک دن تو بھی یار
مجھ بن ترسے گا

کیسے تیرے روپ
چاندنی، خوشبو، ٹھنڈی چھاؤں
اُجلی اُجلی دھوپ

خاموشی وادی پر
میرا من آنگن سُونا
اُس کی شادی پر

ہجرت کے منظر
یادوں کی نگری میں ہیں
اُجڑے کتنے گھر

○

رس رابطے

جمع و ترتیب و تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

پیارے گلزار جاوید، سلامتی، محبتیں۔

تازہ چہارسو ملا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ نے بہت محنت سے پرچہ ترتیب دیا ہے لیکن ماضی کے خاص نمبروں سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا مثلاً جناب رالف رسل، ڈاکٹر خلیق انجم، اسد محمد خان صاحب اور شری بلراج کومل آپ کے نام کو تاریخ میں جاوداں کرنے کے لیے کافی ہیں۔ معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہوں گا کہ زیرِ نظر شمارے کی شخصیت میرے خیال میں اس معیار پر پورا نہیں اترتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس شمارے کے صاحب قرطاس اعزاز کی شخصیت اور شاعری متوسط درجے کی گردانی جائے تو بے جا نہ ہوگا مگر اسے کیا کہیے کہ اس شمارے میں آپ کی محنت کچھ زیادہ ہی دکھائی دے رہی ہے مگر میں پھر معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ مدیر کی محنت کسی تخلیق کار کو فنی معراج عطا نہیں کر سکتی۔

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

برادرم گلزار جاوید، تسلیم!

چہارسو کا تازہ شمارہ ہر لحاظ سے خوبصورت و خوب سیرت ہے۔ آپ جس طرح ملک، مذہب و عقیدے سے بلند ہو کر اردو دنیا کی معروف شخصیات کو چہارسو کے ذریعے محفوظ و معروف کر رہے ہیں اس کی داد نہ دینا سراسر زیادتی ہوگی جبکہ اس کام میں اشتہارات نہ ہونے کے باعث مالی فوائد کا دور دور تک نشان نظر نہیں آتا، نجانے آپ یہ گھاٹے کا سودا کیسے کیے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور)

محترمی گلزار جاوید صاحب!

سلام مسنون۔ بلاشبہ یہ آپ کی کرم گستری ہے کہ چہارسو مجھے باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔ بلراج کومل صاحب والے شمارے کے ضمن میں، میں آپ کو ایک عدد خط پہلے بھی لکھ چکا ہوں، نہ معلوم وہ آپ تک پہنچا یا راستے میں کہیں گم ہو گیا۔ (چند گزارشات دوبارہ عرض کرتا ہوں۔ صفحہ ۵ پر جہانگیر اشرف صاحب کے عنوان پر "محمد اقبال بھٹی صاحب، برمنگھم، برطانیہ" کی نظم آپ کی توجہ چاہتی ہے نیز عبدالعزیز خالد صاحب کی نعت کا تعارفی "پہلا شعر" جو قوسین میں ہے آپ کی توجہ چاہتا ہے اس کا دوسرا مصرع یقیناً کتابت کی "زد" میں آ گیا ہے)۔

تازہ شمارے کا سوال نامہ "حسبِ سابق آپ کی ژرف نگاہی کا عکاس ہے"۔ جواب نامہ میں شہزاد احمد صاحب کی ادبی وابستگی، جہتیں اور کاوشات بھرپور رنگ نظر آتے ہیں۔ موصوف کی غزلوں پر "تنویر رونی صاحب" کا عروضی جائزہ خوب ہے۔ اب یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ دو برس پہلے آفتاب قمر زیدی (حال مقیم نیو جرزی، امریکا) کا شعری مجموعہ چھپا تھا۔ اس میں شخصی مضمون شہزاد صاحب کا تھا (اس میں فنی مضمون اس ہیچ مدان کا تھا)۔ نیز موصوف نے نسبت روڈ، گوال منڈی لاہور کی جن گلیوں کا ذکر کیا ہے میں بھی ان گلیوں میں جوان ہوا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ شہزاد صاحب کی میرے والد گرامی علامہ ہارون ارشد (مرحوم) سے شناسائی رہی ہو۔ کلیم چچا (کلیم عثمانی مرحوم) میرے والد گرامی کے نسبتاً جونیئر ساتھیوں میں تھے۔ ان سے میری آخری ملاقات جولائی ۱۹۸۲ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی ایسوسی ایشن کے سالانہ مشاعرے میں ہوئی تھی۔ وہ اس مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے۔ مجھے وہ کلمات اچھی طرح یاد ہیں جو انہوں نے میرے تعارف میں کہے تھے "پروفیسر مامون ایمن میرا بھتیجا ہے۔ وہ شمالی امریکا میں اردو ادب کی سرگرمیوں کا بانی ہے۔ امید اختر نے اس کی غزل گائی ہے۔ میری خواہش ہے کہ مامون وہی غزل سنائے۔" میں نے ان کی خواہش کی پذیرائی میں وہی غزل سنائی تھی۔

حسن کو اپنے ستم کا کوئی اندازہ بھی ہے
کیا فصیلِ عشق کے پہلو میں دروازہ بھی ہے

کلیم چچا کا خوب صورت ترنم میری یادوں کی امانت ہے۔ میرے والد گرامی اختر کو شاعر تھے، بہترین ترنم کے مالک تھے اور بلا کے مقرر تھے۔ (ششم جماعت کی کلاس میں حبیب جالب مرحوم ان کے شاگرد تھے)۔ ہائے ہائے کیسی کیسی شخصیتیں خاک اوڑھ کر سو جاتی ہیں۔ یہاں احباب اردو سے میری وارفتگی کے بارے میں سوال کرتے ہیں (آپ بھی مجھے "بابائے اردو کینیڈا" کے نام سے موسوم کر چکے ہیں۔ چہارسو اکتوبر ۱۹۹۸ء)۔ اب میں اپنے احباب کو کیا بتاؤں کہ میری ذہنی اور ادبی تربیت میں کن کن حضرات کی توجہ اور دعائیں شامل ہیں۔ بائیس برس کی عمر میں لاہور سے نیویارک آنے والا نوجوان اب اڑسٹھ برس کا ایک بوڑھا ہے، ہجرت زدہ ہے۔ وطن واپسی کا خواہاں نہیں کہ اب اس کی اولاد یہاں ہے۔ امریکا اس کا گھر ہے کہ اس کا ہر خواب لاہور کا مرہون ہے۔ پاکستان میں مقیم فن کار شاید ان سطروں سے میرے مسلسل کرب کا اندازہ لگا سکیں۔ میری بپتا ہی میری زندگی کی کہانی ہے۔

تقدیر کا منہ چوم رہے ہیں ہم تو
جگنوؤں کی طرح جھوم رہے ہیں ہم تو
یوں کہیے کہ اس دنیا میں اپنی دنیا
کاندھوں پہ لیے گھوم رہے ہیں ہم تو

مامون ایمن (نیویارک)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم!

چہار سو کا تازہ شمارہ اپنی خوبصورت شکل میں نظر نواز ہوا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ سب سے پہلے تو سرورق کی تزئین نو کے لیے مبارکباد قبول فرمایئے کہ اس نئی آن بان کے ساتھ صاحب اعزاز کا عکس عکاسِ ادب بن کر ابھر رہا ہے۔ امید ہے آئندہ بھی آپ "چہار سو" کا سرورق اسی طرح سجا کر اسے بہتر حسن کاری سے مزین کرتے رہیں گے۔ بہرحال یہ تو ضمنی تذکرہ تھا۔ میں نے شہزاد احمد کے متعلق اس سے قبل بھی "اوراق" اور دوسرے ادبی جریدوں میں پڑھا تھا لیکن چہار سو میں "براہ راست" کے صفحات پر اور دوسرے نامور ادیب نے ان کے بارے میں جو تحریر کیا ہے ان سب سے اُن کی شخصیت کا وہ روپ ابھرا ہے جو یقیناً مختلف الجہات ہے۔ ان مضامین میں احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، ڈاکٹر وزیر آغا، محسن احسان وغیرہ نے تو اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے اُن کی ادبی و شخصی کارگزاریوں پر بہت خوب روشنی ڈالی ہے لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے "ذہن انسانی کا جاپانی پس منظر" جیسی شہزاد احمد کی معرکۃ الآرا کتاب پر مختصر لیکن مدلل مطالعہ پیش کیا ہے اس سے موصوف کی تحقیقی بصیرت نمایاں ہے۔ پھر اسی شمارے میں ان کی ایک ترجمہ کی ہوئی تحریر "ایک نا موجود سیارہ" اُن کی بطور مترجم خصوصی صلاحیت پر دال ہے۔ قابل مبارکباد ہیں آپ کہ ایسی کاوش کو "چہار سو" کے قارئین سے متعارف کروایا۔ اس موضوع پر اپنی بات ختم کرنے سے قبل میں یہاں موصوف کے دو اشعار پیش کر رہا ہوں جو مجھے بہت پسند آئے

میں اُسے پیاس کہوں آس کہوں موت کہوں
ایک لذت جو مرا پورا بدن چاہتا ہے

مجھے لگتا ہے سفر اب نہیں ہو پائے گا
یہ تھکن اب ترے پیروں میں سما جاتی ہے

ہاں "براہ راست" کے صفحات ۹، ۱۰ اور ۱۱ پر الفاظ کے غلط چھپ جانے شاید ٹیپ سے کاغذ پر منتقل ہونے کے مراحل میں پیش آئے ہیں: "قدرے کمزور" کی جگہ "قدر و کمزور"، "سراہنے" کی جگہ "سرہانے" اور "دونوں" کی جگہ "دو ہیں"۔ گلشن میں فیروز عالم کا "کالا سورج"، "تاریک صبح" اور گلزار جاوید کا "تاج اور سنوج" یقیناً اس شمارے کے منفرد افسانے ہیں۔ عذرا اصغر کا افسانہ "مراجعت" اس سے پہلے بھی میں کہیں یا شاید "چہار سو" میں پڑھ چکا ہوں اور اس پر چند فقرے لکھے بھی ہیں۔ اب آخر میں "نگینہ گم گشتہ" میں طاہرہ اقبال کا رپورتاژ جو عصر سے عہد گم گشتہ کے چہروں کو ایک بار پھر روشن کر گئی۔ مصنفہ کے قلم میں بلا کی روانی اور منظر کشی کی صلاحیت ہے لیکن اس میں موجود ایک سہو کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ صفحہ ۹۴ کے آغاز میں پہلی عبارت کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے "ڈپلومیٹ نے اپنی بات جاری رکھی یہ علاقہ گلشن کہلاتا ہے جو ۱۷ء کے بعد بنا ہے" "مجھے ہنسی آتی ہے اس ڈپلومیٹ کی ناقص معلومات پر یہ علاقہ ۱۷ء سے بہت پہلے موجود تھا اور یہ بتاتا چلوں کہ اسی علاقے میں قلم لشاد ندیم کی شادی کا ہنگامہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔

غالب عرفان (کراچی)

جناب گلزار جاوید صاحب تسلیمات۔

"چہار سو" کا جنوری۔مارچ ۲۰۰۹ء کا شمارہ ملا، جس کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ اس کو جناب شہزاد احمد کے نام کیا گیا ہے۔ میں ان کو ایک عمر سے پڑھتا آیا ہوں، مگر ان کے بارے میں جس قدر معلومات اس شمارے میں جمع ہیں وہ اس کا عشر عشیر بھی میرے علم میں نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی علم و ادب کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ وہ نہ صرف بہت بڑے شاعر ہیں بلکہ بہت اہم مترجم بھی ہیں۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ ان کی کتابیں میری نظر سے نہیں گذری ہیں۔ البتہ میں ان کی شاعری سے خوب واقف ہوں اور آج بھی ان کی نظمیں اسی اشتیاق سے پڑھتا ہوں، جیسے چالیس پچاس سال قبل پڑھا کرتا تھا۔ انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اتنے لمبے ادبی سفر نے ان کو یا ان کے قلم کو نہیں تھکایا۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے، جس کو اب کون توڑ سکتا ہے۔

شاعری کا ذکر ہو رہا ہے تو یہ کہنے کی اجازت دیں کہ جناب ستیہ پال آنند کی نظمیں مجھے اچھی لگیں۔ میں نے انہیں بہت کم پڑھا ہے۔ بس ان کی ایک کتاب کسی مہربان نے امریکہ سے بھیج دی تھی، جس کی بنا پر میں نے ان کے بارے میں اچھی رائے قائم کی تھی۔

افسانوں کے بارے میں عرض ہے کہ جوگندر پال اور آپ کا اپنا اپنا اسلوب ہے جو خوب ہے۔ نشاط یاد کا افسانہ "ایک سائیکوٹائیکل وحشت نامہ" سعر کے کی چیز ہے۔ انہوں نے موجودہ اسلام گزیدہ ماحول کا خوب جائزہ لیا ہے۔ انہیں مبارکباد ہو۔ آپ کی یہ پالیسی بھی اچھی لگی کہ مبتدی افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ البتہ یہ بات عجیب لگی کہ فرخندہ شمیم کے ایک افسانے میں تصویر send کرنے کا ذکر ہے۔ کیا ضروری ہے کہ عوام الناس کی بے ہودگیاں ادب میں در آئیں۔

چہار سو کے اب تک صرف چار شمارے میری نظر سے گذرے ہیں۔ البتہ مجھے یہ کہنے میں خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کا رسالہ ہندو پاک میں اردو ادب کا اہم ترین مجلہ بنتا جا رہا ہے۔ اللھم زد فزد۔

منیر الدین احمد (جرمنی)

عزیزی گلزار دعائیں۔

جناب شہزاد احمد سے منسوب تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شہزاد احمد صاحب بلا کے ذہین، ذی فہم اور دور اندیش اور دور بین نظر کے حامل ایسے تخلیق کار ہیں جن کی نہ صرف شاعری بلکہ مضامین، تراجم بھی بہت لطف اور معلومات کے حامل ہیں۔ تمام مضامین کے مصنفین نے شہزاد احمد صاحب کی شخصیت و فن کو

خوبصورتی سے کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے موجودہ حالات کے اعتبار سے آپ نے شمارے کو جس سادہ لوح اور زیرِ دست اکثریت سے منسوب کیا ہے وہ زندگی کا حق ادا کرتا ہے آپ یقیناً پاروحیت کے پیمبر ہیں اور اس وقت میں آپ جیسے لوگوں کی بے پناہ ضرورت ہے کاش! وہ وقت لوٹ آئے جب ہم سب امن آشتی سے زندگی گزار سکیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ جائیں۔ اس حوالے سے جناب نشا یاد کا حقیقت سے لبریز "ایک سائیکو سٹائل وصیت نامہ" ہر نیک دل انسان کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے اس کے علاوہ عذرا اصغر کا "مراجعت" ڈاکٹر فیروز عالم کا "کالا سورج" فرخندہ شمیم کا "آدھے گھنٹے کے لیے" سلطان ڈار کا "خوف میں گھرا ہوا آدمی" روبی فرخ کا "مرے تھے جن کے لیے" اپنی اپنی جگہ متاثر کن ہیں۔ آپ کا فاتح اور مفتوح بھی موجودہ صورتحال کی نمائندگی کے ساتھ چست فقروں کے باعث قاری کو دبوچ رکھتا ہے شعری حصہ میں نقاش کاظمی، ساغر عاشق ہرگانوی، مظفر حنفی، محمود الحسن عرش صہبائی اور احمد اسلام امجد کی تخلیقات بہت عمدہ لگیں۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب

"چہار سو" کا تازہ شمارہ باعث تسکین قلب و نظر ہوا۔

اس سے پہلے کہ میں جناب شہزاد احمد کے قرطاس اعزاز کے متعلق کچھ عرض کروں میں اس تحریر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ یہ نشا یاد صاحب کا افسانہ (اور آج کے دور کے لحاظ سے ایک حقیقت) "ایک سائیکو سٹائل وصیت" ہے۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس افسانے نے مجھ پر کیا اثر کیا۔ سانس بے قاعدہ ہو گئے اور مجھ پر ایک کپکپی طاری ہو گئی۔ ایک لرزش تھی جو شاید باہر سے نظر نہ آتی ہو مگر اندرونی طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ عجیب جذبات تھے۔ شدید غم اور اسکے ساتھ ہی شدید غصہ بھی تھا اور ساتھ ہی شرمندگی اور احساس ندامت کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور آخر یہ راستہ ہمیں کہاں پہنچائے گا۔

نوجوانوں کے معصوم ذہنوں کو کس طرح ایک ایسے رنگ میں رنگا جا رہا ہے جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ پوری امت کے لئے کسی طرح بھی فائدہ مند نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس موضوع پر، جو آج کی موجودہ روش کے دور میں تقریباً ایک شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے کچھ لوگ نہایت جرأت مندی سے قلم اٹھا رہے ہیں۔ اسی موضوع پر ارشاد احمد صدیقی کا افسانہ "پہلی جنت" جو سہ ماہی مونتاج کے جون کے شمارے میں شائع ہوا ہے بھی قابل توجہ ہے۔ اس قسم کی تحریروں سے میرے اس شدت کے ساتھ متاثر ہونے کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں ایک ایسے پیشے سے تعلق رکھتا ہوں جس کا فرض ہے کہ وہ ہر حال میں زندگی بچانے کی کوشش کرے اور اسکی نظر میں ہر زندگی چاہے وہ عادی ہو، اسکی نظر میں کسی قدر بے قیمت ہو حقیقت میں بے حد قیمتی ہوتی ہے زندگی جیسی پیاری اور انمول شے کا اس طرح زیاں!!!!

شہزاد احمد پر یہ قرطاس اعزاز خوب ہے اور اس نے چہار سو کی گزشتہ روایت اور معیار کو برقرار رکھا ہے چہار سو میں چھپنے والے گوشے مصنف کے متعلق معلومات اور اس کے فن پر تنقیدی حوالے سے ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ شہزاد صاحب کا بڑا ایک مرتبہ ہے اور آپ نے انکو اجاگر کرنے میں کمال خوبی سے اپنا فرض نبھایا ہے آپکا انٹرویو حسب سابق تیکھے سوالوں پر مشتمل تھا اور شہزاد صاحب کے جوابات بھی خوب تھے۔ گوشے کے بارے میں مجھے محسن احسان کا مضمون زیادہ پسند آیا اس لئے کہ اس میں ادب سے زیادہ ذاتی اور نجی تعلقات کی چاشنی تھی۔

آپکا افسانہ فاتح اور مفتوح ایک استعاراتی تحریر تھی اس میں شاید "ناین الیون" کی طرف اشارہ تھا۔ آپ کے انداز بیان میں غضب کی کاٹ تھی۔ روبی فرخ کا افسانہ مغربی دنیا میں برصغیر کے نوجوانوں کی اخلاقی گراوٹ اور مطلب براری کا ایک اچھا نمونہ تھا۔ اس کی زبان سادہ اور پُراثر ہے۔

حصہ نظم و غزل بھی اچھا لگا خاص طور سے احمد اسلام امجد کا یہ شعر

وہی شکبار لمحہ جو گزر چکا ہے کب کا
تو کبھی تو لوٹ آئے ترے بس میں کیا نہیں ہے

اور نجمہ عثمان کا

رشتہ جو عام کا تھا کبھی کا بکھر چکا
یہ دکھ کی نسبتیں تھیں کہ ہم ساتھ ساتھ تھے

فیروز عالم (کیلیفورنیا)

محترمی و مکرمی گلزار جاوید صاحب، سلام و رحمت!

یقیناً آپ صاحب کمال ہیں اور آپ کے کمال کی بہترین مثال چہار سو کا شہزاد احمد نمبر ہے۔ انہی دنوں مجھے منیر نیازی، احمد فراز اور شہزاد احمد پر یونیورسٹی کلاسز کو پڑھانا تھا اور تازہ شمارے نے میری یہ مشکل حل کر دی وہ اس طرح کہ میری ضروریات کے عین مطابق مجھے تمام معلوماتی اور حوالہ جاتی مواد میسر آ گیا جس میں احوال کے ساتھ ساتھ شہزاد صاحب کی تخلیقات کی نمائندگی بھی بھرپور ہے۔ میں اپنے طلبا اور طالبات کو چہار سو کے تمام شماروں کے عکس اور نقول فراہم کرتا ہوں اور یوں آپ کا ادبی مشن نئی نسل تک منتقل ہو رہا ہے جس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ کی محنت کے ثمرات سے ہم جیسے ادب کے طالب علم بھرپور انداز میں مستفید ہو رہے ہیں۔ رب کائنات چہار سو کو ہر حوالے سے استحکام اور دوام عطا فرمائے۔

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم (لاہور)

گلزار جاوید صاحب! بہت سلام

شہزاد احمد صاحب کا گوشہ بہت جاندار ہے اور ان کا کلام اس شمارے کا سب سے توانا حصہ ہے۔ افسانے اس دفعہ یکسانیت کا شکار لگے اور بعض خاصے کمزور بھی لگے۔ اب اگر میں کہوں کہ آپ کا افسانہ اچھا لگا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں "مدیر صاحب" کی تعریف کر رہا ہوں۔ شعری حصہ بس ٹھیک رہا۔ ستیہ پال آنند صاحب کی نظمیں البتہ ہمیشہ کی طرح بھرپور تھیں۔ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کے واقعے کے حوالے سے جو بھی نظمیں کہی ہیں وہ سب بہت توانا ہوتی ہیں میرا خیال ہے کہ صلیب اور اس سے جڑی یہ روایت آنند صاحب کے تخلیقی عمل میں لاشعور کی حد تک ہمیشہ متحرک رہتی ہے اور بعض اوقات مکمل کر سامنے بھی آجاتی ہے اور وہ خود کو اکثر اس صلیب پر ہی پاتے ہیں۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

محمد اوجاوید صاحب مکرم السلام علیکم۔

شہزاد احمد کے نام قرطاس اعزاز ہر لحاظ سے بھرپور اور قابل مطالعہ ہے۔ شہزاد احمد اپنے دور کے نابغۂ روزگار شاعر، ادیب اور دانشور ہیں۔ میں نے اسکول کے زمانے میں ان کا شعری مجموعہ "صدف" پڑھا تھا۔ اُن دنوں شہزاد صاحب، شہزاد احمد شہزاد کے نام سے لکھتے تھے۔ جاوید صاحب یہ خاکسار شہزاد صاحب کا پرانا پرستار ہے کیونکہ شہزاد صاحب ایک ہمہ جہت تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے شاعری کے علاوہ مذہب، سائنس، نفسیات اور اقبالیات پر بہت وقیع کام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے اور آپ کی محنت اور لگن کو مزید توانائی بخشے کہ آپ چہار سو کے ذریعے زندہ تحریروں کے شاہکار بناتے رہیں۔

سجاد مرزا (گوجرانوالہ)

مدیر محترم سلام مودت۔

اس مرتبہ "چہار سو" نے محترم شہزاد احمد کے لیے قرطاس اعزاز کے ساتھ ایک اور عالمانہ و عاشقانہ سنگ میل طے کیا ہے۔ "جو زندگی" سے تعارف پانے کے بعد "براہ راست" کے رکھ رکھاؤ سے شہزاد احمد صاحب کی شعری شخصیت کے ساتھ فلسفہ، نفسیات اور دیگر سائنسی علوم کی بھی اُن کے حوالے سے بہت کامیاب دریافت و بازیافت ہوئی۔ مضامین میں "شہزاد احمد کی شاعری"، "محبت کی نفسیات کا ماہر" اور "ریت اور دھوپ کے درمیان" نے عمدگی سے موضوعات کا احاطہ کیا۔ "چہار سو" کے انتساب ہمیشہ کرۂ ارض کے معاملات و مسائل پر گہری نظر لیے ہوتے ہیں۔ نیز نئے ناموں و تخلیق کاروں کا اضافہ بھی جریدے کی مقبولیت اور پسندیدگی کے بلند گراف کی سند ہے۔ "منتخب افسانے ۲۰۰۷ء" میں شمولیت پر مبارکباد! "تیسری دنیا" میں کالی بلی پر سلامتی بھیجنے کے خوبصورت تجربے کے ساتھ کہانی کی کیفیت موثر تھی۔ "مراجعت" کا آخر آخر میں دردمندانہ و دلگداز اسلوب گہرے تاثر کا حامل رہا۔ "آدھے گھنٹے کے لیے ــــــ جنگ کے حق پہلوؤں پر کامیاب پلاننگ کو آدھے گھنٹے کے اندر چابکدستی سے حاوی ہوتے دکھلایا گیا ہے۔ "مرے تھے جن کے لیے" الگ الگ تہذیبی و معاشرتی اقدار کے مابین تفاوت کو ہی واضح کرتی کہانی تھی۔ فاتح اور مفتوح مختلف نکتہ ہائے نظر اور موقف رکھنے والے صاحب اقتدار و بے اختیار کی باہمی گفت و شنید سے نہ صرف حالات حاضرہ و متعلقہ امور کی مشاقانہ عکاسی ہوئی بلکہ اس کے ساتھ فاتح اور مفتوح کے مروجہ تقاضا و معیارات بھی اجاگر ہوئے۔ "مچھیرے خواب" سے قطعات اور "چشم روشن" سے سدا سہاگن" ۲۰۰۸ء کی آخری نظم "شر پسندوں سے خطاب" روشنی کی موت" زندگی" میرا کی اور سین ریو نے منفرد پیرایۂ اظہار سے متاثر کیا اور جا بجا اقتباسات بھی فکر انگیز و معنی خیز محسوس ہوئے۔ "رفتگاں" میں لطیف کاشمیری صاحب کی افسانہ نگاری کے علاوہ ان کی تخلیق و بعد و شخصیت سے ذہنی ہم آہنگی و تخلیقی ارتباط کا تجزیہ بخوبی ہوا۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

بھائی محمد اوجاوید، السلام علیکم۔

آپ نے "چہار سو" کا قرطاس اعزاز شہزاد احمد کے نام کر کے ایک اور ادبی کام سرانجام دیا ہے۔ شہزاد احمد صرف شاعر ہی نہیں ہیں وہ ایک دانشور، کامیاب مترجم، مرتب، نفسیات دان، مفکر، سیاسی، تہذیبی اور سائنسی علوم کے پارکھ ہیں۔ شہزاد احمد کی فہرست کتب اس بات کا اعلان ہے کہ انھوں نے زندگی بھر حرف و قلم سے گہرا رشتہ استوار رکھا ہے اور مختلف علوم کا مطالعہ ان کی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ شہزاد احمد صاحب لفظ کی حرمت کو سمجھنے والے ایک خوددار انسان ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دور میں ان جیسی سادہ اور پرکار غزل شاید ہی کسی نے کہی ہو۔ شہزاد صاحب پر لکھے گئے تمام مضامین مختصر ہونے کے باوجود بہت اہمیت اور افادیت کے حامل ہیں۔

طاہرہ اقبال نے "سنگیں گم گشتہ" میں سابقہ مشرقی پاکستان حالیہ بنگلہ دیش کی سیر کروا کر ماضی کو یاد دلاتے ہوئے جلے پھپھولے ناسور میں نشتر بھی چبھوئے ہیں۔ جوگندر پال کا افسانہ "تیسری دنیا" ان کے خاص انداز کی علامتی کہانی ہے۔ اس افسانے میں بار بار "السلام علیکم" اور "داستان" کا لفظ ہمارے سیاسی، سماجی اور مذہبی کی عکاسی کر رہا ہے۔ منشا یاد صاحب کا "ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ" نوشتہ دیوار ہے۔ یہ جملہ "آپ میں ہمت ہے تو فرمائش کر کے دیکھ لیجیے" پڑھنے کے بعد مجھے کہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ عذرا اصغر کا افسانہ "مراجعت" اچھی پیش کش ہے مگر افسانے میں پیش منظر سے زیادہ پس منظر کو وقت دیا گیا ہے۔ مراق مرزا کا "خوابوں کا آسمان" متاثر نہ کر سکا اس طرح کی کہانی پاکستان ٹیلی ویژن سے پیش ہو چکی ہے۔ فرخندہ شمیم کا افسانہ "آدھے گھنٹے کے لیے" متاثر کن ہے۔ یورپ میں بھی اچھے مسلمان مرد و خواتین موجود ہیں۔ سلطان ڈار کی کہانی "خوف میں گھرا ہوا آدمی" کو اختتام نے ایک عام سے افسانہ بنا دیا۔ فیروز عالم کا "کالا سورج" امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کی کہانی کا

عکاس ہے۔ روحی فرخ کا افسانہ ”مرے تھے جن کے لیے“ روبانوی مگر حساس کہانی ہے۔ شلپا کا یہ کہنا ”اسے مجھ سے زیادہ مرگی (مرغی) پیاری ہے“ مسلمانوں اور ہندوؤں کی سماجی نفسیات کو ظاہر کر رہا ہے۔ ”فاتح اور مفتوح“ کے لیے بس اتنا ہی کہوں گا ”زندہ باد“۔ غزلیات میں مشکور حسین یاد، منظر بقلیات اور شکیل بجری کی غزل نے بہاریہ کی طرح لطف دیا۔ انجم اسلام انجم، غالب عرفان، مناظر عاشق ہرگانوی، حمیرا نوریہ ملک، زاہد جاوید، صدیقی جاوید، صابر عظیم آبادی اور پروین شش کی غزلوں میں انفرادیت ہے۔ پی ایس جین جوہر کی غزل ”گاؤں“ کی ردیف میں ایک زندگی نظر آ رہی ہے۔ نور زمان ناوک کی غزل میں ردیف ”جگنیاں“ نے بھی نئے معنی پیدا کیے ہیں۔ نظموں میں محمود شام صاحب کی ”اجمیر شریف“ محبت و عقیدت کی مثال ہے۔ شبنم شکیل، فاش کاشمیری، کمل تشت، قیصر تجمّی، کرامت بخاری کی نظموں نے بھی خوب لطف دیا۔

نوید سروش (میر پور خاص)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب سلام و رحمت

شہزاد احمد کے نامۂ قرطاس اعزاز ”حق بہ حق دار رسید“ کا مصداق ہے۔ میرے خیال میں یہ نیک کام بہت پہلے انجام دیا جانا چاہیے تھا۔ بہرحال زیرِ تبصرہ چہار سو کے مطالعے کے بعد تو ذاتی طور پر عملاً بھی یہ ثابت ہو گیا کہ ”دیر آید درست آید“۔

”برادرِ است“ کے کینوس پر آپ کا قلم موقلم بن جاتا ہے اور صاحبِ قرطاس اعزاز کو اس مہارت سے مصور کرتا ہے کہ شخصی خدوخال کے ساتھ ساتھ ان کے فنی نقوش بھی ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ شہزاد احمد تو ویسے بھی ایک خوبصورت انسان ہیں۔ آپ نے انھیں مزید جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ ہر چند ان کے فن اور شخصیت کے سارے پہلوؤں پر رشک کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی زندگی میں حوصلہ مندی زیادہ قابلِ رشک ہے۔ نفسیات، فلسفہ اور سائنس کے ماہر شہزاد احمد جب آسمانِ شعر و ادب کے ستارے توڑتے نظر آتے ہیں تو آنکھوں کو یقین نہیں آتا۔ لیکن جب ہم ان کے تجزیۂ حیات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ سر بسر حیرتوں سے عبارت ہے۔ شہزاد احمد شخصی لحاظ سے بھی انفرادیت بکنار ہیں اور فنی اعتبار سے بھی منفرد و یکتا ہیں۔ بیک وقت غزل اور نظم دونوں اصنافِ سخن میں نیا لہجہ متعارف کرانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ شہزاد احمد نے یہ دشوار گزار مرحلہ جس آسانی سے طے کیا ہے وہ ان کی علم و ادب کے حوالے سے فطری صلاحیتوں پر دلالت کرتا ہے۔ شہزاد احمد کا مضمون ”غالب خستہ کے بغیر“ ان کی غالب شناسی کا ایک دستاویزی ثبوت ہے۔ اس مضمون کی ایک ایک سطر سے شہزاد صاحب کی ذہانت و فطانت کے سوتے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ انہوں نے غالب کے فن اور شخصیت کو روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتار کر ان کا ادراک کیا ہے اور اس تجزیہ معانی کو دریافت کرنے کی کامگار کاوش کی ہے۔ شہزاد احمد پر لکھے گئے تمام شاملِ اشاعت مضامین متنوع گلہائے گلفتہ کا ایک گل خوش رنگ کی اس نوع کا خراج ہے جو خوب تر علمی و ادبی نکات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

جوگندر پال افسانے میں ہیئت (Form) کے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ ان کا افسانہ ”تیسری دنیا“ اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں انہوں نے ایک مؤثر ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے۔ یہ افسانہ بھوک، بیماری، غربت، افلاس، بیروزگاری، خود غرض مذہبی گروہوں اور مایوسیوں کے حوالے سے تیسری دنیا کے باشندوں کی زندگیوں میں یکسانی کا آئینہ دار ہے۔ نشاط یاور نے اپنے افسانے ”ایک سائیکولوجیکل وصیت نامہ“ میں ایک Burning Problem مذہبی دہشت گردی کو موضوع بنایا ہے۔ کہانی میں واقعات کی بہت فطری اور مکمل بنت محسوس ہوتی ہے۔ افسانے پر جب حقیقت کا گمان ہو تو اس کی فنی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نشاط یاور ایک حقیقت نگار ہیں مگر ان کی حقیقت نگاری جذبات کے بجائے شعور سے تحریک لیتی ہے۔ عذرا اصغر کا افسانہ ”مراجعت“ حزنیہ انجام پر ختم ہوتا ہے۔ یہ افسانہ فطرت کی ستم ظریفیوں کا عکاس ہے اور موت و حیات کے اس فلسفے کو پیش کرتا ہے جس کی تعبیر غالب نے درج ذیل شعر میں کی ہے:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

”خوابوں کا آسمان“ مراق مرزا (بھارت) کا افسانہ ہے جس میں انہوں نے ایک اصلاحی کہانی پیش کی ہے۔ انجام میں فنا نوید اس افسانے کی نمایاں خوبی ہے۔ فرخندہ شمیم کا افسانہ ”آدھے گھنٹے کے لیے“ ایک تاثر آفریں کہانی ہے۔ فرخندہ نے نہایت خوبصورتی سے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ مغرب کے آزادانہ ماحول میں پروان چڑھنے والی عورت بھی اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کر سکتی ہے اور مشرق کے مذہبی ماحول میں بھی اخلاقی دیوالیہ پن کے مظاہرے دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔ گلزار جاوید کا افسانہ ”فاتح اور مفتوح“ ان کی گلفتہ نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اسٹاک مارکیٹ، مالیاتی اداروں، کساد بازاری، خسارہ، الیکشن، قنوطیت، اختلافات وغیرہ کے خشک اور بے مزا ذکر کو مزاح کی چاشنی سے پرلطف بنا کر گلزار جاوید نے بحیثیت ایک قلم کار اپنی کلاس کا مظاہرہ کیا ہے۔ ”نوواردؤ“ کے گرد وہ جس نوع کی تنقیدی ایمائیت سموئی گئی ہے وہ خال خال افسانوں میں نظر آتی ہے۔ منظر حنفی اور کرشن کمار طور کی غزلیں خوب ہیں۔ عبدالعزیز خالد کی رباعیات ان کی خیرہ سوچ کی مظہر ہیں اور متاثر کن ہیں۔

قیصر تجمّی (کراچی)